Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

فنا کے بعد رہتا ہے تمنّاؔ، ذکرِ خیر اکثر
سخنداں کا، سخن کا، شعر کا، استادِ کامل کا
(منشی رام سہائے تمنّاؔ لکھنوی)

قومی یکجہتی کا ہراول دستہ

اردو کے ہندو مثنوی نگار

از

عطاءاللہ پالوی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

اس کتاب کی اشاعت میں، بہار اردو اکادمی
کا مالی تعاون شامل ہے

اشاعت :- اول ۱۹۸۲ء

طباعت :- دی آرٹ پریس۔ سلطان گنج۔ پٹنہ ۶

کتابت :- ممتاز احمد

قیمت :- Rs 30 - 00

ملنے کا پتہ :- سعد اللہ پالوی۔ برانچ پوسٹ ماسٹر
علی نگر پالی۔ ضلع گیا

حمید اللہ پالوی۔ ڈسکو بلب انڈسٹریز
املی تل۔ داناپور کینٹ ضلع پٹنہ

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

عنوان | صفحہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اردو شاعر کا نعرہ

بلبلِ شیراز پر، اِترا نہ اتنا گلستاں

ہیں بلا کی طوطیانِ ہند بھی شیوا بیاں

گو زبانِ فارسی، شیریں، مثالِ قند ہے

پر جو اردو میں نمک ریزی ہے وہ اُس میں کہاں؟

(منشی دیبی پرساد بشاش لکھنوی)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اردو شاعری دعا

" خدا کے فضل سے ہندوستان میں، ہندو اور مسلمان اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ، دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا میں ہم دونوں شریک ہیں۔ مقدس گنگا اور جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان "اردو" پیدا کرلی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔ "اردو" ہماری قومی یکجہتی کی سب سے زیادہ استوار بنیاد اور سب سے بڑی نشانی ہے۔ خدا کرے کہ یہ زبان زندہ رہے تاکہ ہم دونوں زندہ رہیں "

(رتنیشور پرساد سالک)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اردو زبان کا نالہ

نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو، مری باری آئی
(مولانا جوہر)

"اللہ" کے بندو!

"آدم" اور "حوا" کے بیٹو!

"محمد" اور "رام" کے نام لینے والو!

"مکہ مکرمہ" اور "دوارکا دھام" کے ماننے والو!

"نقطہ" تفریق و تقسیم کی علامت اور بانٹ بخرہ کا نشان ہے۔ وہ جس عدد میں ایک کو دس، دس کو سو اور سو کو ہزار کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نہ "اللہ" میں نقطہ ہے اور نہ "آدم" و "حوا" میں۔ نہ "محمد" اور "رام" میں نقطہ ہے اور نہ "مکہ مکرمہ" اور "دوارکا دھام" میں۔ مجھ میں بھی "نقطہ" نہیں اور میں بھی انہی سبھوں کی طرح "سب کی" ہوں۔ پھر مجھ میں کیوں "نقطہ لگاتے ہو؟"[1] مجھے تفریق و تقسیم کا ذریعہ کیوں بناتے ہو؟

---

[1] "نقطہ لگانا" ایک محاورہ ہے جس کا مطلب عیب لگانا، خرابی بتانا، برائی بیان کرنا اور کھوٹ ظاہر کرنا ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی
کی رائے

" اردو زبان ، ہندوستان کی ایک اہم زبان ہے - اِس سے مجھے دلی لگاؤ ہے ۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میں بچپن سے ہی اردو سنتی اور بولتی رہی ہوں ۔ اردو صرف کسی ایک علاقہ کی نہیں ، بلکہ سارے ہندوستان کی زبان ہے اور ملک کے بہت سے حصوں میں بولی اور ہر حصہ میں سمجھی جاتی ہے - اردو میں دوسری زبانوں ، خاص طور سے عربی اور فارسی کے کافی الفاظ ہیں ، جو اُن ملکوں سے ہماری دوستی میں بڑی حد تک معاون بنتے ہیں - اردو ہندوستان کے سیکولرازم کی زبان ہے - ہندوستانی ادیبوں نے سیکولرازم کی طرف خاص دھیان دیا ہے - جو لوگ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بتلاتے ہیں ، وہ اُس کے ساتھ بڑی زیادتی کرتے اور حقیقت و تاریخ دونوں کو جھٹلاتے ہیں - اردو ایک شائستہ ، پُراثر ، رنگین اور عوامی زبان ہے "

(تقریر جلسۂ تقسیمِ اسناد - دہلی ۲ مارچ ۱۹۷۴ء)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مقدمہ

ماضی سے مرا رشتہ ٹوٹا ہے، نہ ٹوٹے گا
گذری ہوئی صدیوں نے، پھر مجھ کو پکارا ہے
(نریش کمار شاد)

تمدنِ انسانی کا سب سے ممتاز اور عظیم الشان درخت، جو تاریخ میں "آریہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وسطِ ایشیا کے ایک زرخیز خطے میں پھولا پھلا اور جب اُس کی ایک ابتدائی قلم اُس سے کاٹ کے ارضِ مغرب اور سوادِ یونان و روم میں نصب کی گئی تو اُس کی دو زبردست شاخوں نے بہت ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ یہاں تک کہ ایک شاخ مغرب میں پھیل کے مملکتِ عجم کی بہار بن گئی اور دوسری مشرق کی طرف بڑھ کے ہندوستان پر سایہ فگن ہوئی۔ جسے لوگ ہندوستان میں آریوں کی آمد کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

بالعموم تمام دنیا کا یہ دستور رہا ہے کہ فاتحین، جس طرح مفتوحین کی جان و دولت پر اقتدار حاصل کر لیتے ہیں، اسی طرح اُن کی تہذیب، معاشرت اور زبان پر بھی قبضہ جما لیتے ہیں۔ لیکن ہندوستان جنت نشان عجیب و غریب ملک ہے۔ یہ جس طرح دیگر خصوصیات میں تمام دنیا سے ایک الگ رنگ و روغن اور آب و تاب رکھتا ہے، اُسی طرح زبان کے معاملے میں بھی اس کی ایک خاص ادا رہی ہے۔ آرین جب ہندوستان پہنچے تو وہ اپنی ایک خاص تہذیب و زبان ساتھ لائے اور چاہیے تو یہ تھا کہ وہی آریائی تہذیب و زبان اہلِ ہند پر چھا جاتی، مگر ایسا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نہ ہوا، بلکہ بقول ڈاکٹر ایشوری پرساد :-

"ڈراوڑ مفتوحوں کی تہذیب سے آریوں نے بہت اثر قبول کیا۔ انھوں نے ڈراوڑ قوم کی عورتوں سے شادیاں کیں اور اُن کی بہت سی رسمیں اور عادتیں اختیار کر لیں۔ اس طرح آرین اور ڈراوڑ آپس میں مل گئے"

زبان کے سلسلے میں بھی یہ نہ ہوا کہ آریائی نئی زبان یہاں کلیتاً چھا گئی ہو، بلکہ مفتوحین کی مروّجہ زبانوں سے میل جول کر کے ایک نئی زبان پراکرت کی تخلیق کا ذریعہ بن گئی۔ یہ نئی زبان کچھ عرصہ تو بے قاعدہ رہی، جیسا کہ دنیا کی ساری زبانوں کا دستور رہا ہے۔ مگر جب اس زبان کا عام رواج ہو گیا تو اسے قواعد و ضوابط کے تحت لایا گیا اور اس کا نام "سنسکرت" ہو گیا، یعنی بنائی اور سنواری ہوئی زبان۔

ساتویں صدی عیسوی میں عرب، ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ اپنی تہذیب و زبان لائے۔ ہندوستان میں رہ جانے کے بعد انھوں نے تبادلۂ باہم میں، تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی لین دین کیا۔ عربی زبان سنسکرت سے متاثر ہوئی اور سنسکرت عربی سے۔ دسویں صدی عیسوی سے ہندوستان کی رنگینیوں نے آرین درخت کی ان شاخوں کو بھی اپنی طرف کھینچنا شروع کیا جو ہندوستان سے باہر، مختلف خطوں میں متفرق ناموں سے پھیل پھول رہی تھیں اور جنہیں غزنویوں، غوریوں، غلاموں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں اور مغلوں کی آمد کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد عارضی اور وقتی نہ تھی بلکہ مستقل تھی۔ وہ ہندوستان کو لوٹنے نہیں بلکہ یہاں بسنے آئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اور یہیں رہ پڑے۔ نتیجتاً حکمرانوں اور حکم برداروں میں تہذیب و معاشرت کا بڑے جوش اور انہماک سے لین دین ہوا۔ طریقۂ عبادات کو چھوڑ کر سماجی و معاشرتی معاملات میں مسلمانوں نے ہندوستانی اثرات غیر معمولی طور سے قبول کئے۔ شادی بیاہ کی تمام رسومات برات، سہرہ، مانجھا اور ساچق وغیرہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں میں یکساں برتی جانے لگیں۔ اسی طرح غمی کا دستور، تیجہ، دسواں، بیسواں اور چہلم وغیرہ کی صورت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں اپنایا گیا۔ حالانکہ ان رسومات کا "دین اسلام" سے ذرہ برابر کوئی تعلق نہیں۔ اس طور پر فاتح اور مفتوح کا فرق تدریجاً مٹتا چلا گیا اور دونوں میں بھائی چارہ قائم ہو گیا۔ بقول مسٹر کے۔ پی۔ بترا:۔

"رفتہ رفتہ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں رواداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کو وزیر بنایا۔ ہندو رئیسوں سے تعاون کیا اور ہندو ادبیات خصوصاً دیسی زبانوں کو ترقی دی۔ بنگال کے ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا۔ ان کو زمینیں دیں۔ ان کے لئے مسجدیں تعمیر کیں۔ اور ان کے مذہب کا احترام کیا۔ اسی طرح مسلمان بادشاہوں نے بھی ہندوؤں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ یہاں تک کہ لشکر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ان کی زبان تک مخلوط ہو گئی اور 'اردو زبان' کا آغاز ہوا۔"

ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں:۔

"اکبر نے ہندوؤں سے ناطہ جوڑا۔ جہانگیر تو کشمیر سا تنا گرویدہ ہوا کہ پنڈتوں کی دیکھا دیکھی جہلم کی سالگرہ مناتا تھا۔ اور بیت تیرہوں (اصل میں ویت ترواہ) کے جشن کے لئے دریا کو چراغاں کرتا تھا۔ شاہ جہاں کے شاعر طغرا نے ہولی کے موقع پر نظم لکھی۔ اورنگ زیب نے اجین کے مہاکال مندر کے دیوی کے لئے گھی کا انتظام کیا۔ سراج الدولہ کو بھاگیرتی پر چراغاں تیراکی کی ہندو رسم ایسی پسند آئی کہ اسے ہر سال بھادوں میں مناتا تھا۔ میر جعفر کا بیٹا مبارک الدولہ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا خزانہ انگریزوں کی نذر ہو چکا تھا آمدنی اپنے گھر کے خرچوں کے لئے بھی ناکافی تھی، لیکن بقول غلام حسین خاں گھر پھونک کر تماشا دیکھتا تھا۔ باپ دادوں کے رواجوں پر قائم تھا پھاگن میں ہولی مناتا تھا اور ناچ رنگ کرتا تھا۔ بھادوں میں گنگا پر دیئے جلاتا تھا۔ کہاروں کے مال پوئے کھلاتا تھا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اور دس پندرہ ہزار روپے خرچ کر دیتا تھا۔ کاتک آتا تو دیوا کی روشنی پر پانچ چھ ہزار لگا دیتا تھا۔ دکھن میں تو میل ملاپ کی فضا پرانی ہے — تاج الدین فیروز بہمنی کے بارے میں فرشتہ لکھتا ہے کہ وہ نہ صرف عربی، فارسی اور ترکی جانتا تھا، بلکہ تلگو، کنڑی، مراٹھی، گجراتی اور بنگلہ زبانوں میں اتنا ماہر تھا کہ بلا تکلف ان میں بات چیت اور گفتگو کرتا تھا۔ اس کا حرم ان زبانوں کو بولنے والی بیگمات سے بھرا تھا۔ شہاب الدین احمد شاہ کا عرس ہوتا تھا تو لنگاتیوں کے جنگم یعنی گرو، سیکڑوں چیلوں کے ساتھ بیدر آتے تھے۔ سنکھ پھونکتے تھے۔ باجے بجاتے تھے۔ ناریل توڑتے تھے۔ اور پھول چڑھاتے تھے۔ عادل شاہیوں نے مراٹھی اور اردو کو یکساں نوازا تھا۔"

ظاہر ہے کہ اس قدر تعاون و اشتراک، اتحاد و اتفاق اور میل جول سے ایک دوسرے کی زبان کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی؟ چنانچہ عربی، فارسی، سنسکرت اور دوسری مقامی و لشکری زبانوں کے میل ملاپ سے ایک نئی زبان عالم وجود میں آئی جسے "اردو زبان" کہا جاتا ہے۔ مگر اس نئی زبان کا نام "اردو" بہت بعد میں پڑا۔ ابتداً اسے "ہندی" کہا جاتا تھا۔ امیر خسرو (وفات ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) نے اپنی "اردو" کو "ہندی" کہا ہے :-

چو من طوطیٔ ہندم از راست پرسی
زمن "ہندوی" پرس تا نغز گویم

اسی خاتمہ میں ایہام کی ایک نئی صفت پیدا کرنے پر فخر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"بازایہامے دیگر برست کردہ ام کہ یک طرف ہمہ "ہندی" و جانب دیگر "فارسی" می خیزد۔"

قدیم شاعر جناب غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرۂ شعرا کو "تذکرہ ہندی گویاں" کہا ہے۔ خادم سندیلوی نے اپنے تذکرہ "مخزن الغرائب" (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۲ء) میں مرزا مظہر جانجاناں (وفات ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ :-

"بہ زبان ہندی کہ مراد از اردو است، خیلے فصیح و بلیغ بود"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ابن امین اللہ طوفان نے اپنے تذکرۂ شعرا (۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) کو "اشعار شاعران ہندی زبان" قرار دیا ہے اور اس میں تقریباً ہر جگہ "اردو" کو "ہندی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً قادر لکھنوی کے ذکر میں کہا ہے کہ:-

"فارسی و ہندی ہر دو زبان بہتر می داند"

یا ہوس لکھنوی کے بارے میں کہا ہے کہ:-

"شعر ہندی و فارسی می فرمایند"

ناصر لکھنوی نے اپنے تذکرہ (۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء) کے بارے میں، دیباچہ میں مصحفی کے تذکرہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"اُن کا تذکرہ عبارت فارسی میں ہے اور فقیر نے ہندی میں لکھا"

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "اردو" کو ابتداءً عرصہ تک "ہندی" کہا جاتا رہا اس لئے کہ یہ زبان ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کی صورت میں پیدا ہوئی تھی۔ بہرکیف! یہ ہندی یا اردو، نئی زبان کے فروغ اور اس کی اشاعت و ترویج میں سب سے زیادہ حصہ ہندو حضرات نے لیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۰ء کے "ہماری زبان" میں رئیس مینائی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ:-

"تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کا یہ پہلا اخبار ماسٹر رام چندر داس نے "خیر خواہ ہند" کے نام سے نکالا تھا"

یہ حقیقت تو اٹل ہے کہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا سب سے پہلا اخبار کسی مسلمان نے نہیں، بلکہ ہندو حضرات نے ہی نکالا تھا۔ مگر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار "خیر خواہ ہند" تھا۔ "خیر خواہ ہند" اور "محب وطن" دونوں ماہانہ رسالے تھے جنہیں داس نے دہلی سے ۱۸۴۷ء میں نکالا تھا۔ اس سے پہلے ۱۸۳۷ء میں محمد باقر کا ہفتہ وار اخبار "دہلی اردو اخبار" کے نام سے، ۱۸۴۱ء میں بہادر شاہ ظفر کا ہفتہ وار اخبار "سراج الاخبار" کے نام سے اور ۱۸۴۲ء میں منشی پربھو دیال کا ہفتہ وار اخبار "نورالمشرقین" دہلی ہی سے نکل چکا تھا۔ دراصل اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار "جام جہاں نما" ہے جو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہفتہ وار تھا اور اسے کلکتہ سے منشی سدا سکھ نے مئی ۱۸۲۳ء میں نکالا تھا۔ کہا گیا ہے کہ "جامِ جہاں نما" کے نکالنے کی درخواست ہری ہر دت نے ۸ / مارچ ۱۸۲۲ء کو دیا تھا۔ اسے کلکتہ کی ایک تجارتی کمپنی نکالتی تھی اور یہ اخبار ٹائپ میں چھپتا تھا اور پریس کا دفتر سرکولر روڈ پر تھا۔ یہ چار صفحات کا ہوتا تھا جس میں خبروں کے ساتھ نظمیں اور غزلیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ اس کا سائز $\frac{30 \times 20}{8}$ تھا۔ آٹھ ماہ تک یہ اخبار نکلتا رہا۔ اس کے بعد جنوری ۱۸۲۴ء میں بند ہوگیا۔ یہ "جامِ جہاں نما" دراصل اردو ضمیمہ تھا اُن کے فارسی اخبار "جامِ جہاں نما" کا جو ایک سال پہلے یعنی ۱۸۲۲ء میں نکل چکا تھا۔ لہٰذا اردو زبان کے سب سے پہلے اخبار نویس یا اردو اخبار کے بانی ہونے کا فخر ایک ہندو ادیب، منشی سدا سکھ کو حاصل ہے جنہوں نے ۱۸۲۳ء میں اردو "جامِ جہاں نما" نکالا تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں فارسی زبان کا اخبار نکالنے کا سہرا راجہ رام موہن رائے کے سر ہے جو ۱۸۲۲ء ہی سے اور "جامِ جہاں نما" کی اشاعت کے پہلے ہی سے اپنا فارسی ہفتہ وار اخبار "مراۃ الاخبار" کلکتہ سے نکال رہے تھے۔ بہرکیف! میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اردو زبان اپنی تخلیق و ترویج کے بعد آہستہ آہستہ تمام دوسری زبانوں پر چھاتی اور ان سے اپنا مقام، بحق خود چھوڑواتی، بڑھتی چلی گئی۔ اور سبھوں نے بلا امتیاز فرقہ و مراتب اور بلا لحاظ مذہب و مسلک، اسے قبول و رائج کیا کیونکہ وہ ان کے اپنے ملک کی مخلوق اور اتفاق و یکجہتی کا نشان تھی۔ مسٹر سی۔ پی۔ رائے نے لکھا ہے :۔

"چودھویں صدی سے جب نہ صرف شمالی ہند، بلکہ جنوبی ہند میں بھی اسلامی اقتدار بڑی حد تک قائم ہوگیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک کی تاریخ ہند سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان چھ صدیوں میں فرقہ پرستی قطعاً معدوم تھی۔ یہ مرض زمانہ حال میں پیدا ہوا ہے اور اب فی زمانہ اردو زبان کے مسئلے کو لے کر سیاسی مصالح کی بنا پر، اس کو ترقی دی جاری ہے۔ حالانکہ اردو، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان اور اہلِ ہند کی متحدہ قومیت کا نشان ہے۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ ایسی حقیقت ہے جس کی خبر' ابھی نہیں جیسی' غیرملکیوں کو بھی مل چکی تھی۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے ایک خطبہ میں اہلِ فرانس کو اطلاع دی تھی کہ:-

(۱) "ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو زبان دن بہ دن ترقی کر رہی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ مورخہ ۲۷ فروری ۱۸۶۲ء سے مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے تمام زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ جاریہ ہائی کورٹ میں اردو زبان میں ہی کارروائی کی جائے۔"

(۲) "اسی طرح نومبر ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ کشمیر کی گدی نشینی کے موقع پر جموں میں جو دربار منعقد ہوا تھا اس میں مسٹر ڈیوس نے اردو زبان میں تقریر کی۔ مسٹر ڈیوس اس موقع پر گورنمنٹ ہند کے نمائندہ تھے۔ جب موصوف نے راجہ کے سینے پر تمغے لگا چکے تو راجہ نے بھی اردو ہی میں ان کی تقریر کا جواب دیا۔"

(۳) "ہندوستان کے ایک دوسرے حصہ بنگال میں جس وقت سر جے۔ پی۔ گرانٹ سابق لفٹننٹ گورنر یورپ واپس جا رہے تھے، کلکتہ کے باشندوں نے ۱۶ اپریل کو ایک جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت راجہ رادھاکانت دیو بہادر نے کی۔ موصوف بڑے فاضل آدمی ہیں اور ایک ضخیم سنسکرت کے لغت کے مصنف ہیں۔ مگر اس موقع پر موصوف نے جو تقریر کی وہ اردو ہی میں تھی۔ ان کی تقریر کے بعد راجہ کالی کرشن بہادر کھڑے ہوئے۔ موصوف بھی مشہور مصنف ہیں اور آپ نے "گگ" کی کہاوتوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے، مگر آپ نے بھی اردو ہی میں تقریر کی نہ بنگالی میں۔"

(۴) "ہندوستان کے اخباروں سے معلوم ہوا کہ سر جان گرانٹ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جس میں تشکر و احترام کے جذبات کا اظہار تھا۔ یہ سپاسنامہ تجویز کی شکل میں متفقہ طور پر منظور ہوا۔ اس کے بعد راجہ اودیندرا کرشن نے اردو میں ایک تقریر کی۔ ان واقعات کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ...... سب اہلِ ہند اردو زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل سے بنی ہے۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری نے خوب فرمایا ہے کہ :-

"مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے اور یہاں کی آبادی میں اس طرح مل جل جانے سے، جیسے گوشت و ناخن ملے ہوئے ہیں۔ ہندو تہذیب و تمدن اور ادب کو سو فیصدی فائدہ پہنچا۔ اس ملاپ کا نتیجہ "اردو زبان" اور "اردو ادب" ہے۔ اگر اردو مٹی تو ہندو اور مسلمان دونوں کا جینا اکارت ہے"۔

فراقؔ گورکھپوری کے آخری جملہ کا بلیغ مفہوم، سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا جب تک سر تیج بہادر سپرو کا یہ جملہ آپ کے سامنے نہ ہو کہ :-

" اردو کا مسئلہ، کسی زبان کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مجموعی طور پر در حقیقت تہذیب کا مسئلہ ہے "

مسٹر جگیشور سنگھ سری واستو نے خوب فرمایا تھا کہ :-

"تمام حاکم قومیں، اپنے محکوموں کو اپنی زبان قبول کرنے پر مجبور کیا کرتی ہیں، لیکن مسلمانوں نے، ہندوستان میں آکر اخرالامر فارسی کو چھوڑ دیا اور ہندی و فارسی کو مخلوط کر کے ایک نئی زبان رائج کر دی جسے اردو کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغلوں اور ہندوستانیوں کے درمیان یہ ایک قسم کی مفاہمت تھی جس میں اساسی اعتبار سے "زبان" تو ہندوستان کی رکھی گئی لیکن "رسم الخط" فارسی کا اختیار کیا گیا۔ چنانچہ اردو کے افعال و حروف تقریباً برج بھاشا سے لے لئے گئے اور اسماء میں بعض فارسی کے وہ الفاظ شامل کر لئے گئے جو علی العموم گفتگو میں رائج ہو چکے ہیں اور جنہیں تمام ہندوستانی بخوبی سمجھتے ہیں "

اردو میں یہ فارسی الفاظ داخل کرنے والے کیا مسلمان تھے؟ ایک غیر جانب دار کی شہادت ملاحظہ ہو۔ انسائکلو پیڈیا، اردو زبان کے سلسلے میں رقمطراز ہے کہ :-

"اردو کا یوں بتدریج طور پر فارسیت آمیز ہو جانا، ایرانی اثر سے زیادہ، ہندی اثر سے تھا...... اس میں فارسی عنصر کو کثرت سے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

داخل کرنے والے ان ایرانیوں اور ایرانی نژاد لوگوں سے زیادہ ہندو عمّال تھے جو حکومت مغلیہ میں ملازم اور فارسی داں تھے۔"

اردو زبان کو اگر یہ مرتبہ حاصل نہ ہوتا کہ اس کو بنانے اور سنوارنے والے زیادہ تر "ہندو" تھے، تو اِس پچھتر (۷۵) فیصدی اکثریت میں، جو ہندو کے نام سے موسوم ہے، ہرگز یہ زبان مقبول نہ ہوتی اور اگر اس کی بنیاد میں سنسکرت اور فارسی دونوں شامل نہ ہوتی، جیسا کہ پنڈت نہرو نے اعتراف کیا ہے کہ:۔

"یہ سنسکرت زبان کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے۔"

تو سمپورنا نند جی یہ ہرگز نہ فرماتے کہ:۔

"یہ آواز اٹھانا کہ ہندی یا اردو پر حملہ ہو رہا ہے، غلطی ہے۔ جو لوگ قدیم اردو کے حامی ہیں وہ ملک کی ادبی ترقی کے دشمن ہیں۔ ہم کو تو اس ہندوستانی میں ترقی کرنا ہے جس سے دونوں دھاریں ملتی ہیں اور مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ہندوستان کی ترقی میں اس وقت سب سے زیادہ وہ لوگ مدد دے سکتے ہیں جو سنسکرت اور فارسی دونوں سے واقف ہیں۔"

اور پنڈت وشوناتھ ورما یہ افسوس و اعلان نہ کرتے کہ:۔

"دل اجازت نہیں دیتا کہ ہندو مسلم بزرگوں کی محنتِ شاقہ یوں برباد ہوتی نظر آئے اور ہم دیکھا کریں۔ اگر میری آواز میں طاقت ہوتی تو اتنا عرض کئے بغیر نہ رہتا کہ خدارا اس زبان پر رحم کرو جس پر ہندو اور مسلمان بزرگوں نے عظیم الشان شہنشاہ اکبر کے جذبۂ قومی کی حکمت عملی کو مدت دراز کے بعد سمجھ کر اور اس پر عمل پیرا ہو کر ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد رکھی تھی۔"

بہرکیف!

جان پر آ بنی ہمدم مری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر (رانا کرب سنگھ دیوانہ بریلوی)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہندوستان میں "اردو" کے خلاف جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ فطری نہیں بلکہ بقول لالہ منولال صفاؔ لکھنوی (وفات ۱۹۶۷ء ۱۳۸۷ھ) : سے

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ؟
کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں

انگریز، دنیا کی سب سے زیادہ عیّار و مکّار اور ذہین و دوربیں قوم واقع ہوئی ہے۔ جب انگریز ہندوستان آئے تھے تو اس ارادہ سے نہیں آئے تھے کہ وہ اس ملک پر قبضہ کریں گے اور نہ اس لئے آئے تھے کہ وہ یہاں رچ بس جائیں گے۔ بلکہ صرف تجارت کر کے کمانے کھانے آئے تھے۔ مگر ہندوستان کے حالات نے آگے چل کر انہیں یہ سُجھایا کہ یہاں حکمرانی بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہاں اس کی داغ بیل ڈال دی اور جب وقت آیا کہ انھوں نے یہاں پوری طرح اپنے پاؤں جما لئے تو اپنی حکومت کے استحکام و بقا کی راہ میں انہیں ایک ہی سنگِ گراں نظر آیا۔ اور وہ "ہندو مسلم اتحاد" تھا۔ لہٰذا انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ دونوں قوموں کے اس اتحاد کو کسی طرح ختم کر دیں اور ان دونوں کے درمیان ایک ایسی گہری خلیج حائل کر دیں، جو کبھی کسی طرح پاٹی ہی نہ جا سکے اور انگریزوں کے خلاف، آئندہ کوئی متحدہ محاذ قائم ہی نہ ہو سکے۔ اور یہ زہر ہندوؤں اور مسلمانوں کے جسم میں دن بہ دن گھلتا ہی چلا جائے، چاہے انگریز اس ملک میں رہیں یا نہ رہیں۔ چنانچہ اس پروگرام پر عمل درآمد کے لئے انھوں نے غور و فکر کے بعد ایسا زہریلا انجکشن تجویز و منتخب کیا جو لگاتے وقت تو مریض کو باکیف و صحت بخش معلوم ہو، لیکن انجام کار وہ سارے اعصاب و تمام عضلات کو تباہ و برباد کر ڈالے۔

چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو قطعاً نظر انداز کر کے ہندوؤں کو شرفِ قبول بخشا جائے تاکہ وہ لامحالہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مسلمانوں سے اپنے کو جدا کر لیں۔ چنانچہ شمالی ہند کے ہندوؤں کو یہ بتایا اور سمجھایا جانے لگا کہ مسلمان ایک بدیسی قوم ہیں جنھوں نے باہر سے آکر ہندوؤں کو اپنا غلام بنا لیا تھا اور مسلم حکمراں، ہندو دشمن فرمانروا تھے جنھوں نے ہندوؤں کو جدید علوم و فنون کے حصول سے اس لئے باز رکھا کہ کہیں وہ تعلیم یافتہ ہوکر ان سے حکومت چھین نہ لیں۔ تم مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دو، ہم سے ملو۔ ہم تمہیں تعلیم یافتہ بنا کے عزت بخشیں گے۔ چنانچہ ۱۷۸۸ء میں چارلس گرانٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا کہ:-

"وہ بتدریج ہندوؤں کو ہماری زبان سکھائے اور بعد میں اس کے ذریعہ ہمارے فنون، فلسفہ اور مذہب کی تعلیم دے"

مسلم حکومت پر اعتراض تھا کہ وہ ہندوؤں کو تعلیم نہیں دلاتی حالانکہ بقول لوڈ میکس مولر:-

"انگریزی عملداری سے قبل، صرف بنگال میں اسّی ہزار مدرسے تھے اور ہر چار سو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا"

چونکہ انگریزوں کو یہ خطرہ محسوس ہو سکتا تھا کہ کہیں ہندو، انگریزی تعلیم حاصل کر کے خود اُن کے خلاف کبھی اٹھ کھڑے نہ ہوں، اس لئے مسٹر ہوکس نے ڈائرکٹروں کو، اس تحریر میں یہ بھی اطمینان دلایا کہ ایسا سوچنا حماقت ہوگی۔ کیونکہ:-

"ہندو اِس قدر کمزور دل ہیں کہ اُن میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہونے کی ہرگز کوئی امید نہیں ہے"

چنانچہ ۱۸۱۶ء میں پہلا انگریزی کالج کلکتہ میں۔ پھر ۱۸۲۱ء میں پونا میں اور ۱۸۲۳ء میں آگرہ میں قائم ہوا۔ سرکاری تعلیمی کمیٹی نے دسمبر ۱۸۳۱ء میں جو رپورٹ شائع کی تھی اس میں لکھا تھا کہ:-

"ہندو کالج کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ کرنا، اس کمیٹی کے خاص مقاصد میں رہا ہے۔ اس سے جو نتائج حاصل ہوئے وہ امید سے زیادہ ہیں"

یہ سلسلہ جاری رہا۔ تیس ۳۰ بتیس ۳۲ برس کے بعد جب انگریزوں نے دیکھ لیا کہ ہندوؤں میں روشن خیالی آگئی ہے تو انھوں نے اب اس کی کوشش شروع کی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے خلاف اُبھارے کے اُن میں چپقلش اور تعصّب پیدا کرا دیا جائے تاکہ وہ کبھی متحد ہو ہی نہ سکیں۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء میں سر ہنری الیٹ نے ہندوستان کی ایک نصابی تاریخ لکھی، جس کے دیباچہ میں انھوں نے فرمایا کہ :۔

"بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے، جن سے ہمیں توقع تھی کہ اس قوم کے محسوسات، توقعات اور معتقدات، ہمیں معلوم ہوتے مگر وہ تو احکام اور ہدایات کے مطابق "محرم" کو "محرم شریف" لکھتے ہیں۔ قرآن کو "کلام پاک" کہتے ہیں اور اپنی تحریرات کو "بسم اللہ" سے شروع کرتے ہیں[1]"

اس تحریر کو نہایت توجہ اور غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ انگریزوں نے کیا کیا؟ الیٹ صاحب کی خواہش تھی کہ ہندو نہ صرف مسلمانوں سے شدید نفرت کرنے لگتے بلکہ مسلم حکمرانوں کو ظالم و جابر بھی بتاتے اور مسلمانوں کے مذہبی تیوہاروں اور دینی معتقدات سے اپنے کو الگ کرکے مسلمانوں کے مذہب کی تذلیل و تحقیر بھی کرتے، لہذا آگے بڑھ کر اس دیباچہ میں انھوں نے نہایت غضبناک ہو کر ہندوؤں کو ڈانٹا اور لعنت ملامت کیا کہ :

"اب جبکہ ہندو، اپنے ظالم آقاؤں کے چنگل سے نکل کے آزاد ہو گئے ہیں اور بغیر روک ٹوک کے اپنے دل کی باتیں ظاہر کر سکتے ہیں، تب بھی اِن غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے، ایک بھی اپنے ملک کے محسوسات کے مطابق نہیں لکھتا۔ یا طویل زمانہ کی مظلومیت کے خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔"

چنانچہ ہندوؤں پر یہ حربہ کارگر ہو گیا اور ایلیٹ صاحب کی مرضی کے مطابق، اس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلم حکمرانوں کے خلاف تحریریں وجود میں آنے لگیں۔ اور مسلم دورِ حکومت

---

[1] آج بھی ایسے ہندو موجود ہیں۔ پنڈت لبھو پرشاد عرش ملسیانی مرحوم کا "آہنگِ حجاز" ہوتا کا پورا نتیجہ کلام کا مجموعہ ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کو "رحمت" کے بجائے "زحمت" بتایا اور سمجھایا جانے لگا۔ حالانکہ بقول میجر باسو:۔

"رعایا کی خوش حالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دورِ حکومت سونے کے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ دولت مندی، آرام اور چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آیا وہ بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔"

پھر جب حقیقت یوں ہے تو ہندو مصنفین نے مسلم دورِ حکومت کے خلاف کیوں لکھا؟ اس سوال کا جواب پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی سے سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔

فریبِ زندگی، جس نے نہ دیکھا ہو، مجھے دیکھے
نہ سینے میں ہے دل اپنا، نہ منہ میں ہے زباں اپنی

انگریزوں نے زبردستی جو کچھ انہیں کہنے اور لکھنے کہا وہ بچارے کہنے اور لکھنے لگے۔ مسلمان بادشاہوں، خصوصاً اورنگ زیب پر ہندو دشمنی کا جو الزام لگایا جانے لگا اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ بقول پنڈت سندر لال:۔

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں، ہندو اور مسلمان یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی ایک طرح سے توقیر کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ..... ہر بادشاہ کی طرف سے بیشمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہند میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں، جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے۔ اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک ایل میں سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔"

مسٹر سوامی ناتھن نے لکھا ہے:۔

"اورنگ زیب کی بے تعصبی اور رواداری سے متعلق جمہوریہ ہند کے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنی مشہور کتاب "انڈیا ڈیوائڈڈ"
میں جو واقعات اور ثبوت قلمبند کئے ہیں ان کی تصدیق پر مشتمل دستاویزات
موجود ہیں۔ بلکہ ڈاکٹر راجندر پرساد آنجہانی کے علاوہ بہت سے
دوسرے ہندوؤں نے بھی، اس مغل شہنشاہ کی بے تعصبی کا اعتراف
کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بنارس کے ایک وکیل بابو نرنجن سینی نے
"بنارس سٹی" میں ایک مضمون اورنگ زیب پر لکھتے ہوئے یہ واقعہ
قلمبند کیا ہے کہ ایک مرتبہ اورنگ زیب کو یہ خبر ملی کہ بعض حکام برہمنوں
کو پریشان کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بنارس کے گورنر ابو الحسن
کو لکھا کہ اسلام کے حکم کے مطابق، مندروں کو ڈھانے اور پجاریوں پر
سختی کرنے کی ممانعت ہے۔ اس لئے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ہندوؤں
پر سختی نہ ہونے پائے۔ ریاست رام نگر ضلع بارہ بنکی کے سابق منیجر
بابو نرائن کا ایک مضمون ۱۹۲۴ء میں لاہور کے مشہور ہندو اخبار
"سیاست" میں شائع ہوا تھا کہ ضلع سیتاپور میں "سرکہ" کے مشہور
مندر کے مہنت کے پاس ایک سند موجود ہے، جس میں اس مندر
کے لئے بہت سے مواضعات وقف کئے گئے تھے۔

۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو ہندوستان کی 'لوک سبھا' میں کانگریسی ممبر شری مہاویر تیاگی
نے اورنگ زیب کی حکومت کو مثالاً پیش کیا تھا کہ کس طرح یہ بادشاہ سرکاری خزانہ
کو عوام کی مقدس امانت سمجھتا تھا اور اس سے ایک پیسہ بھی کسی حالت میں نہ لیتا تھا۔
یہاں تک کہ اس نے مرتے وقت چار روپیہ دو آنہ اس وصیت کے ساتھ چھوڑا تھا کہ یہ
رقم اس کے کفن دفن پر خرچ ہو۔ اور تین سو پانچ روپیہ قرآن شریف لکھ کر حاصل کیا
تھا جس کے بارے میں یہ وصیت کی تھی کہ وہ رقم غریبوں اور محتاجوں پر خرچ کر دی
جائے۔ لہٰذا موجودہ حکومت ہند بھی اسی راستہ پر چلے اور عوامی فنڈ کو مقدس
امانت سمجھے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سرسی-پی-رائے ہندوستان کی ایک اہم شخصیت ہوتے ہیں- انھوں نے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں پر بہت کچھ لکھا ہے وہ اورنگ زیب کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"اورنگ زیب کے عہد میں، بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور وہ بڑے بڑے زمیندار بنائے گئے تھے۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا تھا یہاں تک کہ اس نے خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت تھا۔"

مسلم حکمرانوں کے خلاف، انگریزوں نے شمالی ہند کے ہندوؤں کو اس قدر بھڑکایا کہ سلطان ٹیپو تک ان کی زد سے نہ بچا، جو درحقیقت انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن اور ہندو مسلم اتحاد کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ گاندھی جی نے "ینگ انڈیا" میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا:-

"ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ"

اس عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

"میسور کا بادشاہ فتح علی ٹیپو سلطان، اجنبی مورخوں کی نگاہ میں متعصب مسلمان تھا جس نے اپنی ہندو رعایا کو بہ جبر مسلمان بنالیا تھا- لیکن یہ سب محض جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں سے اس کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے...... اس عظیم المرتبت مسلمان سلطان کا وزیر ہندو تھا جس نے، نہایت شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ اس فدائے وطن و آزادی کو دغا دے کر، دشمنوں کے ہاتھ میں دیدیا تھا۔ میسور کے آثار قدیمہ کے پاس اس وقت سلطان کے تیس ۳۰ سے زیادہ خطوط ہیں جو سلطان نے سرنگری مٹھ کے شنکراچاریہ کو لکھے تھے- یہ خطوط کنڑی زبان میں ہیں.... ٹیپو نے ہندوؤں کے لئے نہایت فیاضی سے جائدادیں وقف کیں اور خود ٹیپو سلطان کے محل کے اردگرد شری ونکٹا، رامنا سری نواس اور سری

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

رنگناتھ کے مندروں کی موجودگی، سلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا ثبوت ہے "

غرض ہندو مسلم تفریق کے لئے انگریزوں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی ہر حیثیت سے، شمالی ہند کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف خوب خوب بھڑکایا تاکہ وہ مسلمانوں سے الگ ہو کر رہیں اور دونوں کبھی ملنے نہ پائیں۔ اور انگریزوں کی حکومت کو متحدہ ہندوستانی طاقت سے زور آزمائی نہ کرنی پڑے۔ چنانچہ نتیجہ ان کے حق میں نکلا اور ہندو مسلم دو حصوں میں کٹ اور بٹ گئے۔ شمالی ہند کے کچھ ناسمجھ ہندوؤں نے مسلمانوں کے دورِ حکومت کو لعنت قرار دینا شروع کیا۔ مسلمانوں کو بدیسی اور اردو کو مسلمانوں کی اجنبی زبان ظاہر کیا جانے لگا جیسا کہ انگریزی حکام کی مرضی و خواہش اور تعلیم و تربیت تھی۔ انھوں نے اس اثر انگیزی کے دور رس نتائج پر کبھی غور نہ کیا کہ آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس طور سے انگریزوں کا زہریلا انجکشن پورا پورا کام کر گیا۔

۱۸۸۵ء میں کانگریس قائم ہوئی اور اس کا پہلا اجلاس پونا میں ڈبلو۔ سی۔ بنرجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ۱۸۸۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں یہ ریزولیشن بھی منظور کیا گیا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ اب انگریزوں نے خلاف توقع دیکھا کہ جن ہندوؤں کو کمزور اور سیاسی آزادی حاصل کرنے کی قابلیت سے محروم و معذور سمجھ کے آگے بڑھایا گیا تھا، وہی ہندو، پر پرزے نکالنے لگے ہیں اور آزادی کے لئے پر تولنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور جن مسلمانوں سے انہیں علیحدہ رکھا گیا تھا، ان کو بھی اس میدان میں متحد کرکے لانے کی داغ بیل ڈال رہے ہیں، تو انہیں بڑی تشویش ہوئی۔ ایک رائے یہ ہوئی کہ آئندہ سے ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کو ابھارا جائے۔ چنانچہ ۸ مارچ ۱۸۸۷ء کے "کلکتہ گزٹ" میں لکھا گیا کہ:۔

"بہت سے آدمیوں نے یہ صلاح دی ہے کہ مسلمانوں کو تقویت دے کر ہندوؤں کی قوت کو مغلوب کرنا چاہئے مگر یہ تدبیر و انتظام

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اچھا نہیں ہے "

پھر عمدہ تدبیر کون سی سوچی گئی ؟ اچھا انتظام کیا تجویز ہوا ؟ یہ کہ ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دے کر سنگین سے سنگین تر بنایا جائے ۔ چنانچہ اب انگریزوں نے اردو ہندی کے مسئلہ کو ابھارا ۔ یو۔پی میں عدالتی رسم الخط بدستور اردو تھا ۔ لہذا شمالی ہند کے ہندوؤں کو شہہ دی گئی کہ وہ اس کے خلاف صف آرا ہو جائیں ۔ چنانچہ یہ مسئلہ شدت سے ابھر کر سامنے آ گیا ۔ اور فضا کا تکدر بڑھتا چلا گیا ۔ اردو مسلمانوں کی زبان ظاہر کی جانے لگی اور بدیسی قرار دی گئی اس لئے کہ مسلمان باہر سے ہندوستان میں آئے تھے اور ہندی آریوں کی زبان قرار پائی اور اسے دیسی بتایا گیا ۔ اس مسئلہ نے تلخی کی انتہا کر دی اور ہندو مسلم نہ صرف سیاسی و سماجی حیثیت سے دو حصوں میں فریقانہ شان سے بٹ گئے ، بلکہ ایک دوسرے کے دشمن بھی بن گئے ۔ انگریزوں کی خواہش کے مطابق ایسا ہو جانا نہایت مبارک قرار پایا اور ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ سر جان مہارڈ نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کو بشارت دی کہ :۔

" ہندوستان میں مخاصمانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے ، جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت نہ قائم ہو سکتی تھی نہ برقرار رہ سکتی تھی "

یہ خبر انگلینڈ ہی نہیں ، فرانس بھی پہنچی ۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے فرانسیسیوں کو اطلاع دی کہ :۔

" ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے "

یہ ہے مختصر کہانی اُس اختلاف و انشقاق کی جو انگریزوں نے اپنے مفاد کے لئے شمالی ہند کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا کرائی ۔ اس لمبی روداد کو چند لفظوں میں پنڈت جواہر لال سے بھی سن لیجئے ۔ وہ فرماتے ہیں :۔

" اول ہندو قومیت کا جذبہ پیدا ہوا ۔ پھر آہستہ آہستہ مسلمانوں میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھی یہ جذبہ ابھرا۔ پھر زبان کا مسئلہ اٹھا اور لکھنے کے حروف اور
عدالتوں اور دفاتر میں ان کے اجرا کے باب میں بحثیں چھڑیں۔ اس
طرح زبان و حروف کی علحدگی سے سیاسی اور قومی احساس پیدا ہوا جس
نے فرقہ وارانہ صورت اختیار کر لی"

دراصل انگریزوں کو نہ تو مسلمانوں سے بغض تھا اور نہ ہندوؤں سے ان کو محبت تھی،
بلکہ یہ سب کچھ اس سبق کے تحت کیا گیا تھا جو بہت پہلے سر جان میلکم نے انگریزوں کو
پڑھایا تھا اور جیسے میجر باسو نے اپنی کتاب میں یوں نقل کیا ہے:۔

"اس قدر وسیع سلطنت میں، ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت
صرف اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں،
ان کی تمام تقسیم ہو۔ اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں،
فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جدا رہیں گے،
اس وقت تک کبھی، کسی حالت میں، کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوت کے
استحکام کو متزلزل نہ کر سکے گی"

غور فرمایئے کہ تقسیم در تقسیم کا جو پروگرام بنا تھا اس پر کس عمدگی سے عمل کیا گیا اور
وہ زہر انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی، کس بری طرح ہندوستان کی وحدت،
عظمت اور سالمیت کو تباہ و برباد کر رہا ہے؟ شمالی ہند کے ہندوؤں کو مسلمانوں سے
کاٹ کر الگ کر دینے کے لئے جو جو مسائل انگریزوں نے کھڑے کئے تھے، وہ اس وقت
تو بظاہر "ہندو مسلم مسئلے" بنے رہے مگر اب اس کے مہلک اثرات یوں ظاہر ہو رہے
ہیں کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ پھر جو حصہ ہندوستان کے نام سے رہ گیا ہے اس میں قوموں
اور ذاتوں کی بنا پر آئے دن صوبے کٹ کٹ کر ایک علحدہ اسٹیٹ بن جانے کے لئے
پر تول رہے اور دھمکیاں دے رہے ہیں۔ پھر اسی پر بس ہو جاتا تو ایک بات تھی۔ حد تو
یہ ہے کہ شمالی ہند کے ہندوؤں کو، مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کرتے اور کہتے دیکھا اور
سنا تھا عملاً اور قولاً وہی سب کچھ آج جنوبی ہند کے ہندو، خود شمالی ہند کے ہندوؤں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے خلاف کر اور کہہ رہے ہیں۔ وہاں ایسی کتابیں لکھی جارہی ہیں جن میں شری رام چندر جی کو بد اخلاقیوں کا مجسمہ اور راون کو نیکیوں کا پتلا ظاہر کیا جارہا ہے۔ ہندوستان میں دسہرہ کے موقع پر ہمیشہ راون کا پتلا جلایا جاتا تھا۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں شمالی ہند کے ہندوؤں کو جنوبی ہند کے ہندوؤں نے نوٹس دیا کہ اگر آئندہ ایسا ہوا تو ہم رام جی کا پتلا جلائیں گے۔ چنانچہ اس مسئلہ نے ایسی شدت اختیار کرلی تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس عمل کو روکنے کی تاکید کردی تھی۔ مگر لوگوں نے پنڈت جی کی ہدایت پر کوئی توجہ نہیں دی اور بدستور راون کا پتلا جلایا جاتا رہا۔ اور جنوبی ہند والوں کی ناراضگی بڑھتی چلی گئی۔ اخبار "انڈین اکسپریس" کی اطلاع کے مطابق دسمبر ۱۹۷۳ء میں دراوڑ کازگام والوں نے دھمکی دی کہ اگر اب آئندہ شمالی ہند میں راون کا پتلا جلایا گیا تو جنوبی ہند والے ۲۵ر دسمبر کو "راون لیلا" منائیں گے اور اس میں رام اور سیتا دونوں کا پتلا جلائیں گے۔ چنانچہ کانگریسی ممبر سورن سنگھ سوکھی نے ۱۲ر دسمبر کو پارلیمنٹ میں اس مسئلہ کو چھیڑا مگر کچھ نہیں ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "انڈین اکسپریس" مورخہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۴ء کی اطلاع کے مطابق مدراس کے رام سوامی کی بیوی پر میلا دیوی نے ۲۵ر دسمبر کو رام اور سیتا کا پتلا جلایا اور "راون لیلا" بڑی دھوم دھام سے منایا جس میں لاکھوں آدمیوں نے شرکت کیا۔ اخباروں میں اس ردِ عمل کا بڑا چرچا ہوا مگر عملاً کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی اور جنوبی ہند والوں کے جذبات اور احساسات کو ناقابلِ توجہ سمجھا گیا۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۷۵ء کی اطلاع ہے کہ مدراس سے کچھ دور موتھیلا پیٹن میں ڈی۔ ام۔ کے والوں نے اپنے غم و غصہ کے اظہار میں احتجاجاً وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کا پتلا جلایا۔ نہ صرف اتنا بلکہ تامل ناڈو کانگریس کمیٹی کے دفتر پر حملہ بھی کیا گیا جس میں پردیش کانگریس کے جنرل سکریٹری کے بیان کے مطابق سات کانگریسی زخمی ہوئے۔ غرض یہ دیا بڑھتی جارہی ہے اور جنوبی ہند والوں کی وحشت زور پکڑتی جارہی ہے۔ پندرہ روزہ انگریزی رسالہ "کاروان" (دہلی) کے جنوری ۱۹۷۵ء کے دوسرے شمارہ میں خود ایڈیٹر کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں رام اور راون کا باہم مقابلہ کرکے دعویٰ کیا گیا ہے کہ راون ہر لحاظ سے رام سے بہتر تھا۔ بمبئی کے مشہور اخبار "النسٹریٹڈ ویکلی"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں بھی اس موضوع پر بحث شائع ہوئی ہے مگر شمالی ہند کے لوگ ہوش میں نہیں آرہے ہیں۔ نہ صرف اتنا بلکہ اب تو بات اتنی آگے بڑھادی گئی ہے کہ مسئلہ رام و راون ہی تک کا نہیں رہا ہے۔ وہاں جھانسی کی رانی ظالم و سفاک بتائی جارہی ہیں۔ آریوں کو باہر سے آئی ہوئی قوم بتا کے ان کے حقوق ہندوستان پر ہونے سے انکار کیا جارہا ہے اور یہ مطالبہ جڑ پکڑ رہا ہے کہ ہندوستان کی مزید تقسیم ہو اور جنوبی ہند کو شمالی ہند سے بالکل الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۶ر جنوری ۱۹۶۵ء کو "یوم جمہوریہ" منانے کے بجائے جنوبی ہند میں "ڈراوڑ منترا کازگام" نے "یوم غم" منایا اور اس دن ۲۶ سالہ نوجوان شیوانگم نے اپنے کو زندہ جلا کے سارے جنوبی ہند کے ہندوؤں کے دل میں تقسیم و علحدگی کا چراغ روشن کر دیا۔ یہی حال زبان کے مسئلہ کا ہو رہا ہے کہ شمالی ہند کے ناسمجھ افراد نے جو کچھ پہلے اردو زبان کے خلاف کہا تھا وہی سب کچھ اب جنوبی ہند کے ہندو، ہندی زبان کے سلسلہ میں کہہ رہے ہیں۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو کیرل کے وزیر اعظم نے مدراس میں بیسویں ملایالی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:-

"یہ صحیح ہے کہ کوئی خوددار انسان انگریزی زبان کو راشٹر بھاشا بننے کی اجازت نہیں دے سکتا، مگر یہ غلط ہے کہ انگریزی کی جگہ ہندی کو دے دی جائے۔ کیونکہ ہندوستان میں کوئی واحد راشٹریہ بھاشا نہیں ہے، بلکہ یہاں ایک درجن سے زیادہ قومی زبانیں موجود ہیں، لہذا غیر ہندی بولنے والی ریاستیں، ہندی کو واحد راشٹر بھاشا بننے کی اجازت نہیں دے سکتیں، بلکہ مصالحت کی بہترین اور واحد صورت یہ ہے کہ تمام زبانوں کی مکمل مساوات کو تسلیم کر لیا جائے۔"

سرکاری زبانوں کے قانون ۱۹۶۳ء کے ترمیمی بل کی بحثوں کے درمیان ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو تقریر کرتے ہوئے ڈراوڑ ممبر پارلیمنٹ مسٹر راجہ رام نے ہندی زبان کے خلاف جو کچھ کہا وہ تو کہا ہی تھا، آخر میں کانگریسی ممبر مسٹر بھبھوتی مصرا کا جواب دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اتری اور دکھنی ہندوستان کی آبادی کا تبادلہ کر لیا جائے۔ شمالی ہند

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں انگریزی کے ساتھ بورڈ جلائے جانے لگے تو جنوبی ہند میں ہندی کے سارے بورڈ برباد کر دئے گئے۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ شمالی ہند میں انگریزی کے بورڈوں پر "سیاہ رنگ" پھیر جاتے تھے اور جنوبی ہند میں ہندی کے بورڈوں پر "لال رنگ" لگائے جاتے تھے تاکہ وہ اِس ارادہ کو بھی ظاہر کر دیں کہ اس سلسلہ میں وہ اپنے خون کو ارزاں کر دیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ شہری حقوق کی آل انڈیا کونسل کے صدر مسٹر ان۔ سی۔ چٹرجی ممبر پارلیمنٹ نے اپنے تار مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۶۷ء بنام وزیر اعظم ہند میں کہا تھا کہ براہ کرم سرکاری زبانوں کے قانون میں ترمیم کرنے والے مسوّدہ کو زم نہ کیجئے اور اگر اس مسئلہ کو تارپیڈو کر کے غرق کر دیا گیا تو یاد رکھئے کہ تامل ناڈو، بنگال اور غیر ہندی ریاستیں ہندوستان سے اپنی علحدگی کا مطالبہ کرنے لگیں گی۔ اور یہی جذبہ تھا کہ جس کی بنا پر ۱۶ دسمبر کو مدراس کے وزیر اعلیٰ نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ "آئینِ ہند" سے زبان کے باب کو سرے سے ہٹا ہی دیا جائے اور ۱۹۴۷ء کے پہلے کی طرح انگریزی کو جاری رکھا جائے۔ وقت گزرنے پر یا آئندہ جب کبھی ضرورت ہوگی کہ کوئی زبان ہندوستان کی رابطہ کی زبان بنے تو دیکھا جائے گا کہ کون سی زبان یہ مرتبہ رکھتی ہے؟ غرض شمالی ہند میں کل جو کچھ مسلمانوں کے خلاف یہاں کے ہندوؤں نے کہا تھا، وہ سب کچھ آج جنوبی ہند میں خود شمالی ہند کے ہندوؤں کے خلاف، وہاں کے ہندو کہہ رہے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر کہ شمالی ہند کے ہندو اردو زبان کے کس قدر خلاف ہیں، حالانکہ وہ بدیسی زبان نہیں، بلکہ خالص ملکی زبان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ کوششوں کی پیداوار ہے، انہیں یہ خدشہ و اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ آخر کار جنوبی ہند کی زبانوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ لہٰذا انھوں نے نہ صرف "ہندی" کے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے بلکہ وہ اس حد تک آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں کہ آبادی کے تبادلہ یا جنوبی ہند کو شمالی ہند سے الگ کر دینے کے مطالبے پیش کر رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ آج بھی ہندوستان کے برادرانِ وطن کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ جو کچھ وہ مسلمانوں اور اردو زبان کے خلاف بولے اور کہے چلے جا رہے ہیں، وہی سب کچھ آوازِ بازگشت کے طور پر، جنوبی ہند سے ان کو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اپنے اور ہندی زبان کے خلاف سُننا پڑ رہا ہے ۔ اور یہ صرف اُس زہریلے انجکشن کا اثر ہے جو انگریزوں نے اُنہیں لگایا تھا تاکہ نہ صرف ہندوستان کی قومیں الگ الگ ہو جائیں بلکہ خود ہندوستان بھی آگے چل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ۔ کاش اب بھی ہم لوگ یہ سمجھ سکتے اور لوگوں کو سمجھا سکتے کہ زمین کا مالک اللہ ہے کوئی انسان نہیں ۔ اور اگر ہندوستان مسلمانوں کا نہیں ہے، محض اس بنا پر کہ وہ یہاں باہر سے آکے بسے تھے تو بلا شک و شبہ یہ ملک شمالی ہند کے آریوں کا بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بھی ہندوستان کے قدیم باشندے نہیں ہیں بلکہ وہ ایران سے آکر یہاں بسے ہیں ۔ اور اگر یہ ملک شمالی ہند کے آریوں کا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ ایران سے آکر یہاں بس گئے، تو یہ ملک جنوبی ہند کے ڈراویڈینوں کا بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ڈراویڈین بھی ہندوستان کے اصلی باشندے نہیں ہیں، بلکہ وہ ایشیائے کوچک اور مشرقی بحر متوسط کے جزائر سے عراق، ایران اور بلوچستان کے راستے، ہندوستان میں باہر ہی سے آکے بسے تھے اور انھوں نے یہاں کے قدیم باشندوں وسٹرکوں کو دور ہٹا کے آبادی اختیار کی تھی ۔ لہذا ہندوستان نہ تو جنوبی ہند کے ڈراویڈینوں کا ہے اور نہ شمالی ہند کے آریوں کا اور نہ مسلمانوں کا ۔ اور اگر ہے تو ڈراویڈینوں کا بھی ویسا ہی ہے جیسا آریوں کا اور آریوں کا بھی ویسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کا ۔ اور اگر ڈاکٹر سری نواس کی بات کو مانا جائے تو ہندوستان، ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کا ہے ۔ انھوں نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے "قومی یکجہتی" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا تھا کہ :۔

"مسلمان، ہندوستان ہی کی زمین سے پیدا ہوتا ہے ۔ اُسی کے اوپر زندگی گذارتا ہے اور پھر بالآخر مر کر ہندوستان ہی کی زمین میں دفن ہو کر اُس کا جزو لاینفک بھی بن جاتا ہے ۔ مسلمان مادرِ ہند کا وہ سپوت ہے جس کو ہندوستان کی زمین، اپنی گود سے کبھی جدا نہیں کرتی ۔ برخلاف اس کے ہم ہندو جلا دیے جاتے ہیں، اور ہماری راکھ دریاؤں میں بہہ کر اور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

فضا میں اڑ کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ مسلمان تناسخ کے قائل نہیں اس لئے اُن کے یہاں مرنے کے بعد کہیں دوسری جگہ جنم لینے کی گنجائش ہی نہیں۔ وہ مر کر پھر اسی زمین کا جزو بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہم ہندو دوسری جنم کے قائل ہیں، جو نہ جانے کہاں، کب، کس صورت میں منتشکل ہوتی یا ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری دوسری جنم براعظم امریکہ، افریقہ، یورپ یا اپنے کسی دشمن ملک ہی میں ہو۔ اس لئے ہندوستان ہم سے زیادہ تو مسلمانوں ہی کا ملک گردانا جائے گا۔"

حقیقتاً ڈریویڈین ہوں یا آرین یا مسلمان ان میں کسی کی بھی تہذیب، کسی کا بھی تمدن اور کسی کی بھی زبان خالص اور اپنی ساتھ لائی ہوئی نہیں۔ آرین جب ہندوستان آئے تو انھوں نے ڈریویڈین تہذیب و تمدن سے لین دین کیا، یہاں تک کہ ایک دوسرے کی زبان بھی باہمدگر متاثر ہوئی اور پھر آگے چل کر مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی اس نے ہندی کا روپ دھارا۔ اسی طرح جب مسلمان ہندوستان آئے تو انھوں نے بھی ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن سے باہمدگر تبادلہ کیا، تا آنکہ ایک دوسرے کی زبان بھی متاثر ہوئی اور آگے چل کر کئی مدارج طے کرکے اس نے "اردو" کا لقب حاصل کیا۔ لہٰذا ہندی ہو یا اردو، نہ کوئی زبان بدیسی ہے اور نہ اس کا کسی خاص مذہب و قوم سے کوئی خصوصی سروکار ہے۔ دونوں "ہندوستانی" ہیں اور سب کی ہیں اور دونوں کو پھولنا پھلنا چاہئے۔ یہ بڑا افسوسناک امر ہے کہ ہم تاریخ کو فراموش کر دیں اور اس سے سبق نہ لیں اور محض تنگ نظری میں کسی بھی قوم و زبان کے خلاف مخالفانہ و معاندانہ جذبہ رکھیں۔ "قومی یکجہتی" اور "جذباتی ہم آہنگی" کی ساری تحریک و تبلیغ بیکار قرار پائے گی، اور اس سلسلہ کے ادارہ "آل انڈیا نیشنل سالیڈریٹی کونسل" کی ساری محنت اکارت اور ضائع جائے گی، اگر آپس میں رواداری نہ پیدا ہوئی۔ "رام" کی اسی وقت عزت کی جا سکے گی جب "محمدؐ" کا احترام کیا جائے گا۔ مسلم بادشاہوں کا پڑا یا اسی وقت مسلّم ہوگا جب ہندو راجاؤں کی عظمت مانی جائے گی۔ اردو یا ہندی یا کوئی بھی ہندوستانی زبان ہو، جب تک سب کو "ہندوستانی" سمجھ کے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سب کی قدر نہ کی جائے گی، اُس وقت تک کسی ایک زبان کو بھی سرسبز ہونا نصیب نہ ہوگا۔ فروری ۱۹۶۲ء میں "قومی یکجہتی" کے سوال پر غور کرنے کے لئے بنارس میں جو اہم کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اُس میں صدرِ جلسہ نے صحیح بات کہی تھی کہ:-

"اتحاد یا یکتا کوئی ایسا عقیدہ نہیں جس کا صرف ذہنی اعتراف اور زبانی پرچار، نجات کا ضامن ہو، بلکہ وہ نام ہے عملی زندگی میں ایک دوسرے سے محبت برتنے کا۔ ہمدردی اور رفاقت رکھنے کا۔ اتحاد یا یکجہتی ایک ایسا لفظ ہے جس کا کوئی لغوی مفہوم مطلق اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا صحیح مطلب احساس سے نہیں، عمل سے تعلق رکھتا ہے اس لئے یہ لفظ ہماری زبان سے نکلنا ہی نہیں چاہئے جب تک ہمارے عمل و کردار سے اس کی تصدیق نہ ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ چوراہوں پر بورڈ آویزاں کرنے، دیواروں پر پوسٹر چپکانے اور کانفرنس منعقد کرنے سے "قومی یکجہتی" ہرگز پیدا نہیں ہوگی۔ اس کے لئے ضرورت ایسے دل و دماغ پیدا کرنے کی اور ایسے کام کرنے کی ہے: جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ان میں اخلاص و محبت اور احترام و رواداری پیدا کرنے کا ذریعہ ہے:

"نیشنل انٹگریشن" کا نادر نمونہ یہ ہے کہ اجمل خاں صاحب نے دس برسوں کی مسلسل کاوش و کوشش اور مربوط تلاش و جستجو سے "بھگوت گیتا" کا اردو نثری ترجمہ "نغمۂ خداوندی" کے نام سے شائع کرایا ہے، جس میں گیتا کے اشلوکوں کا، قرآنی آیات و مذہبی روایات کے علاوہ اقوالِ بزرگان اور اشعارِ صوفیان سے تطابق کرکے دکھایا ہے کہ گیتا کی تعلیمات کا بڑا حصہ اسلامی تعلیمات سے مشابہ و مماثل اور ہم آواز و ہم آہنگ ہے۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ:-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجمہ نہایت قابلیت، جانفشانی اور صحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ سب سے زبردست خصوصیت اس کتاب کی مجھے یہ محسوس ہوئی کہ جگہ جگہ کلام مجید، احادیث اور صوفیائے کرام کے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اقوال کے حوالے دے کر یہ دکھلایا ہے کہ بنیادی طور پر تمام ہادیانِ مذاہب کی تعلیم اور اُن کے اصول ایک ہی ہیں۔ مذہبوں کی توحید و تطبیق کو ظاہر کرنے کا یہ طرز مجھے بہت عزیز ہے۔ اس لئے اس نظریے سے میں اس کتاب کا اور بھی زیادہ مسرت اور صدق دلی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ ہر اردو داں ہندو اور پڑھا لکھا مسلمان اس کتاب کو غور سے پڑھے تاکہ مؤلف کی قابلِ تحسین کوشش اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے میں کامیاب ہو سکے۔"

بلاشبہ سڑکوں پر نعرے لگانے، جلسوں میں تقریر کرنے اور جبر و دباؤ کے ساتھ مطالبہ و مواخذہ کرنے سے "قومی یکجہتی" ہرگز پیدا نہیں ہوگی۔ "نیشنل انٹگریشن" کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ پنڈت نند کمار اوستھی نے بیس برسوں کی پیہم محنت و مشقت اور گراں قدر سرمایہ صرف کرکے ادارہ "بھون وانی ٹرسٹ" (لکھنؤ) سے قرآن حکیم کا مکمل ہندی ترجمہ اس شان سے شائع کیا ہے کہ عربی متن بھی ہے اور اُس متن کو ہندی رسم الخط میں بھی اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر شخص درست اعراب اور عربی کے صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن مجید کو ہندی زبان میں بھی بہ اطمینان پڑھ سکتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے صفحہ پر اُس عربی متن کے معنی ہندی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ ہر سورہ کی تمام آیات کا مروّجہ طور پر الگ الگ نمبر بھی دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے عظیم و قابلِ قدر خدمت اوستھی صاحب نے یہ انجام دی ہے کہ ہر ہم آواز عربی لفظ کے لئے ہندی حرف کی ایک خاص شکل متعین کر دی ہے۔ اور اُس کی حالت و علامت کا دیباچہ میں ذکر بھی کر دیا ہے، تاکہ قرآن مجید کے پڑھنے والے کو عربی حرف کی صحیح شناخت ہو سکے اور وہ عربی لفظ کا بجنسہٖ صحیح تلفظ کے ساتھ مخرج ادا کر سکے۔ مثلاً عربی زبان کا چوتھا حرف "ث" (ثے)، بارہواں حرف "س" (سین) اور چودہواں حرف "ص" (صاد) ہم آواز حروف ہیں، مگر اُن کا تلفظ بالکل مختلف ہے۔ عام ہندی رسم الخط میں اِن تینوں حروف کو بلا کسی تفریق کے "دنتیہ س" (स)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے لکھ دیا جاتا ہے۔ اوستھی صاحب نے ان تینوں ہم آواز عربی حروف کے لئے جدا جدا نشان یوں تمیز کر دیا ہے:۔

ث (ثے) स़

س (سین) स

ص (صاد) सस

یا عربی زبان کا نواں[9] حرف "ذ" (ذال)، گیارہواں[11] حرف "ز" (زے)، پندرہواں[15] حرف "ض" (ضاد) اور سترہواں[17] حرف "ظ" (ظو) چاروں حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ مختلف ہے، مگر بظاہر وہ ہم آواز ہیں۔ عام ہندی رسم الخط میں ان سب کو بلا کسی تفریق کے ہندی حرف (ज) سے لکھ دیا جاتا ہے۔ اوستھی صاحب نے (ज) کو ان چاروں عربی حروف کا بجا طور پر قائم مقام نہیں مانا بلکہ ان چاروں حروف کی الگ الگ علامتیں مقرر کی ہیں:۔

ذ (ذال) ज़

ز (زے) ज़

ض (ضاد) ज़

ظ (ظو) ज़

اوستھی صاحب نے کس قدر مشقت اٹھائی ہے اس کا ان مثالوں سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شاہجہاں کا دور ہوتا تو وہ، ابو طالب کلیم کی طرح، اس عظیم خدمت کے سلسلے میں اوستھی صاحب کو سونے میں تول دیتا۔ اردو رسالہ "سرفراز" (لکھنؤ) نے اس ہندی ترجمہ اور اوستھی صاحب کی خدماتِ جلیلہ پر رائے دیتے ہوئے صحیح لکھا تھا کہ:۔

"اگر اتنا وسیع، ارفع و اعلیٰ اور عظیم و اہم کام یورپ یا امریکہ میں کوئی مستشرق کرتا تو اسے عزت، خطابات اور گرانقدر انعامات سے نوازا جاتا۔"

سو برس پہلے کی طرح اس وقت بھی اگر ہندو اور مسلمان، اجمل خاں اور نند کمار اوستھی کے سے بلند نظر، وسیع المشرب اور روادار بنیں گے اور ایک دوسرے کے محترم بزرگوں،

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مقدس کتابوں اور معصوم جذبات و احساسات کا قولاً اور عملاً لحاظ و احترام کرنا نہ سیکھیں گے، ہرگز "نیشنل انٹگریشن" کی کوشش کامیاب نہ ہوگی اور "قومی یکجہتی" کا خواب کبھی شرمندۂ معنی نہ ہو سکے گا چاہے جتنی ہی زبانی سعی و جد وجہد کی جائے۔

حکومتِ بہار نے ۱۹ ار نومبر ۱۹۸۰ء کو آرڈیننس نمبر ۶۱۴ جاری کیا ہے، جس کے ذریعہ بہار افیشیل لینگو ئجز ایکٹ نمبر ۳۹ سنہ ۱۹۵۰ء کی دفعہ نمبر ۲ میں ترمیم کرکے آئندہ کبھی اردو زبان کو بھی ریاستِ بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کی داغ بیل ڈالی ہے۔ ابھی حکومت نے اردو زبان کو بہار کی دوسری سرکاری زبان قرار نہیں دیا ہے، بلکہ صرف اس کی گنجائش نکالی ہے کہ آگے چل کر ایسا کیا جا سکے، مگر ایک طرف تو اس آرڈیننس کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا گیا ہے، گویا قیامت آگئی ہے، اور دوسری جانب قومی یکجہتی کا بھی مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ کاش یہ عقلمند اصحاب سوچتے کہ اردو کو مسلمانوں کی اور بدیسی زبان قرار دے کر اس کے خلاف ہنگامہ آرائی اور عملاً اس کے خاتمہ کی ہر ممکن کوشش کرنا، اور زبان سے "قومی یکتا" کی خواہش رکھنا اور نعرے لگا کر اس کا مطالبہ کرنا، دو متضاد چیزیں ہیں۔ "صحیح قومی یکجہتی" کا دور وہ تھا جب یہ مطالبہ اور نعرہ کسی فردِ واحد کی بھی زبان پر نہ تھا اور جب اردو کی نشو و نما اور عروج و ترقی میں ہندو اور مسلمان، بلا اختلاف مسلک و مذہب، دوش بدوش حصہ لے رہے تھے۔ ورنہ خان آرزو کے شاگرد رائے آنند رام مخلص اور سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد میر حیدر حیران کبھی نہ بنتے۔ اسی طرح "قومی یکتا" کا نقشہ "مظہر السرور" نام کا دو کالمی اخبار تھا جو ہندو مہاراجہ بھرت پور نے مسلمان ایڈیٹر صفدر علی کی ادارت میں بھرت پور سے نکالا تھا اور اس کے ایک کالم پر "اردو" اور دوسرے کالم پر "ہندی" میں ساری اہم خبریں درج کی جاتی تھیں۔ یا "قومی یکجہتی" پیدا کرنے کے جذبہ کا نمونہ پنڈت سندر لال کا اخبار "نیا ہند" تھا جو الہ آباد سے نکلتا تھا۔ یہ بھی دو کالمی اخبار تھا جس کے ایک کالم پر اردو میں اور دوسرے کالم پر ہندی میں خبریں شائع کی جاتی تھیں تاکہ ہندو مسلمان سب آسانی سے پڑھیں اور ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں۔ پھر جب تک اس دور کو لوٹایا نہ جائے گا "قومی یکجہتی"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی خواہش یا نعرہ بیکار ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں "آرگنائزر" کے "دیوالی نمبر" میں شری پرکاشا نے، جو ملک کے ایک ممتاز سیاست داں اور نامور کانگریسی ہیں، اور مختلف وقتوں میں حکومت ہند کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں، ایک مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے ایک عنوان "میرے پانچ عظیم اندیشے" کے تحت لکھا ہے:۔

"ہندوستان کا تباہی سے بچاؤ اور جمہوریت کا قیام اور اس کی بقا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ "قومی یکجہتی کو "قولاً" نہیں بلکہ "عملاً" رائج کیا جائے۔ جس طرح مسلمان امیر غریب، رنگ ونسل اور ذات پات کا لحاظ کئے بغیر ایک مسجد میں دوش بدوش کھڑے ہوکر عبادت کرتے اور ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو دس برس کے اندر ہندوستان پندرہ ۱۵ ٹکڑوں میں بٹ جائے گا اور سو سال کے اندر اندر ہندوستان سے مذہب بھی ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر "اردو" کو اس کا مقام نہ دیا گیا تو "ہندی" کبھی بھی ملک میں سرسبز نہ ہو سکے گی"

یہ بات کہ شمالی ہند میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، اسی کی آواز بازگشت اب جنوبی ہند میں سنی جاتی ہے، بعض لوگوں کو اب محسوس ہونے لگی ہے۔ اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اردو کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی یا ہو رہی ہے، اس کے نتائج ملک کے اتحاد اور سالمیت کے لئے کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ راجیہ سبھا کے ممبر پروفیسر اے۔ آر۔ واڈیا نے، اس وقت جب مارچ ۱۹۶۵ء میں راجیہ سبھا میں صدر کے شکریہ کی قرارداد پر سرکاری زبان کا مسئلہ چھڑا تھا، بحث کے دوران فرمایا تھا کہ:۔

"میں عرصہ سے ہندی کا حامی رہا ہوں مگر شمالی ہند آکر مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ جنوبی ہند کے لوگوں کے اندیشے کی معقول بنیاد ہے۔ مہاتما گاندھی اور مسٹر نہرو کی خواہشات کے باوجود "ہندی" کے حامیوں نے "اردو" کو نکال باہر کیا اور اس سے غیر ہندی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

علاقوں کے لوگ سمجھنے لگے کہ اُن کی زبانوں کا بھی یہی حشر ہوگا۔ ہندی کے حامیوں نے اردو کے ساتھ جس خصومت اور عدم رواداری کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے جنوبی ہند میں خوف کا احساس پیدا ہوگیا ہے۔"

اسی مارچ ۱۹۶۵ء میں مرکزی حکومت کے نائب وزیر لالہ شام ناتھ نے بھی دہلی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"اس وقت ملک ایک نازک دور سے گذر رہا ہے۔ حال ہی میں زبان کے سوال پر جو تشدد مدراس میں ہوا ہے، وہ بہت افسوسناک ہے۔ ہم یہ بھی بھول گئے ہیں کہ زبان کے مقابلہ میں ملک کا اتحاد حد درجہ اہم ہے۔ ہندی والوں کو چاہئے کہ وہ دوسروں پر ہندی کو زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں۔ یو۔پی کونسل میں ڈاکٹر فریدی کو اردو میں تقریر کی اجازت نہیں دی گئی، یہ نہایت افسوسناک بات ہے۔"

۸ ارمارچ ۱۹۶۵ء کو مدراس کے وزیر اعلیٰ نے بھی اس کا اعادہ کیا اور فرمایا کہ :-

"پہلے ملک کا اتحاد ہے۔ اس کے بعد زبان۔ ہم زبان کی بنیاد پر ملک کو تقسیم نہ ہونے دیں گے اور ملک کے اتحاد کو ہر حال میں مقدم رکھیں گے۔"

۳۰ ارمارچ ۱۹۶۵ء کو الہ آباد ہائی کورٹ کے فاضل جج جسٹس دھون نے بھی اپنی تقریر میں فرمایا کہ :-

"اگر قوم کی یکجہتی اور ملک کی سالمیت کے تحفظ کا واحد راستہ یہی ہو تو میں، ملکی تو کیا، کسی بھی غیر ملکی زبان حتٰی کہ چینی زبان کو بھی قومی زبان مان لینے کے لئے تیار ہوں۔ قوم کا اتحاد اور یکجہتی سب سے پہلی چیز ہے اور اس کا ہر قیمت پر تحفظ کرنا چاہئے۔ ملک کی سالمیت کی بقا، اگر غیر ہندی کے ہو سکتی ہو تو ہمیں ہندی سے دست بردار ہو جانا چاہئے اور ملکی سالمیت و یکجہتی کو بچا لینا چاہئے۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"آل پارٹی اردو علاقائی و ثانوی زبان کمیٹی" کا دوسرا جلسہ ۱۱/اپریل ۱۹۶۵ء کو دہلی میں ہوا۔ جس میں مسٹر جمنا داس اختر نے بھی اس طرف اشارہ کیا تھا، بلکہ صاف لفظوں میں فرمایا تھا کہ :-

"اگر شمالی ہند میں اردو سے انصاف کیا گیا تو جنوبی ہند میں اس کا اچھا اثر پڑے گا۔ اور وہاں کے لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ سرکار علاقائی زبانوں کو ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔"

اسی جلسہ میں مسٹر گوپی ناتھ امن کا خط بھی پڑھا گیا۔ اس میں بھی تقریباً اسی حقیقت کا اعتراف اور موکر تھا۔ اس سے پہلے اکتوبر ۱۹۶۴ء میں پنڈت آنند نرائن ملا نے اپنے خطبۂ صدارت میں مرکزی حکومت کے نائب وزیر تعلیم شری بھگت درشن جی کی ایک تقریر کا اقتباس پیش کیا تھا جو انھوں نے انا ملائی میں ۲۳/اگست ۱۹۶۴ء کو کی تھی اور کہا تھا کہ :-

"اگر ہندی کے اس مطالبے سے کہ وہ ملک کی قومی زبان تسلیم کی جائے، ہماری یکجہتی اور سالمیت کو خطرہ پیدا ہونے کا امکان ہو تو وہ اس مطالبے سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں۔"

نہ صرف اتنا بلکہ محترم ملا نے خود بھی اردو دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

"کیا ہندی کو اس طرح فروغ دینے سے "قومی یکجہتی" حاصل ہو سکتی ہے؟ میں اوروں کے بارے میں نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے اس قدر ضرور سمجھ میں آنے لگا ہے کہ تامل ناڈ میں دراوڑ کھازاگام (Dravid Khazagam) کی جماعت کیوں اتنی مشتعل ہو جاتی ہے کہ وہ "آئین ہند" کو جلانے پر آمادہ ہو جاتی ہے؟"

غرض تفریق و تقسیم کا جو زہر، انگریزوں نے، ہندوستان میں اپنا اقتدار مستحکم رکھنے کے لئے ہندوستانیوں کو پلایا تھا اور اردو، ہندی کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم میں ٹکراؤ پیدا کر کے ہندوستان کی قومی یکجہتی اور سالمیت کا خاتمہ کر دیا تھا، اس کا مداوا تو کیا،

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کیا جاتا کہ اسے اور بھی شہہ دی جاتی رہی، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی ہندوالے چوکنّا ہو کر اپنے کو شمالی ہند سے ہر طرح الگ کر لینے پر تُل گئے۔ کاش ہمارے اصحابِ عقل و دانش اِس عظیم خطرہ کا انسداد کرتے اور ہر زبان سے علیٰ قدر مراتب، ہمدردی رکھتے ہوئے صرف ہندی زبان کو سرکاری زبان بنوانے کی کوشش نہ کرتے اور اس طور سے "قومی یکجہتی" کو کھوتے چلے جانے کے عوض، دوبارہ واپس لوٹا لاتے۔ اور کاش ہمارے اربابِ فکر و بصیرت انگریزوں سے سبق لیتے جو ساری علاقائی زبانوں کو قائم رکھتے ہوئے کس خوبصورتی سے انگریزی کو سرکاری زبان بنا گئے تھے کہ آج تک ان کے جانے کے بعد بھی لوگ اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

انسان، اللہ تعالےٰ کی، بہترین سانچے میں ڈھلی ہوئی مخلوق ہے اس لئے فطرتاً حسن و جمال کی شیدائی اور موزونیت و رعنائیت کی رسیا ہے۔ توازن و تناسب اور موسیقیّت و ترنّم اسی کی سرشت میں داخل ہے۔ لہٰذا اُس نے اپنی گفتگو اور اظہارِ خیال کے لئے دو اسلوب اختیار کئے۔ ایک وہ جس میں روزمرہ عام گفتگو ہوتی ہے اور جسے "نثر" کہتے ہیں۔ اور دوسرا وہ جس میں، بحالتِ خاص اظہارِ مدعا کیا جاتا ہے اور جو مترنّم و موزوں انداز بیان ہوتا ہے اور جسے "شعر" کہتے ہیں۔ منشی جگت موہن لال رواںؔ اناؤوی (وفات ۱۹۳۴ء / ۱۳۵۳ھ) نے "شاعری" کی مختصراً تعریف یہ کی ہے۔

شاعری کیا ہے؟ اک احساسِ قوانینِ وجود ✧ دل کے جذبات کا اظہار بہ تائیدِ قیود
برہمن ہے دلِ شاعر، بتِ فطرت معبود ✧ جلوہ پیرائے ازل کا ہے جہاں حُسنِ نمود

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینے پہ تصویر اتر آتی ہے

یعنی تاثرات و تخیلات، جب جذبات میں ہنگامہ و حشر پیدا کر کے اسکے حال میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پھنس جاتے ہیں اور شاعر انہیں انداز و الفاظ کی مطلاً زنجیر میں پابند و مقیّد کر کے باہر لے آتا ہے تو وہ عام طریقِ اداۓ خیال سے مختلف اسلوب ہوتا ہے۔ جس کو "شعر" کہتے ہیں۔

اس "شعر" کی دو بڑی قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک شخصی و ذاتی جسے "داخلی شاعری" کہا جاتا ہے۔ یعنی شاعر اپنے موضوعات کی تلاش، خود اپنی ذات کے اندر کرتا ہے اور جو کچھ وہاں پاتا ہے اسے پیش کرتا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام "غزل" ہے۔ شعر کی دوسری قسم غیر شخصی ہے جسے "خارجی شاعری" کہا جاتا ہے۔ یعنی شاعر اپنی ذات سے ہٹ کر اپنے اردگرد کی چیزوں اور کائنات پر نظر ڈالتا ہے اور جو کچھ وہاں دیکھتا ہے اس کو دلپذیر انداز و الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام "نظم" ہے۔

"نظم" یا شجرِ شاعری کا یہ دوسرا تنہ، اپنے اندر بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں اور ڈالیاں رکھتا ہے۔ مثلاً موضوعاتی نظم، قصیدہ، مرثیہ، مسدّس، مخمّس، مثلث، قطعہ، رباعی اور مثنوی وغیرہ۔ ان میں سے اگرچہ ہر شاخ تروتازہ اور ہر ڈالی ہری بھری ہے، لیکن سب سے زیادہ لچکدار ٹہنی اور سب سے زیادہ من موہن ڈالی "مثنوی" ہے۔ اس لئے کہ شجرِ شاعری کی ہر شاخ اپنے اپنے اندر جو انوکھی خوبی، جو منفرد حسن اور جو خاص جاذبیت رکھتی ہے وہ دوسری شاخ میں نہیں پائی جاتی۔ لیکن "مثنوی" وہ صنفِ سخن ہے جس میں ہر شاخ کی رعنائی، ہر ڈالی کی بارآوری اور ہر ٹہنی کی سرمستی اکٹھا اور مجتمع ہو گئی ہے۔ تصوّرات کی نزاکت اور جذبات کی لطافت جیسی مسدّس و مخمّس میں نظر آئے گی اور کہیں نہ ملے گی۔ تخیّل کی وجاہت اور الفاظ کی جلالت جیسی قصیدہ میں دکھائی دے گی اور کسی دوسری جگہ نہ ملے گی۔ بے بسی و بے کسی اور یاس و حرماں کا مرقع جیسا مرثیہ میں نظر آئے گا دوسری صنف میں نہ ملے گا۔ محبت کی سرشاری اور دریا کی کوزہ میں بندش، جس طرح قطعہ و رباعی میں دیکھی جا سکتی ہے، ویسی دوسری جگہ نہ ملے گی۔ البتہ یہ ساری خوبی، یہ سارا حسن، اور یہ ساری رعنائی، جس صنفِ سخن میں ایک جگہ نظر آئے گی وہ صنف "مثنوی" ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کہ دردو اثر، جوش و ولولہ اور رس ریزی و زمزمہ پردازی جو "غزل" کا طرۂ امتیاز ہے وہ بھی "مثنوی" میں موجود ہے۔

حقیقتاً "مثنوی" شاعری کی ایک جامع، بلیغ، وسیع اور کامل ہی نہیں بلکہ نہایت اعلےٰ اور منفرد صنف ہے۔ اس کا مضمون مسلسل اور بیان مربوط ہوتا ہے، لیکن ہر شعر الگ اور ہر بیت جدا ہوتی ہے، جس وجہ سے جہاں یہ ہوتا ہے کہ شاعرانہ قیود کچھ ڈھیلے ہو جاتے ہیں، وہاں جذبات نگاری اور واقعہ نویسی کے بھی بہت سے راستے کھل جاتے ہیں۔ شاعر کو ایک وسیع عرصہ اور جمیل میدان مل جاتا ہے جس میں وہ معجزاتِ شاعری اور سحر بیانی سخن دکھا سکتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام مشہور و معروف منظوم تصنیفیں اور شاہکار اسی صنف شاعری میں ہیں۔ ہومر کی الیڈ، ورجل کی اینڈ اور ملٹن کی فردوس گمشدہ کا شمار اسی صنفِ شاعری میں ہوتا ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ فارسی زبان کا بے پناہ تعمیری سرمایہ مانا جاتا ہے وہ بھی اسی صنف میں ہے۔ سنسکرت زبان میں مہابھارت کو شاعری کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے وہ بھی رزمیہ مثنوی ہی ہے۔ غرض ادبیات میں ہو یا حیاتیات میں "مثنوی" کو شاعری کی تمام اصناف میں پہلا درجہ اور اولین مرتبہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو زبان، بارکوں اور بازاروں سے نکل کر علماء کی مجلسوں اور شعراء کی محفلوں میں پہنچی اور اظہارِ جذبات و بیانِ خیالات کا ذریعہ بننے کو ہوئی تو سب سے پہلے "مثنوی" وجود میں آئی۔ یا یوں کہیے کہ جب اردو زبان کے شعراء نے اپنے کمال کے اظہار کی ابتدا کی تو "مثنوی" سے کی۔

"مثنوی" کو شعراء کے اپنانے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہوئی کہ درحقیقت اس کے لئے کوئی خاص بحر مخصوص نہیں۔ ویسے عام طور سے "مثنوی" کے لئے وہی آٹھ بحریں محدود سمجھی جاتی ہیں جن میں فارسی زبان کی مثنویاں موجود ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس بحر میں شاعر چاہے "مثنوی" کہہ سکتا ہے۔ فارسی زبان میں جن آٹھ بحور میں مثنویاں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) بحر رمل مسدس مقصور یا محذوف۔ جس کا وزن ہے۔ فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(۲) بحر رمل مسدّس مخبون یا محذوف۔ جس کا وزن ہے فاعلاتن، فعلاتن، فعلن۔

(۳) بحر خفیف مسدّس مخبون مقطوع یا محذوف۔ جس کا وزن ہے فاعلاتن، مفاعلن، فعلن۔

(۴) بحر سریع مسدّس مطوی موقوف۔ جس کا وزن ہے مفتعلن، مفتعلن، فاعلات۔

(۵) بحر ہزج مسدّس محذوف۔ جس کا وزن ہے۔ مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن۔

(۶) بحر ہزج مسدّس اخرب مقبوض محذوف۔ جس کا وزن ہے مفعول، مفاعِلن فعلن۔

(۷) بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف۔ جس کا وزن ہے فعولن، فعولن، فعولن، فعول۔

(۸) بحر متقارب مثمن مقبوض۔ جس کے بتیس (۳۲) اوزان ایسے ہیں جو بہ ادنیٰ تغیر اس بحر کے ساتھ مل کر آتے ہیں۔

ان فارسی کی آٹھ بحروں میں سے بعض بحریں اردو میں قطعاً مقبول نہیں ہوئیں اور ان بحروں میں کوئی اردو مثنوی نہیں پائی جاتی۔ مثلاً چوتھی اور پانچویں (۵)۔ اور بعض بحر بہت زیادہ مقبول ہوئی اور اس میں بہت سی مثنویاں پائی جاتی ہیں مثلاً تیسری (۳)۔

دراصل "مثنوی" کے لئے بحر کی تخصیص کا نہ کوئی خاص قاعدہ ہے اور نہ کوئی خاص پابندی۔ جب نظامی گنجوی نے پانچ (۵) بحروں میں اپنی پانچ مثنویاں لکھیں تو کہا گیا کہ بس ان ہی پانچ (۵) بحروں میں "مثنویاں" لکھی جانی چاہئیں۔ حالانکہ ایسا سمجھنے اور کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پھر جب سوا سو برس بعد امیر خسرو نے اپنی آٹھ مثنویاں، آٹھ مختلف بحروں میں لکھیں تو یہ سمجھ لیا گیا کہ بس اب یہی آٹھ بحریں "مثنوی" کے لئے متعیّن ہیں۔ حالانکہ اگر ان کے بعد کوئی دس بحروں میں اپنی مثنویاں لکھ جاتا تو وہی بحریں معیار قرار پا جاتیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر نظامی کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے پانچ بحروں میں مثنویاں لکھیں تو امیر خسرو کو کیوں یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ مثنوی کے لئے آٹھ (۸) بحریں اختیار کریں؟ اور اگر امیر خسرو کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی صواب دید

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے مطابق اپنی مثنویاں آٹھ بحروں میں لکھیں اور نظامی کے مقلد نہ بنیں تو دوسرے شعرا کو کیا پابندی ہے کہ وہ امیر خسرو کا تتبع کریں؟ یہ کوئی خدائی قانون تو ہے نہیں کہ جس کو توڑا نہ جاسکے اور اگر توڑا جائے تو اس کا وبال پڑے؟ علامہ آزاد نے "آب حیات" میں لکھا ہے کہ جب ذوق نے رواج کے خلاف بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں ایک مثنوی لکھی جس کا وزن "مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن" ہے تو لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ اس کے بعد آزاد نے خود ذوق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:-

> "مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی اس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ جائز نہیں میر نجات کی "گل کشتی" ہم نے دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم مرزا محمد صاحب رحمہ اللہ زندہ تھے اور میرے والد مرحوم انہیں کا علاج کرتے تھے۔ وسعت معلومات اور حصول تحقیقات کی نظر سے ہم نے ان سے جا کر پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ رواج اتفاقی ہے جو مثنوی آٹھ بحروں میں منحصر ہو گئی ہے ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے؟ جس بحر میں چاہو لکھو۔"

حقیقت یہ ہے کہ شاعری کے سیل رواں کے لئے بحر کی حد بندی بے معنی ہے۔ وہ جدھر چاہے بہے، وہی بحر مستم ہو جائے گی۔ اردو کے مشہور شاعر حفیظ جالندھری نے اردو میں "شاہنامۂ اسلام" لکھا ہے جو فردوسی کے جواب میں نہ سہی تتبع میں ضرور ہے، مگر حفیظ نے بحر میں فردوسی کا تتبع نہیں کیا۔ فردوسی کا شاہنامہ بحر متقارب مثمن مقصور میں ہے جس کا وزن "فعولن، فعولن، فعولن، فعول" ہے مگر حفیظ نے اپنا شاہنامہ بحر مثمن سالم میں لکھا ہے جس کا وزن ہے "مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن"۔ شوق قدوائی کی مثنوی "عالم خیال" بہت مقبول و مشہور مثنوی ہے مگر وہ "بحر رجز مثمن مطوی مخبون" میں ہے جس کا وزن ہے "مفتعلن، مفاعلن، مفتعلن، مفاعلن"۔ حالانکہ اس سے پہلے اس بحر میں کوئی مثنوی فارسی یا اردو میں کبھی نہیں لکھی گئی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے تو کمال یہ کیا کہ ایک ہی مثنوی کے اندر مختلف بحریں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

استعمال کیں، حالانکہ اردو میں ایسا کسی نے نہیں کیا تھا۔ لہذا "مثنوی" کے لئے کسی خاص بحر کی قید کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

"مثنوی" کی بعض بحروں کے لئے یہ بھی قید بیان کی گئی ہے کہ فلاں بحر فلاں قسم کے مضمون و بیان کے لئے مخصوص ہے۔ مثلاً "بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف میں صرف "رزمیہ مثنوی" ہی لکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ صاحب "دریائے لطافت" اور صاحب "تاریخ مثنویاتِ اردو" نے "سحرالبیان" پر اعتراض کیا ہے کہ یہ عشقیہ مثنوی، رزمیہ بحر میں غلط لکھی گئی ہے۔ یہ اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً "رزمیہ مثنویاں" اسی بحر میں لکھی گئی ہیں، مگر یہ کوئی قانونِ الٰہی نہیں کہ اب دوسری قسم کی مثنوی اس بحر میں لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ میر حسن سے بہت پہلے سعدیؒ اپنی "بوستان" اسی بحر میں لکھ چکے ہیں، حالانکہ وہ "رزمیہ مثنوی" نہیں ہے۔ اردو میں بھی قصائل علی بے قیاری نے اس قید کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی عشقیہ مثنوی اسی "رزمیہ بحر" میں لکھی ہے اور یہ بھی میر حسن سے پہلے ہوئے ہیں۔ اور میر حسن کے لئے فارسی اور اردو کی یہ سندیں کافی ہیں۔ فی الحقیقت مثنوی کے لئے کوئی بحر مخصوص نہیں۔ وہ ہر بحر میں رواں دواں ہو سکتی ہے۔

"مثنوی" کی ابتدا فارسی زبان سے ہوتی ہے۔ فارسی کی سب سے پہلی مثنوی "کلیلہ دمنہ" ہے جو حافظ ابوالحسن رودکی نے ۳۲۰ھ / ۹۳۲ء میں لکھی تھی۔ رودکی نے اس قصہ کو عربی زبان سے لے کر فارسی میں نظم کیا تھا اور چونکہ نظم کی یہ صنف، امیر نصر بن احمد سامانی کو پسند آئی تھی، اس لئے اس نے رودکی کو چالیس ہزار درہم انعام دیا تھا۔ چنانچہ عنصری نے بہ سبیل تذکرہ کہا ہے:

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش
عطا گرفت بہ نظم "کلیلہ و دمنہ"

رودکی کے بعد دو سو برس میں بہت سی فارسی مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر صنفِ مثنوی کو کچھ زیادہ فروغ حاصل نہ ہوا۔ البتہ جب ۵۸۲ھ / ۱۱۸۴ء میں نظامی نے اپنی پہلی مثنوی "مخزن الاسرار" لکھی تو وہ بہت مقبول ہوئی۔ جس وجہ سے انھوں نے یکے بعد دیگرے پانچ مثنویاں لکھ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ڈالیں اور سب پسند کی گئیں۔ مگر اس کے بعد پھر یہ صنف سرد پڑ گئی۔ جب امیر خسرو نے ۶۹۸ھ / ۱۲۹۹ء میں مثنوی "مطلع الانوار" لکھی تو اس نے غیر معمولی طور سے قبولِ عام حاصل کیا اور پھر بہت سی مثنویاں وجود میں آئیں۔ اور پھر جب اردو زبان کا عروج ہوا تو مثنوی نگاری کا رواج عام ہو گیا۔

اردو زبان میں مثنوی نگاری کی ابتدا کب سے ہوئی؟ بہ الفاظ دیگر اردو زبان کی سب سے پہلی مثنوی کون ہے؟ اس سوال کا شافی اور حتمی جواب ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ تحقیق و تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ نیز بہت سے محققین اردو زبان کی تاریخ کو آٹھویں صدی ہجری تک لے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اردو زبان کی سب سے پہلی مثنوی کون ہے؟

ایک عرصہ تک وجدی کی مثنوی "تحفۂ عاشقاں" کو اردو کی سب سے پہلی مثنوی اور ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء کی تصنیف سمجھا جاتا رہا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ مادّہ تاریخ کو غلط سمجھنے کی وجہ سے ایسا خیال قائم کیا گیا تھا۔ یعنی محض "تحفۂ عاشقاں" کے اعداد دے کر اسے ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء کی تصنیف سمجھا گیا تھا، حالانکہ تاریخ تصنیف پورے مصرع سے نکلتی ہے:

پھبا تو اسے تحفۂ عاشقاں

اس لحاظ سے یہ تصنیف ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء کے بجائے درحقیقت ۱۱۵۳ھ / ۱۷۴۰ء کی تصنیف قرار پائی ہے۔

کچھ لوگوں نے فرمانروائے گولکنڈہ کی ایک "نعتیہ مثنوی" کو سب سے پہلی مثنوی قرار دیا تھا جو ۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء کی تصنیف ہے۔ مگر بعد میں وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" بھی اسی سال کی تصنیف ملی اور ان مثنویوں سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ نقشِ ثالث یا کم از کم ثانی ضرور ہے اور اس سے پہلے بھی کوئی مثنوی لکھی جا چکی ہے۔

ایک زمانہ میں خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" کو اردو کی سب سے پہلی مثنوی سمجھا گیا تھا جو ۹۸۶ھ / ۱۵۷۸ء کی تصنیف ہے مگر بعد میں یہ خیال بھی باطل قرار پایا جب ابو مظفر صالح کی مثنوی "تازہ دنیانہ" دریافت ہوئی جو ۹۳۰ھ / ۱۵۲۳ء کی تصنیف ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بعد میں اردو زبان کی سب سے پہلی مثنوی قطبن کی تصنیف "مرگاوتی" قرار پائی جو سلطان علاء الدین حسن شاہ کے زمانہ (سنہ ٨٩٩ھ / ١٤٩٣ء تا ٩٢٥ھ / ١٥١٨ء) میں در سنہ ٩٠٩ھ / ١٥٠٣ء لکھی گئی تھی۔ مگر یہ تحقیق بھی حرفِ آخر ثابت نہ ہو سکی۔ کیونکہ اشرف کی مثنوی "نوسرہار" دریافت ہو گئی جس کا بھی سنہ تصنیف سنہ ٩٠٩ھ / ١٥٠٣ء ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یقیناً اس سے بھی پہلے اردو مثنوی وجود میں آچکی تھی۔

ہاشمی صاحب نے "دکن میں اردو" میں سب سے زیادہ قدیم اردو مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ ان کی دریافت کے مطابق، اردو کی قدیم ترین مثنوی نظامی تخلص رکھنے والے اردو شاعر کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ جو سلطان علاء الدین بہمنی کے جانشین شاہ احمد کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ یہ شاہ احمد / احمد شاہ ثالث بہمنی کے نام سے سنہ ٨٦٥ھ / ١٤٦٠ء سے ٨٦٧ھ / ١٤٦٢ء تک حکمراں رہے تھے۔ لہذا یہ مثنوی جب ان کے عہد میں لکھی گئی ہے تو وہ ان ہی تینوں سنین کے اندر لکھی گئی ہے اور اس اعتبار سے فی الحال سب سے قدیم اردو مثنوی یہی متصور ہوتی ہے۔

ہندو شعراء نے اردو زبان میں کب سے مثنویاں لکھنی شروع کیں؟ یا بہ الفاظ دیگر اردو زبان کا سب سے پہلا ہندو مثنوی نگار کون ہے؟ یہ بھی ایک ایسا سوال ہے جس کا حتمی جواب دیا جانا فی الحال مشکل ہے۔

فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے مثنوی "گلشن عشق" کے ایک قلمی نسخہ کی سند پر، جو کانچی ورم میں لکھا گیا تھا، یہ خیال قائم کیا تھا کہ یہ مثنوی علی عادل شاہ ثانی کے عہد (سنہ ١٠٦٧ھ / ١٦٥٦ء تا ١٠٨٣ھ / ١٦٧٢ء) کے ایک برہمن شاعر نصرتی نے ١٠٦٨ھ / ١٦٥٧ء میں لکھی تھی۔ مگر بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے ایک تحقیقی مضمون لکھ کر ثابت کیا کہ نصرتی مسلمان شاعر تھا لہذا دتاسی کا خیال باطل قرار پا گیا۔

صاحبِ "قاموس المشاہیر" نے ایک دکنی شاعر منشی ہیرالال خوشدل کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے قطب شاہی خاندان کی ایک منظوم تاریخ بہ شکل مثنوی لکھی تھی جن کا زمانہ دسویں صدی ہجری کے وسط سے گیارہویں صدی ہجری کے اول تک میں گذرا ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مگر انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ مثنوی کس زبان میں لکھی گئی تھی ؟ نہ یہ بتایا کہ خوشدل کا دور کون سا ہے ؟ لہذا اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ اُس عہد کی منظوم و منثور تاریخ، بعد کے عہد کا شاعر بھی کسی سبب سے لکھ سکتا ہے ۔

میری اپنی تحقیق و تلاش کے مطابق ہندوؤں کی مثنوی نگاری کی ابتدا جنوبی ہند سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے ہندو مثنوی نگاری رام راؤ سیوا قرار پاتے ہیں۔ "دکن میں اردو" میں اردو زبان کی ابتدا و ارتقاء سے بحث کرتے ہوئے بیجاپور میں عادل شاہی خاندان کے آخری تاجدار سکندر شاہ کے عہد (۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء تا ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء) کے ایک ہندو شاعر کا ذکر کیا گیا ہے جن کا نام رام راؤ اور تخلص سیوا تھا۔ کہا گیا ہے کہ :

"واقعاتِ کربلا میں انھوں نے ایک مثنوی لکھی تھی جو اب نایاب ہے"

صاحب "اردو قدیم" نے فرمایا ہے کہ :۔

"ان کا وطن گلبرگہ تھا' لیکن بیجاپور میں رہا کرتے تھے۔ وہ علی عادل شاہ ثانی کے معاصر ہیں ۔ انھوں نے ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۳ء میں "روضۃ الشہدا" کو نظم میں ترجمہ کیا ہے "

"روضۃ الشہدا" کا سنہ تصنیف ۱۰۸۹ھ / ۱۶۷۸ء بتایا جاتا ہے ۔ گویا سیوا نے اس کے دو ہی تین برس بعد اس کتاب کا مثنوی کی شکل میں منظوم ترجمہ کر ڈالا تھا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنوبی ہند کے سب سے پہلے ہندو مثنوی نگار رام راؤ سیوا ہیں ۔

شمالی ہند میں، ہندو شعرا نے کب سے مثنوی نگاری کی ابتدا کی ؟ یا بہ الفاظ دیگر شمالی ہند کا سب سے پہلا ہندو مثنوی نگار کون ہے ؟ اس کے بارے میں صاحب "مجموعۂ نغز" کا بیان ہے کہ خواجہ میر درد (وفات ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء) کے شاگرد رشید منشی جھمن لال نے "بہار دانش" کا ترجمہ مثنوی کی شکل میں کیا تھا۔ "مجموعۂ نغز" کا سالِ اختتام ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مثنوی ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء سے پہلے لکھی گئی ہے ۔ اگرچہ قاسم نے یہ نہیں بتایا ہے کہ جھمن لال کی یہ مثنوی اردو میں ہے یا دوسری زبان میں، مگر چونکہ تذکرہ "اردو گویوں" کا ہے، اس لئے قرینہ غالب یہی ہے کہ یہ مثنوی اردو میں ہے ۔ نیز

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جھمن لال کی فارسی دانی یا فارسی گوئی کا ذکر کہیں دیکھنے میں نہیں آیا لہٰذا یہ اردو ہی کے شاعر ہو سکتے ہیں ۔ اس طور پر شمالی ہند کے سب سے پہلے ہندو مثنوی نگار جھمن لال جھمن قرار پاتے ہیں ۔

ابلیس نے، تخلیقِ انسانی کے بعد، آدمؑ کو فریب دیا اور ورغلایا تھا کہ اگر "زندہ جاوید" بن جانا چاہتے ہو تو بیوی سے ملو تاکہ "اولاد" پیدا ہو اور تمہارا نام آگے چلے ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک شیطانی تصوّر ہے کہ انسان اپنے نام کی بقا کے لئے "اولاد" کا خواہاں ہوتا ہے، حالانکہ انسان کا نام "اولاد" سے زندہ اور باقی نہیں رہتا ۔ کوئی بھی شخص شاید ہی اپنے پردادا کے باپ کا نام بتا سکے یا کسی شخص کو لوگ اس کے پردادا کے نام کے تعلق سے جان سکیں، چہ جائکہ اس سے بھی آگے کا خاندانی سلسلہ ۔ درحقیقت انسان کا نام اس کے "ذاتی کارنامہ" سے زندہ و پائندہ رہتا ہے، باپ دادوں کے بل بوتے پر نہیں ۔ ہزاروں برس پہلے کے لوگوں کا نام، ان کے باپ دادوں کے سبب سے نہیں بلکہ صرف ان کے "ذاتی کارناموں" کی بدولت آج بھی ویسا ہی زندہ و پائندہ ہے جیسا ان کے عہد میں تھا ۔ اور ہمیشہ باقی رہے گا ۔ شیام موہن لال جگر بریلوی نے اسی حقیقت کا یوں اظہار کیا ہے ؎

یہ کان میں کہہ گیا ہے ساقی
فانی ہے بشر، سخن ہے باقی

ذوقؔ دہلوی کا ایک شعر مشہور انام ہے اور صرف اس ایک شعر کے سبب سے آج بھی ان کا نام لوگوں کی زبانوں پر ہے ۔ انھوں نے فرمایا ہے ؎

رہتا "سخن" سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
"اولاد" سے تو ہے یہی دو پشت، چار پشت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اب جبکہ انسان کے افکار و اعمال ہی اسے "زندہ جاوید" بناتے ہیں، تو جن باکمالوں نے خدمتِ اردو میں اپنا خونِ جگر پانی کیا تھا، کیا ان کے نام اور کام کو زندہ رکھنا ضروری اور مقدس فریضہ نہیں؟ اردو کے نہ جانے کتنے خادم دسخنور اور استاد کامل، زمانہ کی ناتوجہی اور غفلت کا شکار بن کر فنا ہو گئے اور آج ان کا نام اور کام لوگوں کے سامنے نہیں۔ اس خصوصیت میں نہ "ہندو" کی قید ہے اور نہ "مسلمان" کی شرط۔ دونوں فرقوں کے اصحابِ کمال اور ارباب کلام اس فرو گذاشت سے متاثر ہوئے ہیں۔ مگر بعض اصحاب کو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ اردو کے ہندو ارباب ادب کے ساتھ مسلمانوں نے دانستہ تعصّب برتا اور ان کے کارناموں کو زندہ رکھنے کی طرف سے جانی بوجھی غفلت کی ہے۔ محترم ڈاکٹر تارا چند نے اپنے ایک مضمون میں شکایت کی ہے کہ:۔

"شاہجہاں کے زمانہ کے ولی رام ولی سے لے کر بیشمار ہندو اہل قلم نے اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ اردو کو بنایا مگر تذکرہ نویسوں کی کوتاہ بینی کی بدولت ان کی خدمات کا پورا پورا اعتراف نہ ہو سکا۔"

اس تحریر میں مسلمان کا نام لے کر اعتراض نہیں کیا گیا ہے، مگر چونکہ تذکرہ نگاروں کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے، اس لئے دراصل اس اعتراض کی زد اور اس الزام کی ضرب مسلمانوں پر پڑتی ہے اور وہ مجرم قرار پاتے ہیں۔ مگر بعض صاحب نے تو صاف صاف مسلمانوں کا نام لے کر یہی اعتراض کیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں جے پور میں "کل ہند اردو کانفرنس" منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے صدر اردو زبان کے مشہور شاعر پنڈت آنند نرائن ملا تھے انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کسی صاحب کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں شکایت کی گئی ہے کہ:۔

"اردو کے حامیوں کے دل صاف نہیں ہیں۔ یہاں اردو کے حامیوں سے میرا مطلب صرف مسلمانوں سے ہے۔ ہندو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ آج بھی انصاف نہیں کیا جاتا۔"

یہ صاحب کون ہیں اور ان کا پایۂ علمی کیا ہے، معلوم نہیں۔ ملا صاحب نے بتایا ہی نہیں۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مگر ڈاکٹر تاراچند نہایت فاضل ادیب اور اعلےٰ درجہ کے وسیع المطالعہ انسان ہیں۔ وہ یقیناً باخبر ہوں گے کہ اردو زبان میں "تذکرے" کچھ کم نہیں لکھے گئے ہیں۔ اور سارے تذکروں میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں اور فرقوں کے شعرا کا ذکر ہوا ہے۔

اردو شعرا کے تذکرہ کی ابتدا اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے ہوتی ہے اور اردو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ جو موجود ہے وہ میرؔ کا تذکرہ "نکات الشعرا" ہے جو ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس تذکرہ میں صرف ننو شاعروں کا ذکر ہے مگر اس میں بھی گیارہ ہندو شعرا کا نام اور ذکر موجود ہے۔ اگر ہندو شعرا کے ذکر سے قصداً مسلمان گریز کرنے والے ہوتے تو کم سے کم اس پہلے تذکرہ سے ہی اس کی ابتدا ہو جاتی۔ میرؔ نہایت ٹیڑھے دماغ کے شاعر تھے اور کم ہی لوگوں کو خاطر میں لاتے تھے۔ مگر جب وہ گیارہ ہندو شعرا کا ذکر کرتے ہیں تو حیرتناک ہے۔ یہ ایک دہلوی تذکرہ نگار کا ذکر ہوا۔ لکھنوی تذکرہ نگاروں میں سب سے پہلا تذکرہ میر حسن کا ہے جو ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء کی تصنیف ہے۔ اس تذکرہ میں بھی سترہ ہندو شعرا کا نام اور ذکر موجود ہے اور انھوں نے ان ہندو شعرا کے ذکر میں ذرا بھی بخل و اغماض سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ان کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی مہارت کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً رائے سرب سنگھ دیوانہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ :۔

"شاعر زبردست فارسی ست ۔ شعر بسیار گفتہ است ۔ استاد ریختہ گویانِ لکھنؤ ۔ چنانچہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیراں و اکثر دیگراں شاگرد اوانند ۔ درآنجا معروف و مشہور است[۱]"

میر حسن کا دیوانہ کو سارے لکھنوی اردو شعرا کا استاد بتانا، قدردانی کی انتہا ہے۔

---

[۱] "فارسی زبان کے زبردست شاعر ہیں اور انھوں نے لاتعداد اشعار کہے ہیں۔ لکھنؤ میں اردو شعرا کے استاد ہیں۔ چنانچہ حسرت اور میر حیدر علی حیراں اور دوسرے شعرا ان کے شاگرد ہیں اور وہ نہایت مشہور و معروف ہیں"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اگر ہندوؤں کی جانب سے واقعی مسلمان تذکرہ نگاروں نے غفلت یا بے نیازی برتی ہوتی؛ تو ایسا نہیں ہے کہ سارے تذکرے صرف مسلمانوں ہی نے لکھے ہیں اور ان میں برائے نام چند ہندو شعرا کا ذکر کیا ہے اور اپنے تذکرہ کو صرف مسلمان شعرا کے ذکر سے بھر دیا ہے۔ بہت سے تذکرے ہندو حضرات کے قلم سے مرتب ہوئے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) تذکرۂ بہارِ سخن زریں	از شیام پرشاد سندر لال
(۲) تذکرۃ الکاملین	از بابو رام چندر پرساد
(۳) نسخۂ دل کشا	از جنم۔ جے۔ متھرا
(۴) عیار الشعرا	از خوب چند ذکا
(۵) تذکرۂ بے جگر	از خیراتی لال جگر
(۶) دیوان جہاں	از بینی نرائن جہاں
(۷) سفینۂ عشرت	از درگا داس عشرت
(۸) ہمیشہ بہار	از کشن چند اخلاص
(۹) سفینۂ خوش گو	از بندرابن خوشگو
(۱۰) انیس الاحبا	از موہن لال انیس
(۱۱) سفینۃ الشوق	از رائے رتن سکھ رائے
(۱۲) انیس العاشقین	از رتن سنگھ زخمی
(۱۳) سفینۂ ہندی	از بھگوان داس ہندی
(۱۴) خمخانۂ جاوید	از لالہ سری رام دہلوی

بعض ہندو اہل قلم، ایسے ہوئے ہیں، جنھوں نے ایک ہی نہیں، متعدد تذکرے لکھے ہیں۔ مثلاً:۔

(الف) لچھمی نرائن شفیق:۔

(۱) شام غریباں

(۲) گل رعنا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(۳) چمنستانِ شعرا

(ب) درگا پرشاد نادر :-

(۱) خزینۃ العلوم

(۲) گلشنِ ناز

(۳) چمن انداز (تذکرۂ شاعرات)

پھر کیا سبب ہے کہ ان ہندو تذکرہ نگاروں نے اس حقیقت کا اندازہ اور تذکرہ نہیں کیا کہ مسلمان تذکرہ نگاروں نے ہندوؤں کے ساتھ بے انصافی کی ہے؟ اور انھوں نے ہندو شعرا کے ذکر سے دانستہ اغماض برتا ہے؟ لالہ سری رام نے اپنے تذکرہ کے مقدمہ میں اپنے مطالعہ سے گذرے ہوئے ۳۵ تذکروں کا نام لیا ہے اور ان تذکرہ نگاروں کے بارے میں، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں ہیں، شکایت کی ہے کہ انھوں نے زیادہ تر عامیانہ درجے اور بھرتی کے شاعروں کے ذکر سے اپنی کتابوں کو گرانبار کر دیا ہے، مگر کسی کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اس نے ہندو شعرا کے ساتھ تعصب برتا ہے یا ہندو شعرا کے ذکر سے دانستہ اعراض کیا ہے۔ درگا پرساد نادر دہلوی نے "خزینۃ العلوم" کے مقدمہ میں بلا تفریق ہندو اور مسلمان، شمالی ہند کے تذکرہ نگاروں کی یہ تو شکایت کی ہے اور اس امر کا تو گلہ کیا ہے کہ انھوں نے جنوبی ہند کے شعرا کو نظر انداز کیا ہے مگر یہ کہیں نہیں تحریر فرمایا ہے کہ مسلمان تذکرہ نگاروں نے ہندو شعرا کو نظر انداز کیا ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہوا ہوتا کہ مسلمان تذکرہ نگار، ہندو شعرا کو نظر انداز کیے ہوتے، تو خود نادر یا دوسرے ہندو تذکرہ نگار، بلا تردد اپنے تذکروں کو صرف "ہندو شعرا" اور اُدبا ہی کی خدمات کے ذکر سے بھر دیے ہوتے مگر واقعہ یوں ہے کہ ہندوؤں کے لکھے ہوئے تذکروں میں بھی "مسلمان شعرا" کا ہی زیادہ ذکر ہے۔ "نسخۂ دلکشا" اردو شعرا کا ایک تذکرہ ہے جو ایک ہندو کا لکھا ہوا ہے اور بنگالی ہندو کا لکھا ہوا ۱۸۷۰ء ۱۲۸۰ھ کا شائع شدہ ہے، جب مسلمانوں کا دورِ اقبال مطلقاً ختم ہو چکا تھا اور ہندوؤں کی ایک ناواقف اور ناعاقبت اندیش جماعت کی جانب سے اردو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

زبان کی مخالفت بھی زوروں پر تھی۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس تذکرہ میں کل پانسو اڑسٹھ ۵۶۸ شعرا کا ذکر ہے جن میں صرف چھیالیس ۴۶ ہندو شعرا ہیں۔ خود نادر دہلوی کے تذکرہ "خزینۃ العلوم" میں دو سو انسٹھ ۲۵۹ شاعروں کا ذکر ہے جن میں ہندو شاعر صرف دس ہیں۔ نادر کے علاوہ اُن دوسرے تذکروں میں بھی، جو ہندوؤں کے لکھے ہوئے ہیں، ہندو شعرا کا ذکر بہت ہی کم ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہندو شعرا کی تعداد ہی کم تھی، نہ یہ کہ تذکرہ نگاروں نے ہندو شعرا کی خدمات کو قصداً فراموش کیا؟ میں یہاں بطور ثبوت ہندوؤں کے لکھے ہوئے چند تذکروں سے اعداد و شمار پیش کر دیتا ہوں۔

سنہ تذکرہ	نام تذکرہ	کل مذکور شعرا	مسلمان شعرا	ہندو شعرا
۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۲ء	چمنستان شعرا	۲۱۴	۲۰۲	۱۲
۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء	عیار الشعرا	۸۵۱	۷۷۳	۷۸
۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء	دیوان جہاں	۱۲۳	۱۱۸	۵
۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء	نسخہ دلکشا	۵۶۱	۵۱۵	۴۶
۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء	خزینۃ العلوم	۲۵۹	۲۴۹	۱۰
۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء	چمن انداز	۱۴۱	۱۳۹	۲
		۲۱۴۹	۱۹۹۶	۱۵۳

ساڑھے اکیس سو شاعروں کے تذکروں میں صرف ڈیڑھ سو ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تذکروں میں ہندو شعرا کا ذکر کم ہونے کا سبب یہ نہیں کہ مسلمان تذکرہ نگاروں نے ہندو شعرا کے ساتھ بے انصافی برتی یا ہندو شعرا کے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

خلاف تعصب رکھ کر ان کے ذکر سے قصداً اغماض کیا۔ سارے تذکرے صرف مسلمانوں ہی کے لکھے ہوئے تو ہیں نہیں کہ ان پر یہ جرم عائد کیا جا سکتا ہے، خود ہندوؤں کے لکھے ہوئے تذکروں میں بھی ہندو شعرا کا نام کم بلکہ بہت کم ہے۔ اور اگر واقعتاً مسلمان تذکرہ نگاروں نے جان بوجھ کر بے انصافی برتی ہوتی، تو ہندو تذکرہ نگار، مسلمانوں سے گریز کر کے اپنے اپنے تذکرے کو ہندو شعرا کے ذکر و فکر سے بھر بھر دیتے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا اور کسی نے نہیں کیا۔

محترم ڈاکٹر تارا چند مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ جہاں تک تذکرہ نگاری کا تعلق ہے، اردو زبان میں مسلمانوں کا لکھا ہوا ایک بھی تذکرہ ایسا نہیں ہے جس میں کسی ہندو شاعر کا ذکر موجود نہ ہو۔ برخلاف اس کے، متعدد تذکرے ایسے موجود ہیں جن میں ایک بھی مسلمان شاعر کا نام نہیں ملتا۔ اور اس کے مصنف ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) ید بیضا	از غلام ہمدانی مصحفی
(۲) تذکرہ شعرائے ہنود	از دیبی پرساد بشاش
(۳) اردو اور ہندو	از شیام موہن لال جگر
(۴) ہندو شعرا	از خواجہ عبدالرؤف عشرت
(۵) اردو سے ہندوؤں کا تعلق	از اجمل اجملی
(۶) بہارِ سخن	از شیام سندر لال برق
(۷) اردو کے ہندو ادیب	از ناظر کاکوری
(۸) تذکرۂ ہندو شعرائے بہار	از فصیح الدین بلخی
(۹) بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات	از شانتی رنجن بھٹاچاریہ
(۱۰) دکنی ہندو اور اردو	از نصیر الدین ہاشمی
(۱۱) دورِ میریہ کے چند منتخب ہندو شعرا	از عبدالشکور بریلوی
(۱۲) یادِ رفتگان	از شیام موہن لال جگر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(۱۳) ہندوؤں میں اردو — از رفیق مارہروی

(۱۴) اردو کے ہندو شعرا — از عبدالسلام خورشید

(۱۵) بہارِ گلشنِ کشمیر — از برج کشور بے خبر

(۱۶) بہارِ جاوداں — از شیام موہن لال، جگر

(۱۷) انیسویں صدی کے چند شعرا — از عبدالستار حامد

(۱۸) کلاسکل ہندو شعرا — از بیرندر پرساد سکسینہ دہلوی

ان ڈیڑھ درجن تذکروں میں، ایک بھی مسلمان شاعر کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان تذکرہ نگار تعصب و کوتاہ بینی کے مجرم نہیں۔ اور ہرگز مسلمانوں نے ہندو شعرا اور ادبا کے ساتھ کبھی کوئی بے انصافی نہیں کی اور نہ دانستہ ان کے ذکر سے اغماض برتا ہے۔

دراصل تذکروں میں ہندو شعرا کا ذکر اس لئے کم ہے کہ وہ دور "غزل" کا تھا اور لوگ شاہد و شراب میں عملاً نہ سہی قولاً اور لفظاً ایسے غرق تھے کہ انہیں دوسری طرف توجہ کرنے کا مشکل ہی سے کبھی کبھی ہوش آتا تھا۔ اور اس ہنگامہ میں مسلمان پیش پیش تھے۔ کیونکہ یہ قوم علمی دنیا سے تقریباً الگ ہوچکی تھی اور سوائے بات بنانے کے اس کو کرنے کے لئے کوئی کام نہ رہ گیا تھا۔ لہذا مسلمانوں کی بڑی تعداد، اٹھتے بیٹھتے صرف "غزلگوئی" کیا کرتی تھی۔ آپ کسی بھی تذکرے کو لے لیجیے اس میں مسلمان غزلگو شعرا کے ذکر کی بھرمار ملے گی۔ اس لئے کہ وہی اس میدان کے مرد تھے۔ بیچاروں کو بیٹھے بیٹھے شعر کہنے کے سوا کرنے کو کام ہی کیا تھا؟

بنی نوعِ انسان کی اصلاح و تربیت کا آخری صحیفۂ آسمانی قرآنِ عظیم ہے، جس کی حیثیت "دستورالعمل" کی ہے۔ زبانی یا محض کہنے کو، مسلمان اپنے کو اسی "دستورالعمل" کا پابند بتلاتے اور کارگاہِ حیات میں اسی کو اپنا ہادی و رہنما ظاہر کرتے ہیں، مگر عملاً، مطلقاً اس سے بے نیاز و بے پروا ہیں۔ صنفِ "غزل" کی جو بھی لسانی عظمت اور ادبی اہمیت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ظاہر اور تسلیم کی جائے اور "غزل گوئی" کو جس قدر اعلیٰ مرتبہ بخشا جائے، مگر یہ ایسی چیز نہ تھی جسے "قرآن مجید کے ماننے والوں" کو اپنانا تھا۔ قرآن حکیم فی نفسہٖ شاعری یا اس وزن و اسلوبِ بیان کو حرام یا ناجائز نہیں قرار دیتا کیونکہ شاعری تو محض ادائے خیال اور اظہارِ مفہوم کا ایک ذریعہ ہے، مگر شاعری میں "غزل" جس چیز کا نام ہے وہ ایسی چیز نہ تھی جسے مسلمان قبول کرتے۔ "غزل" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "سوت کاتنا" ہے۔ قرآن مجید نے اس لفظ کو جس محل پر، جس انداز سے استعمال کیا ہے، اس سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہے کہ "غزل گوئی" ایک فرسودہ اور مہمل ہی نہیں بلکہ باطل اور خلافِ قرآن کام ہے۔ قرآن شریف نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت کی ہے کہ :-

(۱) "اور تم اس عورت کے مشابہ ہرگز نہ ہو جانا جس نے اپنے کاتے ہوئے سوت (غزلہا) کو تکا بوٹی کرکے، نوچ ڈالا ہو۔"

(نحل - ۱۳ $\frac{۱۶}{۹۲}$)

(۲) "اور شاعروں کی پیروی تو بھٹکے ہوئے لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وقت، ہر وادی میں مارے مارے پھرا کرتے ہیں؟ اور یہ وہ ہیں جو زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جن کو وہ کرتے نہیں ہیں؟"

(۱۱ $\frac{۲۶}{۲۲۶-۲۲۴}$)

غور فرمایئے حقیقتاً "غزلگوئی" اس کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ پھر صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کی گئی کہ شاعری کی دنیا میں ایک غلط راہ مسلمانوں نے اختیار کی، بلکہ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑی بڑی زیادتیاں اور گستاخیاں بھی کیں۔ قرآن حکیم نے "شعائر اللہ" کے احترام کا حکم دیا ہے :-

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرنا۔"

(مائدہ - ۱ $\frac{۵}{۲}$)

"شعائر اللہ" کے معنی ہیں "GODLY EMBLEMS" یا "SYMBOL OF GOD" یا "RELIGOUS RITES" یا "DIVINE COMMANDMENTS" یا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مگر "غزل" میں مسلمانوں نے دل کھول کے اور بڑی بے باکی اور بدزبانی کے ساتھ تمام
"شعائر اللہ" نماز، روزہ، حج، وضو، مصلّیٰ، تسبیح اور داڑھی وغیرہ وغیرہ یعنی جس قدر
بھی دینی اوامر اور شعائر اللہ ہیں، ان کا استخفاف کیا، مضحکہ اڑایا۔ اور اس کے بدلے
شاہد و شراب کی پذیرائی و پسندیدگی کو، جن سے اجتناب و گریز کی حد درجہ تاکید کی گئی تھی،
انھوں نے، اپنا نصب العین بنا لیا۔ میرا خیال ہے کہ مسلم قوم کو دو ہی چیزوں نے "تخت"
سے "تختہ" پر پہنچا دیا۔ ایک ذہنی انتشار نے جس کا لازمی نتیجہ "بے عملی" ہے اور دوسری
"اقدارِ دینی کے ساتھ مسخرگی و مضحکہ انگیزی" نے۔ جس کا واحد صلہ "قہرِ خداوندی" ہے۔
"غزلگوئی" صرف ان ہی دونوں تباہکاریوں کے بلاوے کا نام ہے۔ جس کو بدقسمتی سے
تقریباً سارے مسلمانوں نے کم و بیش اپنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ بھی بھگت لیا۔ برخلاف
مسلمانوں کے، جب ہندوؤں نے اردو کو اپنایا تو لازماً شاعری میں بھی حصہ لیا مگر نہ تو ان کی
بڑی تعداد شاعری کی لعنت میں پھنسی، کیونکہ وہ برسرِ کار اور مصروفِ عمل تھے۔ ان کو
فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ "یاوہ گوئی" میں وقت صرف کرتے۔ اور نہ ان کی بڑی تعداد نے
"غزلگوئی" کو اپنا نصب العین بنایا۔ پھر ہندو شعراء نے اپنی غزلگوئی میں شعائر اللہ کا
احترام بھی کیا۔ اور اگر اس میں کچھ حصہ لیا بھی تو مضحکہ اڑانے میں بڑی احتیاط برتی اور
مسلمانوں کی سی بیباکی ہرگز نہ دکھائی۔ آپ ہندو شعرا کی "غزلوں" کا جائزہ لیں گے تو
صاف دیکھیں گے کہ انھوں نے نماز، روزہ، تسبیح و داڑھی وغیرہ "اسلامی شعائر" کی تنقیص
و تذلیل میں حتی الامکان بڑی احتیاط برتی ہے۔ یہ دراصل ان کا جذبۂ احترام تھا اور
وہ اس بدتمیزی کو دل سے پسند نہ کرتے تھے، کبھی کبھار عام رَو میں بہہ کے کچھ کہہ بھی گئے
تو مسلمانوں کی سی شوخی و بدتمیزی نہیں دکھائی۔ بہر کیف! یہ وجوہ تھیں کہ ہندو شعرا کی
بڑی تعداد "غزلگوئی" کو مسلمانوں کے لئے چھوڑ کر، دوسری اصنافِ سخن کی طرف مائل ہوتی
اور رہی، جن میں "مثنوی" کا نمبر سب سے اول اور بہت زیادہ تھا۔ اب ظاہر ہے کہ
"غزل" کی فضا میں "مثنوی" کی قدر افزائی عام طور سے مشکل تھی۔ ہنگامی کارنامے ہمیشہ
نثری خدمات پر غالب اور سب سے زیادہ متعارف رہا کئے ہیں۔ اس لئے سبب مذکورہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لکھے جانے لگے تو لامحالہ "غزل گوئی" کو سرفرازی نصیب ہوئی، جن میں "مسلمانوں" کی بھرمار تھی اور دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ "ہندو شعرا" کی خدمات بھی قرار واقعی محفوظ نہ ہوسکیں۔ جہاں تک کہ "مثنوی" کا تعلق ہے، مسلمان شعرا کی بھی خدمات کافی ہیں، مگر "غزل" کے مقابلہ میں وہ خدمات سرسبز نہ ہوسکیں اور وہ بھی بے اعتنائی کا شکار ہوئیں۔ لہٰذا شکوہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ "مسلمان تذکرہ نویسوں" کی کوتاہ بینی کی بدولت "ہندو شعرا" کی خدمات کا پورا پورا اعتراف نہ کیا جاسکا، بلکہ شکایت کی نوعیت یہ ہونی چاہیے کہ "غزل گویوں" کی یک رخی سرشاری کی وجہ سے تذکروں میں "مثنوی نگاروں" کی خدمات کا پورا پورا اعتراف نہ ہوسکا، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ تذکروں میں متعدد شعرا ایسے ملیں گے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، کہ انھوں نے دوسری اصنافِ سخن میں بھی قابلِ داد سرمایہ چھوڑا ہے۔ مگر ان کا ذکر تک نہیں کیا گیا، محض ان کی "غزل" کا بیان ہوا۔ "غزل" کی اپنی ظاہری خوبی جو بھی ہو، مگر وہ داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے بدیسی اور باہر کی چیز تھی۔ ایران کی پیداوار تھی۔ برخلاف اس کے "مثنوی" ہر اعتبار سے دیسی اور اپنی چیز تھی۔ "غزل" میں، چاہے وہ ہندو کی ہو یا مسلمان کی، بڑے سے بڑے شاعر کی ہو یا ادنیٰ سے ادنیٰ تک بندکی، بہر نوع خالص ایرانیت جلوہ ریز اور کارفرما تھی، برخلاف اس کے بقول ڈاکٹر نارنگ:۔

> "ہماری مثنویاں، چونکہ مشترک تہذیب اور ملی جلی معاشرت کے زیرِ اثر لکھی گئیں اس لیے ان میں اسلامی قصے کہانیوں کے علاوہ ہندوستانی لوک کتھاؤں اور عوامی روایتوں سے متاثر ہونے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے"

یہاں بلبلوں کی نغمہ سرائی نہیں بلکہ کوئلوں کی کوک گونجتی سنائی دے گی۔ اس میدان میں جیحوں وسیحوں بہتے نظر نہیں آئیں گے بلکہ گنگا جمنا اٹکھیلیاں کرتی دکھائی دیں گی۔ اس کی زمین پر شیراز و اصفہان آباد نہیں دکھائی دیں گے بلکہ کشمیر و بنارس لہلہاتے نظر آئیں گے۔ مگر اس کا کیا جواب کہ انہیں بالکل ہی فراموشی در نظر انداز کر دیا گیا؟

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ڈاکٹر تارا چند کو شکایت ہے کہ تذکرہ نویسوں کی کوتاہ بینی کی بدولت "ہندو شعرا" کی خدمات کا پورا پورا اعتراف نہیں کیا گیا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ شاعروں میں سے "غزلگویوں" کے سوا اور کس صنفِ سخن کے مسلم شعرا کی خدمات کا بھی اعتراف کیا گیا ہے؟ نثر میں بھی ایک سے ایک ہندو اور مسلمان اہل قلم ہیں مگر کیا ایک بھی تذکرہ "اردو کے ادیب" کے نام سے آج تک مرتّب و مدوّن ہو سکا ہے؟ ناظر کاکوروی نے ہنے کو تو ایک تذکرہ "اردو کے ہندو ادیب" کے نام سے ترتیب ضرور دیا، مگر اس میں اگر نہیں ہے تو "ادیبوں" کا ذکر، باقی سب کچھ ہے۔ انھوں نے زیادہ صفحات میں تو "غزلگویوں" ہی کو جگہ دے دی ہے۔ ہندوؤں کی طرف سے اغماض برتا جاتا اور مسلمانوں کی خدمتِ ادب کا اعتراف قرار واقعی کیا جاتا تو تشفی ہوتی کہ ادھورا ہی سہی مگر کچھ تو کام ہوا۔ مگر میں تو دیکھتا ہوں کہ مسلمان ادیبوں کی جانب سے بھی ویسی ہی بے پروائی برتی گئی جیسی ہندو ادیبوں کی جانب سے۔ اردو نثر میں ایسے ایسے صاحبِ طرز ادیب ہوئے ہیں کہ اردو زبان کو ان پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ مگر کیا آج تک اردو کے "نثاروں" کا ایک بھی تذکرہ لکھا گیا؟ دراصل ہمارے یہاں "تذکرہ" نام ہے "غزلگو شعرا کے ذکر والی کتاب" کا۔ اس وجہ سے نثر نگاروں کا اگر کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ صنفِ سخن کے لحاظ سے بھی شعرا کا کوئی تذکرہ آج تک نہیں لکھا گیا۔ لہٰذا "غزل" کے سوا دوسری اصنافِ سخن میں جن ہندو یا مسلمان شعرا کے کارنامے ہیں، ان کا ضمناً تو کچھ ذکر ہو جاتا ہے، مگر باضابطہ ان پر علٰحدہ کوئی تذکرہ نہیں لکھا جاتا، حالانکہ اس کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ اس طور پر نہ صرف ان کی حق تلفی ہو رہی ہے، بلکہ ادب کی تاریخ بھی تشنہ و نامکمل رہتی ہے۔

میرا قیاس ہے کہ ڈاکٹر تارا چند نے آزاد کی "آبِ حیات" میں صرف ایک ہندو شاعر کا ذکر دیکھ کر ایسا خیال فرمایا ہوگا کہ ان سے دانستہ اغماض برتا گیا ہے مگر اول تو "آبِ حیات" کو "تذکرہ" سمجھنا ہی غلط ہے۔ وہ نہ تو "تذکرہ" ہے اور نہ اس اعتبار سے اس کی کوئی اہمیت ہے۔ وہ تو ادب و انشا کی ایک کتاب ہے جس میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ذوق کو جو آزاد صاحب کے استاد تھے، آسمان پر چڑھایا گیا ہے اور بہ سبیل تذکرہ چند اور شاعروں کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، یا پھر وہ ادب و زباندانی کی ایک کتاب ہے جس وجہ سے اسے نصاب میں بھی داخل کر لیا گیا ہے، ورنہ "تذکرہ" تو نصاب تعلیم میں داخل ہونے کی چیز ہے نہیں۔ بفرض محال اگر اس کو "تذکرہ" مان بھی لیا جائے تو اس میں مسلمان شاعروں میں سے بھی کتنوں کا ذکر کیا گیا ہے؟ اور پھر اس ایک کتاب کے مقابلہ میں ان بہت سے تذکروں کو کیسے فراموش اور نظر انداز کیا جا سکے گا جن میں متعدد ہندو شعرا کی خدمات زبان و ادب کا بہت کھل کر ذکر و اعتراف کیا گیا ہے؟ اگر یہ کوئی بڑا اہم جرم قرار پائے گا تو ان "تذکرہ نگاروں" کے بارے میں کیا کہا جائے گا جنہوں نے صرف ہندو شعرا کے تذکرے لکھے ہیں اور ان میں ایک مسلمان کا بھی ذکر موجود نہیں ہے؟ نیز مسلمانوں نے تو خالص ہندوؤں کے متعدد تذکرے لکھے بھی ہیں مگر کیا اب تک کسی ہندو نے، محض مسلمانوں پر مشتمل کوئی ایک تذکرہ بھی لکھا ہے؟

زیرِ نظر کتاب "تذکرہ" ہے اردو زبان کے سوا۱۲۵ سو ہندو "مثنوی نگاروں" اور ان کی تقریباً دو۲ سو "مثنویوں" کا، موجودہ عہد میں، جبکہ تمام پرانی قدریں یکسر بدل گئی ہیں، کوئی "تذکرہ" لکھنا اور وہ بھی اس انداز سے لکھنا کہ وہ قدیم طرز پر حروف تہجی کے اعتبار سے ہو اور محض ایک صنف شاعری تک محدود ہو اور صرف ایک قوم کے شعرا کے ذکر پر مشتمل ہو، بظاہر نہایت غریب اور شاید انتہائی گیا گذرا طریقہ معلوم ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے کہ بعد و رجعت بد مذاقی اور دقیانوسیت پر بھی محمول کیا جائے، مگر میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے اور کسی اعتراض کی پرواہ کئے بغیر، ایسا کیا ہے، اس لئے کہ گذشتہ عہد سے ہمارا رشتہ قائم رہے اور اگلے بزرگوں کا طریق کار

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

موجودہ عہد میں غلط نہ قرار پائے۔ نیز ایسا کرنے میں دو مزید فائدے مدِّ نظر ہیں۔ ایک تو حروفِ تہجی کا لحاظ کرنے سے، شعرا کے تذکرہ میں، تقدیم و تاخیر کا نقص و اعتراض پیدا نہیں ہوگا۔ دوسرے ان کی تلاش و جستجو میں بھی قارئین کو آسانی ہوگی۔

"صنفِ سخن" کی تخصیص کے ساتھ "تذکرہ" مرتب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اب آئندہ سے ایسا ہی کیا جائے، تاکہ شعرا کی ایک نوع کی فکریں، ایک جگہ مجتمع اور مذکور ہو جائیں۔ "غزلگویوں" کے بہت سے تذکرے لکھے جا چکے۔ اب قصیدہ گویوں، مرثیہ نگاروں اور مسدّس نویسوں وغیرہ کا الگ الگ تذکرہ مرتب کیا جانا چاہئے۔ اسی طرح نثر کے ادیبوں کا تذکرہ لکھنا ضروری ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ سائنسدانوں، فلسفیوں اور دیگر علما و فن کے تذکرے بھی علیحدہ علیحدہ مرتب ہونے چاہئیں۔ یہ طریقہ مروّجہ مذاق و رجحان کے بھی خلاف نہیں۔ اس لئے کہ جب ایک خاص عنوان اور موضوع پر کوئی کتاب لکھی جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ صرف اُسی شعبے کے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور اُس کی نوعیت ایک قسم کے "تذکرہ" ہی کی ہو جاتی ہے، البتہ اس میں "عامل" کا نہیں بلکہ "عمل" کا ذکر ہوتا ہے مثلاً "مثنوی" ہی کو لیجئے جب "مثنویوں" پر بحث ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ جتنے "مثنوی نگار" ہیں، ان ہی کا تذکرہ کیا جاتا ہے، قصیدہ گویوں اور غزل گویوں کا نہیں۔ پھر اگر مثنوی نگاروں کا تذکرہ لکھا جائے تو لامحالہ مثنویاں ہی زیرِ بحث آئیں گی۔ بہرحال! اس کتاب کو قدیم رواج اور جدید مذاق کا سنگم سمجھئے کیونکہ اس کتاب کا حصۂ اول طرزِ قدیم میں ہے اور حصۂ ثانی مذاقِ جدید کے مطابق۔

اس کتاب میں میرے صنف "مثنوی" اور صرف "ہندو شعرا" کو لینے کی وجہ کئی ہوئی ہے۔ اولاً اردو شاعری کی ابتدا "مثنوی" ہی سے ہوئی ہے اور بالخصوص "ہندو شعرا" نے اظہارِ جذبات و خیالات یا روایات و معتقدات کے مظاہرہ و بیان کے لئے پہلے "مثنوی" ہی کو اپنایا تھا۔ ثانیاً اُن کی مثنویاں بالعموم ایرانیت کے بجائے مقامی ہندوستانیت کی حامل و آئینہ دار ہیں، لہٰذا وہ اوّلیت کی حق دار ہیں۔ ثالثاً "ہندو شعرا" کی مثنویاں بڑی حد تک انفرادیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں نہ صرف بالعموم

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہندوستانی روایات نظم کی ہیں، بلکہ اپنا "مذہبی سرمایہ" بھی اس صنف ادب میں منتقل کیا ہے۔ مثلاً مسلمان شعرا نے اپنی دینی و مذہبی کتابوں کو اپنی مثنوی نگاری کا عنوان کبھی بھی نہیں بنایا، مگر ہندوؤں نے "گیتا" اور "رامائن" وغیرہ تک کو بلا تکلف اس زبان میں منتقل کیا۔ یہ نہ صرف اُن شعرا کے، اردو زبان سے بہترین تعلقات اور اس زبان سے بے پناہ محبت کا اٹل ثبوت ہے، بلکہ صنف "مثنوی" سے بھی اُن کی مقدس وابستگی کی شہادت ہے۔ "رباعیات" "غزلگو" "ہندو شعرا" کا بطور خاص متعدد تذکرہ مرتب و مدوّن ہو چکا ہے۔ لیکن "مثنوی نگار ہندو شعرا" اور اُن کی خدماتِ ادب و زبان، ہنوز محتاج توجہ ہیں اور اس کی بڑی ضرورت تھی کہ اُن کا ذکر ایک جگہ کیا جاتا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اب دوسرے اصحابِ فکر اور اربابِ قلم بھی، شعرا اور ادبا کی خدمتِ اردو کو، اصنافِ سخن کی تخصیص کے ساتھ، علیحدہ علیحدہ پیش کرنے کی ابتدا کریں، تو بہتر ہو۔ آج اگر کسی خاص صنفِ ادب و شعر سے متعلق شعرا کی تلاش مقصود ہو تو بڑی دقّت ہوتی ہے اور سارا سمندر کھنگالنا پڑتا ہے اور اس کے باوجود بڑے سرمائے تک بالعموم رسائی نہیں ہو پاتی۔ اگر اس طرح یہ کام انجام پائے تو بڑی آسانی ہو جائے گی اور یہ نہایت مفید کام ہوگا۔

اِس کتاب کو صنف "مثنوی" پر حاوی نہیں، بلکہ صرف "مثنوی نگاروں" یا "مثنویوں کے ذکر" پر مشتمل قرار دیا جائے۔ "صنفِ مثنوی" پر اردو زبان میں متعدد کتابیں پہلے سے موجود ہیں۔ مثلاً جلال الدین احمد جعفری کی کتاب "تاریخ مثنویاتِ اردو" یا عبدالقادر سروری کی کتاب "اردو مثنوی کا ارتقا" یا امیر احمد علوی کی کتاب "مثنویات" یا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "اردو مثنویاں" یا ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب "اردو مثنویاں شمالی ہند میں"۔ ان میں آخر الذکر دونوں کتابیں گرانقدر ہیں اور جو لوگ "اردو" کو مسلمانوں کی بدیسی زبان قرار دیتے ہیں، ان کے لئے تازیانۂ سبق ہیں کہ "مثنوی" کے موضوع پر، اردو میں جیسی تحقیقی کتابیں ہندوؤں نے لکھی ہیں، ویسی کسی مسلمان مصنف کی نہیں ہے۔ بہر کیف! ممکن ہے کہ اس عنوان پر اور بھی کچھ اہل قلم لکھ رہے ہوں۔ کیونکہ "مثنوی"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے اہلِ علم و ادب کی دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں "مثنوی" سے متعلق فنّی مباحث یا اُس کا تاریخی ارتقاء وغیرہ تلاش کرنا، مناسب نہ ہوگا، کیونکہ یہ "فن" کے ذکر پر نہیں بلکہ "فنکاروں" کے اذکار کی حامل ہے۔

میں نے اِس کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصہ میں "مثنوی نگاروں" کا تذکرہ ہے اور اس کی ترتیب بلحاظ حروفِ تہجی رکھی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں مذہبی مثنویوں کا ذکر ہے۔ ہندوؤں کی بھی، مسلمانوں ہی کی طرح، لاتعداد مذہبی کتابیں ہیں۔ مگر ان میں سے صرف چار کتابیں اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلے وید مقدس۔ مگر یہ کتاب اتنی دقیق ہے کہ عموماً پنڈتوں کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ بہت ہی کم علماء ہنود کی اس کتاب پر پہنچ اور رسائی ہے۔ لہٰذا اسے کسی شاعر نے ہاتھ نہیں لگایا۔ "ویدوں" کے بعد سب سے اہم کتاب "گیتا" ہے۔ اس کے بعد "مہابھارت" اور اس کے بعد "رامائن"۔ لہٰذا ان تینوں کتابوں کو شعراء نے اپنایا ہے۔ اور ان ہی تینوں کتابوں کا اس حصہ میں ذکر ملے گا۔

اِس کتاب میں بعض ہندو شعرا کی معروف نظمیں مذکور نہیں ملیں گی، حالانکہ بہت سی جگہوں پر ان کا ذکر نظر آئے گا اور آتا ہے یا عام طور سے وہ مشہور ہیں مثلاً:-

(۱) منشی بساون لال شاداںؔ کی مثنوی "سیر ترنگ"

(۲) مہاراجہ کلیان سنگھ عاشقؔ کی مثنوی "عجیب التسیر"

(۳) منشی جے گوپال ثاقبؔ کی مثنوی "بحر ہمت"

(۴) راجہ پیارے لال الفتیؔ کی مثنوی "نیرنگ تصویر"

اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت یہ "مثنویاں" فارسی زبان میں ہیں مگر ان کا ذکر لوگوں نے اردو مثنویوں کے ساتھ کر دیا ہے۔ اسی طرح منشی گردھاری پرساد باقیؔ یا منشی سندر لال حزیںؔ اور منشی ستیل پرشاد احقرؔ کی "بھاگوت گیتا" کا ذکر بھی اس کتاب میں نہیں ملے گا۔ کیونکہ اول الذکر دونوں شاعروں کی مثنویاں بھی فارسی زبان میں ہیں اور آخر الذکر نے اگرچہ اردو میں لکھا ہے مگر وہ "قصیدہ" کی شکل میں ہے۔ "مثنوی" کی صورت میں نہیں، کہ اس کتاب میں اس کو شامل کیا جاتا۔ اسی طرح منشی امانت اللہ امانتؔ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

برج نرائن چکبست، پروفیسر پریم پال اشک اور منشی دوارکا پرشاد افق کی "راماین" کا ذکر بھی یہاں نہیں ملےگا۔ کیونکہ امانت کی راماین فارسی زبان میں ہے۔ چکبست اور اشک کی کتابیں اردو میں تو ضرور ہیں مگر وہ "مسدس" کی شکل میں ہیں، "مثنوی" کی صورت میں نہیں، کہ میں ان کا اس کتاب میں ذکر کرتا۔ افق کی راماین بھی "قصیدہ" کی صورت میں ہے، اس لئے اسے بھی چھوڑ دینا پڑا ہے۔

میں یہ احمقانہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر فی الجملہ مکمل اور تمام "ہندو مثنوی نگار شعرا" کے ذکر پر مشتمل ہے۔ مگر ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ میری طرف سے تلاش و جستجو اور سعی و کاوش میں کوئی کمی و کوتاہی نہیں کی گئی۔ میں نے خود عرصہ دراز کی تلاش اور کھوج سے جو کچھ سرمایہ بہم پہنچانا ممکن ہو سکا وہ پہنچایا۔ نیز بہت سے صاحبِ علم کرمفرماؤں سے بھی امداد لی۔ مثلاً ڈاکٹر گیان چند جین، مسٹر ورندر پرشاد سکسینہ اور حضرت نادم سیتاپوری وغیرہ نے اس سلسلہ میں مجھے کافی مدد دی جس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔

۶

اس کتاب کے سلسلہ میں مجھے ایک خاص اور اہم بات کہنی ہے۔ یورپ والوں نے اپنے یہاں کی کلیسائی حکومت کی شرمناک استبدادیت کو دیکھ کر سرے سے "مذہب" ہی کو لغو قرار دے دیا اور جب لوتھر کی بغاوتِ کلیسا کی تحریک کامیاب ہوگئی تو اہلِ مغرب نے اپنا ایک سیاسی نظام اس طرح ترتیب دیا کہ "مذہب" کو پرائیوٹ چیز قرار دے کر اسے "سیاست" سے بالکل الگ کر دیا۔ نہ صرف اتنے پر انھوں نے بس کیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کے انھوں نے "ادب" کو بھی "مذہب" سے قطعاً جدا کر دیا۔ انھوں نے باہمہ دانائی و فرزانگی، اس پر غور نہیں کیا اور مطلق توجہ نہ دی کہ سیاست ہو یا ادب، اس کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں پیوستہ ہے اور بلحاظ مادیت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پرستی، انسانیت کے لئے سب سے عظیم خطرہ ہے۔ چنانچہ اس غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد الحاد و دہریت نے جنم لیا اور ملحدانہ مادیت پرستی پھیلنے لگی اور آج حال یہ ہو گیا ہے کہ مغرب میں انسانیت دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مغرب کی دیکھا دیکھی، مشرق نے بھی ہاتھ پاؤں نکالے ہیں، صرف ترتیب بدل دی ہے۔ مغرب نے پہلے "سیاست" کو "مذہب" سے الگ کیا تھا اور اس کے بعد "ادب" کو۔ مشرق نے پہلے "ادب" کو "مذہب" سے الگ کر لیا ہے اور اب وہ "سیاست" کو "مذہب" سے الگ کرنے کی کوشش اور تبلیغ میں لگا ہوا ہے۔ "لادینی حکومت" "SECULAR STATE" وغیرہ کی اصطلاح کا رواج، اسی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے۔ اور اگرچہ ابھی مغرب کی طرح مشرق میں یہ کاوش پوری طرح کامیاب نہیں ہو پائی ہے مگر اس کے تباہ کن نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور مشرق میں بھی انسانیت بڑی طرح کراہ رہی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ہوں یا ہندو، سبھوں نے اس روش کو خوش آمدید کہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوستان کا پورا نوجوان طبقہ دہریت و الحاد کے چنگل میں گرفتار ہے۔

یہ صحیح ہے کہ فی زمانہ "کمیونزم" کو بڑا فروغ نظر آرہا ہے مگر اس کا ردّ عمل بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ کہ انسانیت مٹتی چلی جارہی ہے۔ کمیونسٹ ملکوں میں مادّی اعتبار سے لوگ فارغ البال شاید ہو گئے ہوں، مگر انہیں قلبی سکون اور جذباتی اطمینان ہرگز حاصل نہیں اور کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ کسی کمیونسٹ ملک میں چلے جائیے، وہاں کسی کے "دل" کو مسرور نہ پایئے گا، گو بظاہر چہرے متبسّم نظر آئیں گے۔ کیونکہ اقدارِ حیات کے لئے کوئی مثبت بنیاد قطعی ضروری ہے۔ اور وہاں ایسی کوئی بنیاد موجود ہی نہیں۔ اور یقین کیجیے کہ کیمونسٹ ممالک کے مزاج کی موجودہ منفی حالت، غیر معینہ عرصہ تک ہرگز قائم نہیں رہے گی۔ کسی سوسائٹی کا انتظام، دہریت کی بنیاد پر، دیر تک قائم رہ ہی نہیں سکتا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد، چاہے وہ تباہی سے پہلے ہو یا بعد، انہیں یقیناً اپنے نظام کے لئے، کسی مثبت بنیاد کی تلاش ہوگی اور وہ بنیاد "مذہب"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہی کی دنیا میں ملے گی۔

اگلے لوگ احمق نہیں تھے جنھوں نے اپنے "ادب" کو "مذہب" سے وابستہ کر رکھا تھا۔ فی زمانہ اگر انسانیت کی خدمت مطلوب ہے تو "ادب" کی مروجہ بے لاہر دی کو روکنا ضروری ہوگا۔ اور اس کی کوشش کرنی ہوگی کہ ہمارے "ادب" کا رخ پھر "مذہب" کی طرف موڑا جائے تاکہ انسانیت مردہ ہونے سے بچ جائے۔

اس کتاب میں، اس نصب العین کو بطور خاص سامنے رکھا گیا ہے۔ نیز اس امر کا بھی خاص لحاظ کیا گیا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں، ایک دوسرے کے مذہبی ادب و عقیدہ سے باخبری حاصل کریں تاکہ دونوں قوموں میں افہام و تفہیم کا جذبہ و شوق پیدا ہو اور ان میں ہوا خواہی و رواداری کا جوش اور ولولہ ابھرے اور حقیقتاً وہ "قومی یکجہتی" اور وہ "NATIONAL INTEGRATION" عملاً سامنے آئے جو سابق میں کارفرما تھا اور جس کا آج کل عملاً نہیں بلکہ محض قولاً مطالبہ کیا جارہا ہے۔ لہذا میں امید کرتا ہوں کہ میری یہ کتاب انشاء اللہ "ادب و مذہب" کا دلپذیر سنگم ہی نہیں بلکہ "قومی یکجہتی" اور "جذباتی ہم آہنگی" کے سلسلے میں بھی نہایت کارآمد ثابت ہوگی۔ بشرطیکہ قارئین میری تحریر اور قوم و ملک کی تصویر کو اپنی دلی توجہات کا مرکز بنائیں۔

سب سے آخر میں، قارئین کتاب سے عرض ہے کہ جب آپ اس کتاب کے حصۂ اول پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں گے تو یہ عجیب و غریب قدرتی کرشمہ اور خدائی اعجاز ملاحظہ فرمائیں گے کہ یہ کتاب منشی مکھن لال کے ذکر سے شروع ہوکر منشی ہیرا لال کے بیان پر ختم ہوئی ہے۔ "مکھن" بھی سپید ہوتا ہے اور "ہیرا" بھی بلوریں۔ مگر دونوں میں سے ایک حد درجہ ملائم اور پلپلا ہوتا ہے اور دوسرا انتہائی سخت اور ٹھوس۔

میری تحریر میں، اگر ہر جگہ آپ کو "مکھن" والی نرمی نہ ملے اور آپ کہیں "ہیرا" والا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کر اپنی پائیں، تو اس میں ہرگز شک نہ کریں کہ "مکھن" اور "ہیرا" دونوں کی طرح میرا باطن بھی اُجلا اور نہایت شفاف ہے ؛ بلکہ اس پر ضرور یقین رکھیں کہ وہ کڑ ختگی بھی بڑی قیمتی ہے : ؎

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

ایک بات اور :-

پہلے یہ کبھی دستور نہ تھا اور اب بھی عام نہیں ہے مگر کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ اپنی کتابوں میں عبارتوں کو "ماخذ" کے تفصیلی حوالوں اور تشریحی فٹ نوٹوں سے حد درجہ بوجھل اور گرانبار بنا دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی مستحسن فعل اور خوبی کی بات نہیں کیونکہ یہ چیز تحریر کی روانی کو بھی گھائل کر دیتی ہے اور قاری کے بھی ذوقِ مطالعہ پر بار ہوتی ہے - اُس کا ذہن و دماغ بار بار اصل عبارت سے ہٹ کر حاشیہ پر منتقل ہو ہو جاتا ہے - جس سے مطالعہ کا تسلسل مجروح ہو کر رہ جاتا ہے اور پڑھنے کا مزہ جاتا رہتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو خود اپنے اوپر اعتماد و اعتبار نہیں ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر اُس نے ہر جملہ اور ہر اقتباس کا تفصیلی حوالہ نہ دیا تو قاری اُسے جھوٹا سمجھے گا - یا پھر یہ بات ہو کہ مصنف یا مولف اتنے حوالے دے کر اپنی سعی و کاوش اور وسعتِ مطالعہ کا غیر ضروری اشتہار دے کر یا تو قاری سے داد و ستائش مزید کا خواہاں ہے یا اُس پر اپنا رعب ڈالنا چاہتا ہے - ورنہ اس قدر حوالے اس بات کی قرار واقعی ضمانت نہیں ہوتے ہیں کہ مصنف نے لفظ بہ لفظ صحیح عبارت نقل یا ان کی صحیح ترجمانی کی ہے - لہٰذا میں نے اس کتاب میں جتنا بھر حوالہ ضروری تھا اتنا ہی بھر دیا ہے - فقط

عطاء اللہ پالوی

علی نگر پالی - ضلع گیا
یکم جنوری ۱۹۸۱ء

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

حصۂ اول

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

آرام۔ منشی مکھن لال

سرورق کے بعد ہی "اردو زبان کا نالہ" میں ہے کہ "اردو" میں "نقطہ" اس لئے نہیں ہے کہ "نقطہ" تفریق و تقسیم کی علامت اور بانٹ بخرہ کا سمبول ہے۔ یہ بھی عجب دلچسپ اتفاق ہے کہ اس تذکرہ کی ابتدا ایک ایسے ہندو شاعر کے حسین تخلص سے ہو رہی ہے جس میں کوئی "نقطہ" نہیں اور جو اپنی معنوی حیثیت میں انتہائی پرسکون ہے۔ اور یہ پُرامن تخلص "آرام" اُس شاعر کا ہے جس نے نہایت نرم و نازک اور سرخ و سپید نام "مکھن لال" اختیار کر رکھا ہے۔

صاحبِ "اردو مثنویاں" نے مکھن لال آرام کی ایک مثنوی "سنگھاسن بتیسی" کا ذکر کیا ہے۔ مگر کوئی نمونہ نہیں دیا۔ انھوں نے ان کا تخلص بھی نہیں لکھا۔ مگر یہ دوسرے تذکروں میں مذکور ہے۔ صاحبِ "اردو کے ہندو ادیب" نے لکھا ہے کہ یہ کائستھ تھے ان کا وطن مالوف شاہجہاں آباد تھا لیکن کچھ زمانہ لکھنؤ میں بھی رہے تھے۔ انشا سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ان کے متعلق کریم الدین نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ آرام، نہایت خلیق، مودب و مہذب اور کشادہ رو تھے۔ ساتھ ہی وہ مرد دانا بھی تھے۔ تذکرہ "گلشنِ بیخار" میں بھی ان کو "مردِ زیرک" لکھا گیا ہے۔ "خمخانہ جاوید" میں بھی ان کا ذکر ہے۔ صاحبِ "ہندو شعرا" نے بھی اپنے تذکرہ میں دو جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ آرام فارسی زبان میں فارغ التحصیل تھے اور شاہزادہ سلیمان شکوہ کے دیوان خانہ میں متصدی کے عہدہ پر فائز تھے۔ ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی مثنوی کا کوئی نمونہ نہیں مل سکا۔

"سنگھاسن بتیسی" اور اس رنگ و نوع کی دوسری کتابیں بظاہر مذہبی معلوم

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہوتی ہیں مگر درحقیقت مذہب سے ان کا سروکار نہیں ہے۔ یہ محض قصّے کہانیاں ہیں۔
عام طور سے لوگوں نے "سنگھاسن بتیسی" کے بارے میں کہا ہے کہ راجہ بکرماجیت کے "سنگھاسن"
یعنی "تخت" میں ۳۲ یا ۴۰ پتلیاں تھیں۔ جو آسمانی خبریں راجہ کو پہنچایا کرتی تھیں۔ ہرچند
کہ کہانی کا خلاصہ یہی ہے مگر تفصیل جانے بغیر بات نہیں بن سکتی۔ صاحبِ "اردو مثنویاں"
نے لکھا ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" دراصل ۳۲ کہانیوں کے اُس مجموعہ کا نام ہے جو راجہ
بکرماجیت کے جود وسخا اور ہمت وشجاعت کے بارے میں زمانہ قدیم سے مشہور رہی
ہیں۔ ان کی اصل سنسکرت ہے۔ ایتھے، سنسکرت نسخے کا نام "سنہاسن ادوانز شنی"
بتاتا ہے لیکن گارساں دتاسی نے اس کا ماخذ سنسکرت کتاب "وکرما چرترم" کو قرار دیا ہے۔
سنگھاسن بتیسی اگرچہ سنسکرت کی ایک مستقل تصنیف پر مبنی ہے لیکن اس کی کئی کہانیاں
"بیتال پچیسی"، "جاتک کہانیاں" اور "کتھا سرت ساگر" سے ملتی جلتی ہیں۔ روایت یہ ہے
کہ یہ کہانیاں مہادیوجی نے گوری یعنی پاربتی جی کو سنائی تھیں۔

کہانی یہ ہے کہ ایک آسمانی بادشاہ چندر کرن نے ایک "سنگھاسن" یعنی "زرّیں تخت"
بنوایا اور مہادیوجی کو نذر کردیا۔ انھوں نے اسے راجہ اندر کو دیدیا۔ اندر نے اجین کے
راجہ بکرماجیت کو دے دیا۔ بکرماجیت کے بعد جب اس کا لڑکا کرم سین بادشاہ ہوا اور
اس نے اس تخت پر بیٹھنا چاہا تو اُن ۳۲ پتلیوں نے جو تخت پر جڑی تھیں، اسے ایسا کرنے
سے منع کیا۔ لہٰذا وہ تخت زمین کے اندر دفن کردیا گیا۔ جب راجہ بھوج کا زمانہ آیا تو اس
نے اُس تخت کو نکلوا کے اس پر بیٹھنا چاہا تو اسے بھی پتلیوں نے منع کیا۔ مگر اس مرتبہ
ان پتلیوں نے ڈائرکٹ ممانعت نہ کی بلکہ انھوں نے ترکیب یہ نکالی کہ جب راجہ بھوج
اس تخت پر بیٹھنے کا ارادہ کرتا تو ایک پتلی راجہ بکرماجیت کی شجاعت وسخاوت کا ایک
واقعہ اس انداز سے سنانے لگتی کہ راجہ کا تخت پر بیٹھنے کا خیال جاتا رہتا۔ ستائیسویں
دن راجہ بھوج اس دام میں نہ آیا اور پتلیوں کی ممانعت کے باوجود تخت پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے
ہی معاً اندھا ہوگیا۔ مگر جب اُس نے بکرم کا نام لیا تو پھر آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔ پانچ دن
کے بعد راجہ بھوج نے دوبارہ تخت نشین ہونا چاہا تو نہیں مانکر یہ بات پتلیوں نے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بتادی کہ اس سنگھاسن پر بیٹھنے کا حق بکرماجیت اور صرف بکرماجیت کو تھا۔ اور یہ پتلیاں دراصل راجہ اندر کی پریاں ہیں جو اپنے جرموں کی سزا میں پتھر کے بت بن کے اس تخت پر مقید کر دی گئی ہیں۔ اور جو قصے بکرم کے انھوں نے راجہ بھوج کو سنانے شروع کئے تھے وہ اس مقصد کے تحت بھی سنائے تھے کہ اگر وہ یہ بتیسوں ۳۲ کہانیاں راجہ بھوج سے کہہ دیں گی تو ان کے مکمل ہونے پر انہیں رہائی مل جائے گی۔ چنانچہ آج وہ بتیسوں کہانیاں پوری ہو گئیں لہٰذا تخت کا راز ظاہر کر دیا گیا ہے۔ یہ کہہ کے وہ پریاں آسمان پر اڑ گئیں۔ راجہ بھوج نے یہ عجیب قصہ سنا تو تخت کو دوبارہ مستقلاً زمین کے اندر دفن کرا دیا۔

آزاد ۔ منشی گورسرن بلی

"مثنوی" کی دنیا میں 'آزاد' واقعی آزاد ہیں، اُن تمام قیود اور ساری پابندیوں سے جو ادب و شعر کی دنیا میں رائج ہیں۔ انھوں نے "الشمس" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی تھی جو حیدرآباد سے ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ چودہ صفحوں کی چھوٹی سی مثنوی ہے اور اس میں نظم کے ذریعہ صیب سورج کی حقیقت یا رازِ آفرینش کو انشا کیا گیا ہے۔ ابتدا یوں ہوئی ہے :-

ایک دن بِبّن نے مجھ سے پوچھا سورج کیا چیز ہے یہ بابا؟

سورج کے بارے میں اب تک سائنسدانوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے مدار (ORBIT) پر گردش کرتا ہے اور اس کا کوئی محور (AXIS) نہیں۔ مگر قرآن حکیم کی بہ اصرار رہنمائی یہ ہے کہ سورج اور چاند دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔ یعنی جس طرح چاند زمین کے گرد یا زمین سورج کے گرد رقص کناں ہے، اسی طرح سورج کا بھی ایک محور ہے جس کے گرد وہ چکر کاٹتا ہے :-

(۱) "سورج اور چاند مسخر کر دیئے گئے ہیں اور ہر ایک مقررہ وقت تک چلتے رہتے ہیں" (۱۳/۲، ۳۱/۲۹، ۳۹/۵، ۱۴/۳۳)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(۲) "سورج اور چاند، ہر ایک فضا میں تیر رہے ہیں" (۲۱/۳۳)

(۳) "سورج، اپنے مستقر کی طرف چلتا ہی رہتا ہے اور یہ ایک زبردست علم والے کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے" (۳۶/۳۸)

اب دیکھئے دنیا اس حقیقت کا کب اعتراف کرتی ہے؟ بہر حال! مثنوی خالص علمی ہونے کی وجہ سے خشک تو ہے ہی مگر شاعرانہ حیثیت سے بھی بے مزہ ہے۔ جہیب و مجسم آتش کدہ میں لطافت آئے تو کہاں سے؟

آشفتہ - پنڈت امرناتھ ہالو

پنڈت امرناتھ کشمیری برہمن تھے۔ ایام شباب میں ان کے دادا کشمیر سے دہلی آکر بس گئے تھے۔ آشفتہ اپنے عہد کے مشہور غزلگو شاعر تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے غزلگو شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے مگر کسی نے بھی ان کی مثنوی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ ان کی مثنوی صفِ اول کی مثنویوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس مثنوی کا نام "گلشنِ ہفت رنگ" ہے۔ اس میں حاتم طائی کا قصہ نظم ہوا ہے۔ یہ مثنوی پنڈت ہرگوپال خستہ کی نگرانی میں شائع بھی ہو گئی تھی جو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں آشفتہ نے مثنوی کے روایتی ہیئت کی تقلید کی ہے۔ ابتدا حمد سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد مناجات۔ سببِ تصنیف، بیانِ سخن اور توصیفِ استاد ہے۔ اصل قصہ حاتم طائی کے اپنے وطن کو رخصت ہونے پر ختم ہو جاتا ہے۔

حاتم کا کردار ایک سخی اور دوسروں کے کام آنے والے انسان کی حیثیت سے بہت مشہور ہے۔ بہت سے لوگ اسے ایک فرضی کردار خیال کرتے ہیں، یہ قطعاً غلط ہے۔ عرب کے قبیلہ "بنی طے" کے سردار حاتم ایک حقیقی انسان تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ وہ جس شکل میں بھی ممکن ہو، اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔ یہ پانچویں صدی عیسوی میں ہوئے تھے۔ پیغمبرِ اسلام سے ایک مرتبہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لوگوں نے پوچھا کہ بہترین انسان کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا "اَفْضَلُ النَّاسِ مَن یَّنفَعُ النَّاسِ (بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے) چونکہ خود آپ کا یہ نصب العین تھا اس لیے آپ حاتم کو بہترین انسان مانتے اور کہتے تھے۔ آنحضرتؐ سے صرف ننلو برس پہلے حاتم ہوئے ہیں۔ آنحضرتؐ کے عہد میں، ایک جنگ میں، جو قبیلہ بنی طے سے ہوئی تھی حاتم کی پوتی بھی گرفتار ہو کر آئی تھی اور جب حضور کو معلوم ہوا کہ وہ حاتم کی پوتی ہے، تو حضور نے اُس کو فوراً رہا کرا دیا اور بڑی عزت سے اُس کو رخصت کیا تھا۔ لہٰذا حاتم کو ایک فرضی کردار تصور کرنا صحیح نہیں ہے۔ آشفتہ نے اپنی مثنوی میں حاتم کو ہیرو کی حیثیت سے جو پیش کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود آشفتہ بھی اسی طبیعت کے آدمی تھے۔

مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آشفتہ میں داستان سرائی کی زبردست صلاحیت تھی۔ مرقع نگاری بھی اعلےٰ درجہ کی ہے۔ بطور نمونہ دلّی کی تعریف کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

عجب پُر فضا گلشنِ لالہ زار ∴ وہ دلّی کہ دل ہائے باغ و بہار
مصفّا در و بام، رنگیں تمام ∴ ہر اک خشت پر لاجوردی کا کام
وہ رستہ، وہ بازار رشکِ تصور ∴ دکانیں برابر کہ بین السطور
وہ نہر ایسی بازار کے درمیاں ∴ فلک پر ہو جیسے خطِ کہکشاں
وہ بھر بھر کے دینا کٹوروں میں آب ∴ لبالب ہو جوں چشمۂ آفتاب
سرِ چوک وہ ساقیوں کی قطار ∴ وہ حقوں کے دھوئیں بلا مشکبار
وہ گجرے، وہ کنٹھے، وہ پھولوں کے ہار ∴ کہ قرباں ہو جس پر نسیمِ بہار
وہ میوہ فروشوں کی دینی صدا ∴ ہے انگور کا رنگ ترے میں مزا
گنڈیری فروشوں کے شیریں کلام ∴ وہ رس دار مصری کی ڈلیاں تمام
عجب سوہن حلوہ کا شیریں مزا ∴ ملے اور شہروں میں، ممکن ہے کیا
کہیں عرسِ درگاہِ صاحب کمال ∴ کہیں وجد میں صوفیوں کا وہ حال

کیا نادر الکلامی اور سلاست روانی ہے۔ ایک آشفتگی کے ساتھ منہ سے پھول جھڑتے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

چلے جاتے ہیں۔ شاہِ خراساں کی فوج کا نقشہ دیکھیئے :-

مظفر وہ بانکی دلاور سپاہ ✣ گویا دَل کی دَل جیسے ابرِ سیاہ
سواروں کا دستہ، پیادوں کی فوج ✣ ظفر مند و نصرت اثر موج موج

یہ رنگ بھی دیکھتے ہی چلیئے :-

یہ دنیا نہیں کچھ بھی جائے قیام ✣ فقط آمد و رفت کا ہے مقام
بھروسہ ہے کیا اپنے دم کا یہاں ✣ جو کچھ آج حاصل ہے، سو کل کہاں؟
کسی کی سوا زندگانی نہیں ✣ کسی کو یہاں جاودانی نہیں
نہیں دارِ فانی کا کچھ اختیار ✣ نہیں ایک سی دیکھی لیل و نہار

آشفتہؔ شعر و سخن میں قطب الدین تنویرؔ کے شاگرد تھے۔ ان کی تعریف بڑی عقیدت کے ساتھ کی گئی ہے۔ مثنوی نہایت عمدہ ہے۔

اشکؔ ۔ پریم پال دہلوی

اشکؔ دلّی کے قدیم باشندے ہیں۔ ان کے والد جناب ولایتی رامؔ تھے، اشکؔ کی ولادت ۵ رجون ۱۹۳۲ء / ۱۳۵۱ھ کو ہوئی۔ انھوں نے دلّی ہی میں تعلیم حاصل کی اور سرکاری فوجی رسالہ "سینک سماچار" سے متعلق ہیں۔ ادیب فاضل اور ایم۔ اے کے امتحانات پاس کر چکے ہیں۔ شاعری فطرت کی طرف سے انہیں ودیعت ہوئی ہے۔ انھوں نے ایک مثنوی "شکنتلا" کے نام سے لکھی ہے جو ۱۹۶۳ء / ۱۳۸۲ھ میں شائع ہو گئی ہے اور بلاشبہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

"شکنتلا" قدیم ہندی تصوّر اور جدید مذاقِ ادب کا مظہر وہ قصہ ہے، جو داستانِ مہابھارت سے الگ ہو کر شعرا اور ادبائے اردو کا دلچسپ ترین موضوعِ سخن بن گیا ہے۔ یہ دراصل کالیداسؔ کے ڈرامہ "ابھِجنان شاکُن تلم" کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ قصہ سنسکرت شاعری اور چمنستانِ نظم کا سدا بہار گلاب ہے۔ "شکنتلا" کا نام آتے ہی پردۂ تصور پر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ایک تصویر سی کھچ جاتی ہے شگفتہ و دردانگیز، پھول کی طرح نازک اور بتّی کی طرح کم زور، آنسو کی طرح آبدار اور پانی کی طرح رواں۔

داستانِ مہابھارت میں قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ راجہ دُشینت، ایک دن شکار کھیلتا ہوا ایک "تپ وبن" (وہ جنگل جہاں ریاضت کی جاتی ہے) میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ کنو رشی کی پرجمال لڑکی شکنتلا کو آشرم کے قریب دیکھ کر اُس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ شکنتلا، کنو رشی کے آشرم میں پلی تھی اور وہ عام طور سے اُن ہی کی لڑکی کہی اور سمجھی جاتی تھی، مگر درحقیقت وہ اُن کی صُلبی لڑکی نہ تھی۔ فی الواقع شکنتلا رشی وِشوامتر کی بیٹی تھی اور ایک سازشی کارروائی کے نتیجہ میں اندر کی اپسرا "مینکا" کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ مینکا نے پیدائش کے بعد اُس لڑکی کو پوشیدہ طور سے مشہور کنو رشی کے آشرم کے پاس رکھوا دیا تھا۔ جب کنو رشی کی نظر اُس خوبصورت نوزائیدہ زندہ بچی پر پڑی تو وہ اُسے اٹھا کر اپنے آشرم میں لے آئے اور بیٹی کی طرح انھوں نے اُس کی پرورش پرداخت کی، جس وجہ سے وہ ان ہی کی بیٹی سمجھی اور کہی جانے لگی۔ بہر کیف! راجہ دُشینت شکنتلا کو دیکھتے ہی اُس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ شکنتلا بھی اس حسین راجہ کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ راجہ تجویز پیش کرتا ہے کہ ہم لوگ "گاندھرو رِیت" کے مطابق شادی کر لیں۔ چونکہ یہ شادی بلا کسی درمیانی ولی یا برہمنی رسومات کی ادائیگی کے، محض مرد و عورت کی رضامندی سے ہی ہو جاتی ہے، اس لئے شکنتلا پہلے جھجکتی ہے مگر "عورت" پھر عورت ہے اور وہ بھی دلدادہ، لہٰذا بالآخر وہ اِس شرط پر راضی ہو جاتی ہے کہ اگر راجہ سے اُس کو بیٹا پیدا ہو تو راج گدّی کا وارث وہی بنایا جائے گا۔ راجہ اس شرط کو مان لیتا ہے اور دونوں یک جان دو قالب ہو جاتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد راجہ اپنی ریاست کو لوٹ جاتا ہے۔ شکنتلا حاملہ ہو جاتی ہے اور چلتے وقت راجہ اپنی انگوٹھی بطور نشانی یا شناخت کے شکنتلا کو دے جاتا ہے، تاکہ کبھی موقع آئے تو وہ شکنتلا کو اس کے ذریعہ پہچان سکے۔ راجہ اپنی ریاست میں پہنچ کر دُرواسا رشی کی بددعا کے سبب سے شکنتلا کو بالکل بھول جاتا ہے اور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شکنتلا کی کوئی خبر نہیں لیتا۔ کچھ دنوں کے انتظار کے بعد شکنتلا اپنی ماں مینکا اور اس انگوٹھی کو لے کر راجہ سے ملنے کے لئے روانہ ہو جاتی ہے۔ اتفاق سے انگوٹھی پانی میں گر جاتی ہے۔ شکنتلا اِس کی پرواہ کئے بغیر، یہ سمجھ کے کہ راجہ اسے دیکھتے ہی پہچان لیگا وہ دربار میں باریاب ہو جاتی ہے۔ مگر یا تو راجہ کی یادداشت جاتی رہتی ہے یا دُرواسا رشی کی بددعا کا اثر ہوتا ہے یا شناختی انگوٹھی کی عدم موجودگی سبب بنتی ہے، کہ راجہ، شکنتلا کو مطلق نہیں پہچانتا۔ اس حادثہ پر شکنتلا کے وہ ساتھی جو آشرم سے اُس کے ساتھ بڑی بڑی امیدیں دل میں رکھ کر آئے تھے، شکنتلا کا ساتھ چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ مگر ماں ساتھ نہیں چھوڑتی۔ شکنتلا یہ رنگ دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتی ہے اور راجہ کو بھرے دربار میں لعنت ملامت کرتی ہے۔ مگر کچھ کام نہیں چلتا۔ مجبوراً مینکا اپنی بیٹی شکنتلا کو دربار سے ہٹا لے جاتی ہے اور چونکہ ولادت کا وقت قریب ہوتا ہے، اس لئے وہ پاس ہی کے ایک جنگل میں قیام پذیر ہو جاتی ہے۔ یہیں شکنتلا کو بیٹا پیدا ہوتا ہے جس میں شروع ہی سے ہونہاری اور اقبال مندی کے بہت سے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اُدھر آکاش وانی ہوتی ہے اور ایک مچھوا شاہی انگوٹھی کو مچھلی کے پیٹ سے پاتا ہے اور پہچان کے راجہ کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ جس سے راجہ کی یادداشت لوٹ آتی ہے اور دُرواسا رشی کی بددعا کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور اُسے شکنتلا یاد آجاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اطلاعات حاصل کرکے راجہ، شکنتلا کو بچہ سمیت اعزاز و اکرام کے ساتھ دربار میں طلب کر لیتا ہے۔ اور ہونہار بچہ بھرت میں تمام شاہانہ صفات دیکھ کر راجہ اس قدر متاثر اور مسرور ہوتا ہے کہ وہ اُس کی ولیعہدی کا اعلانِ عام کر دیتا ہے۔ اور وقت آنے پر یہی بھرت ہندوستان کا راجہ بنتا ہے۔ کچھ لوگ ہندوستان کا نام "بھارت" مشہور ہونے کا سبب اسی "بھرت" کی نسبت کو قرار دیتے ہیں۔

کالیداس نے اس قصہ کو مہابھارت سے لیا ہے اور اسے ڈرامہ کا لباس پہنایا ہے۔ البتہ انھوں نے اس کا انجام تبدیل کرکے اسے کامیڈی اور طربیہ کے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بجائے ٹریجڈی اور المیہ بنا دیا ہے، جس وجہ سے سنسکرت کا یہ ڈرامہ ہیملٹ اور فاؤسٹ کے ساتھ، دنیا کے تین بہترین ڈراموں میں شمار ہوتا ہے اور دنیا کی تمام متمدن زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ بعض لوگ شکنتلا کو ہیملٹ اور فاؤسٹ سے کہیں بلند مانتے اور کہتے ہیں۔ چنانچہ اختر اسے پوری نے کہا ہے کہ:-

"ہیملٹ کی ٹریجیڈی عظیم الشان ہے کیونکہ وہ دنیا کے اژدحام میں انسان کی تنہائی کی تصویر ہے۔ اور فاؤسٹ کا الم عبرتناک ہے کیونکہ یہ ایک روح کی خودکشی کا نظارہ ہے۔ لیکن شکنتلا کا افسانہ ان دونوں سے زیادہ دردناک ہے۔ کیونکہ اس کا سوگ بے زبان ہے، وہ ایک دوشیزہ کی فریب خوردگی یا مایوسی نہیں بلکہ ایک ماں کی توہین کی کہانی ہے ہیملٹ اپنی محبوبہ کی پکار کو نہیں سن سکتا کیونکہ اس کی عقل بھٹک رہی ہے، فاؤسٹ اپنی عاشقہ کی کراہ کو نہیں سن سکتا کیونکہ وہ اپنے حواس کو بیچ چکا ہے۔ لیکن دشینت، اپنی پیاری کی آواز کو نہیں پہچانتا کیونکہ وہ اسے بھول چکا ہے۔"

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب سر ولیم جونس نے شکنتلا کا انگریزی میں ترجمہ کر کے پیش کیا تو یورپ کے ادبی حلقوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ گوئٹے نے شکنتلا پر جس طرح اظہار رائے کیا وہ اس ہندوستانی ادب کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے ایک بڑی سند ہے۔ اس نے کہا:-

"کیا تمہیں بہار کا شباب دیکھنا ہے؟ کیا تمہیں شفق کی خزاں کا نظارہ کرنا ہے؟ کیا تم کو وہ کچھ چاہیے جس میں حسن کے ساتھ ساتھ عظمت بھی ہو؟ تسکین دے دوش بدوش لطف بھی ہو؟ اور کیا تم زمین و آسمان کی تمام رنگینیوں سے آشنا ہونا چاہتے ہو؟ تو لو، میں "شکنتلا" کا نام لیتا ہوں اور تمہیں یہ سب کچھ مل گیا۔"

بہرکیف! اس ڈرامے یا قصے کو اردو نظم و نثر میں متعدد لوگوں نے منتقل کیا ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جن کا ذکر صاحبِ "اردو مثنویاں" نے تفصیل سے کیا ہے۔ ہندو شعرا کے بشکل مثنوی منظوم ترجموں کا ذکر اس کتاب میں بھی آگے ملے گا۔ غالباً اس قصہ کو سب سے آخر میں جناب اشک نے لباس نظم پہنایا ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا حمد سے یوں ہوتی ہے:

تری سب پہ کرپا ہے ربّ الرّحیم ∴ تو سب کا ہے داتا، تو سب کا کریم
تری رحمتوں کی، سوا دھوم ہے ∴ ترے دم سے ہی پانسری میں ہے لے
تو افضل ہے، عالی ہے تیرا مقام ∴ زمانہ کو قائم ہے تجھ سے دوام
تو ہی ایشور ہے، تو ہی ہے خدا ∴ تو ہی تو ہے ہر جا، نہیں دوسرا
دلوں میں ہے تو اور اجسام میں ∴ تو قائم فلک کے سب اَجرام میں
ترے دم سے قائم ہے کون و مکاں ∴ ترے دم سے زندہ زمیں آسماں
فقط اک یہی عرض ہے تجھ سے آج ∴ تو رکھ لے ذرا آج میری بھی لاج
مری لاج اب تو ترے ہاتھ ہے ∴ ترے ہاتھ ہی میں تو اب بات ہے

اور کون کہہ سکتا ہے کہ سر بسجود اشک، بارگاہِ الٰہی میں باریاب نہ ہوا؟ ہندوستان کی تعریف میں ہے:

جہاں کا ہوں باسی وہ ہندوستاں ∴ کہ چلتا ہے جس سے یہ سارا جہاں
ہمالہ کھڑا ہے اس کے سر پر چھتر ∴ یہ ہے پاسباں، پھر تو کس کا خطر؟
شمالی حدوں کا محافظ ہے یہ ∴ خدا کی خدائی کا حافظ ہے یہ
یہ بھارت ہے یا چودھویں کا ہے چاند ∴ ضیا اس کی بس اس کے آگے ہے ماند
یہ ہے ہند یا ہے سہاگن کوئی ∴ کہ یا ہے یہ چوتھی کی دلہن کوئی؟
قدم چومتی اس کے، گنگا سدا ∴ بلائیں ہے لیتی سدا، زبدا
اسی ہی کے پہلو میں جمنا بہے ∴ کہانی ہر اک اپنے منہ سے کہے
کہ رعنائی ہے اس میں بنگال کی ∴ اودھ سے خوشی آئی اس سے ہے ملی
تقدس ہے متھرا کا اس میں نہاں ∴ ہے پنجاب کی دل میں دھڑکن عیاں
ہے اجمیری خواجہ کی رحمت کا نور ∴ ہے کاشی کے عابد کا اس میں شعور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے اس کے تقدس کی دنیا میں دھوم ٭ جبیں، آسماں، اس کی لیتا ہے چوم

چونکہ یہ عشقیہ داستان ہے، لہذا آغاز سے پہلے "عشق" پر بھی چند شعر کہے گئے ہیں۔

محبت زمانے میں سب سے عزیز ٭ محبت سے بڑھ کر نہیں کوئی چیز

زمانہ میں ہے عشق ہی کو ثبات ٭ نہیں عشق سے بڑھ کے کوئی بھی ذات

وہی اول اور وہ ہی آخر قدیم ٭ اسی کی تو ہستی ہے سب سے عظیم

اسی سے ہے ملتی بشر کو بقا ٭ اسی سے زمانہ میں صدق و صفا

آغازِ قصہ یوں ہوا ہے۔

سناتا ہوں اک بات میں راز کی ٭ سنو غور سے، اس میں ہے زندگی

"تپ و بن" کی تعریف میں اچھے اچھے شعر کہے ہیں:۔

گھنی چھاؤں پیڑوں کی تھی سربسر ٭ کسی کو کسی کی نہ تھی واں خبر

ہری گھاس تھی یا کہ مخمل بچھی ٭ ہر اک شے تو ساکت و خاموش تھی

تھی شبنم، کہ موتی چمکتے ہوئے ٭ خدا کی خدائی میں ممور تھے

فلک سے ملیں کوہ کی چوٹیاں ٭ جو دیکھیں، گریں سر ہی سے پگڑیاں

فلک پر تھی یوں بادلوں کی قطار ٭ کہ جیسے سمندر پہ ہوں ہنس چار

جوگی کا سراپا۔

گھنے جس کے گیسو، سیہ جس کا رنگ ٭ عیاں اس کے چہرے سے عابد کا ڈھنگ

نہایت ہی پتلے، تُنک، اس کے لب ٭ جسے دیکھ کر سب کہیں، ہے غضب

جنیئو کا فلسفہ سنئے۔

فقط چھ یہ دھاگے نہیں ہیں قدیم ٭ حقیقت تو اس کی ہے سب سے عظیم

اِسی سے نمایاں ہے وحدت کا نور ٭ اِسی میں تو ہوتا ہے حق کا ظہور

حقیقت میں یہ شعلۂ طور ہے ٭ خدا کی خدائی کا یہ نور ہے

اشک نے باچشم پُراشک، ابتدا میں لاج رکھ لینے کی دعا اللہ سے کی تھی، مثنوی کا کامیاب اُتری تو مثنوی کا خاتمہ یوں کیا ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

عنایت تیری مجھ پہ ہو ہی گئی ∴ ترے فیض سے بات پوری ہوئی
کرم جیسا تو نے ہے مجھ پہ کیا ∴ اسی طرح سب پہ تو کیجیو دیا

اشک نے اپنی مثنوی میں اتنی مرتبہ خدا، خدا کیا ہے کہ بے ساختہ اکبر کا یہ شعر یاد آتا ہے ؂

رپٹ لکھوائی ہے لوگوں نے جا جا کے یہ تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا، اس زمانے میں

امیر — منشی جوالا شنکر

منشی امیر، بریلی کے رہنے والے، ذی استعداد مصنّف اور خوش گو شاعر تھے۔ ان کے والد منشی گنگا دت، اپنی نیک نفسی میں بہت معروف و مشہور تھے۔ امیر نے "کتھا ست نرائن" معروف بہ "دافعِ عذاب"، کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ "ست" کے معنی "سچ" اور "نارائن"، کے معنی "قدیم" کے ہیں۔ لہٰذا "ست نرائن" کے معنی ہیں "وہ حقیقت جو ازلی ہے"۔ اس سے مراد ذاتِ خداوندی ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ خدا کے سوا کوئی ذات ایسی نہیں جو "دافعِ عذاب" ہو۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ :-

"اور اگر تم کو اللہ تکلیف پہنچاوے تو بجز اللہ کے دوسرا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں" (یونس ۱۱ - ۱/۱۰۷)

یہ مثنوی ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں چھپ گئی تھی۔ تقریباً ساڑھے چار سو اشعار ہوں گے۔ زبان شستہ اور انداز پاکیزہ ہے۔ نمونہ یہ ہے:؂

اسی کی ہر طرف جلوہ گری ہے ∴ کہیں زہرہ، کہیں وہ مشتری ہے
جدا ہے سب سے لیکن ہے ہر اک جا ∴ دوئی سے دور ہے، یکتا ہے یکتا
بیاں کیا کر سکے یہ پیکرِ خاک ∴ بجز اس کے کہ ہے وہ ایزدِ پاک

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انتظار — منشی پورن چند

صاحب "بہارِ سخن" نے لکھا ہے کہ وہ منشی سورج بخش ساکن خیر آباد ضلع سیتاپور کے بیٹے تھے۔ اچھے شاعر تھے اور منشی کھنو لال تائب ولد منشی جھاؤ لال نائب لکھنوی ابن واجب لکھنوی کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۸۸۰ء؁/۱۲۹۷ھ؁ میں پیدا ہوئے تھے۔ میونسپلٹی خیر آباد میں اہلِ مد یعنی کلرک تھے۔ سنہ ۱۹۲۹ء؁/۱۳۴۷ھ؁ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے ایک مثنوی "طوطا مینا" کے نام سے لکھی تھی اور قدیم انداز میں اخلاقی سبق لوگوں کو دیا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ انتظار، عہدِ حاضر کے شاعر تھے مگر نہ تو ان کی مثنوی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہے نہ کہیں اس کا نمونہ مل سکا۔ اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا۔

انجم — منشی گردھاری لال

انجمؔ، لکھنؤ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے کے فرد اور خود بھی تعلیم یافتہ تھے۔ اُن کے والد منشی رام دیال لال اپنے وطن بربٹہ ضلع اناؤ سے لکھنؤ آکر بس گئے تھے۔ انجم اپنے عہد کے بڑے نازک خیال اور شیریں بیان شاعر تھے۔ انھوں نے سمبت ۱۹۲۱ء (۱۲۸۱ھ؁/۱۸۶۴ء؁) میں ایک مثنوی "منظومۂ فرخ" کے نام سے لکھی تھی جو شائع بھی ہو گئی تھی مگر اب نایاب ہے۔ نمونہ یہ ہے :؎

جو رہتا تھا سدا آما اک برہمن ⁂ برنگِ گل جہاں سے پاک دامن
نہ بھی تھا بے سر و برگی کا ساماں ⁂ چنار آسا تھا خالی ہاتھ ہر آں
سراپا شکلِ سوزن تھا وہ عریاں ⁂ تعلق سے جہاں کے پاک داماں
یہاں تک پیرہن سے تھا سبکسار ⁂ کہ رکھتا تھا فقط اک تارِ زنار

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ مثنوی شاعرانہ استعارات و تشبیہ سے پُر اور مزین ہے۔ "عریاں" تو بہت سی چیز ہے، مگر انجم نے سادھو کی عریانی کو "سوزن" یعنی "سوئی" کی عریانی سے اس لئے تشبیہ دی ہے کہ "سوئی" وہ "عریاں" شئے ہے جو ہر ایک کی "پردہ پوشی" میں آگے بڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ جب چشمے کے کنارے ان سادھو جی کا قیام تھا اس کے ذکر میں ہے کہ:

گوارا مثل آبِ زندگانی ٭ کہ شکر شرم سے ہو جس کے پانی
غبارِ راہ سے دھویا بدن کو ٭ اتارا تن سے خاکی پیرہن کو

پوری مثنوی اسی طرح گل و گلزار اور رواں آبشار بنی ہوئی ہے۔

اندرمن - منشی اندرمن

اندرمن مراد آباد کے رہنے والے، مہاجن قوم کے ایک فرد اور نہایت ذی علم بزرگ تھے۔ وہ جس طرح سنسکرت اور ہندی کے عالم تھے ویسے ہی عربی و فارسی کے بھی ماہر تھے۔ اردو تو خیر ان کے گھر کی لونڈی تھی ہی۔ مذہبی علوم اور کتب شاستر پر قابلِ رشک عبور حاصل تھا۔ اپنے عہد کے زبردست مناظر بھی رہے ہیں اور اس میدان کے مشہور مرد متصور ہوتے تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ موصوف نے مولوی عبید اللہ صاحب کی تصنیف "تحفۃ الہند" کے جواب میں "تحفۃ الاسلام" اور "ہدیۃ الاصنام" کے جواب میں "ابطال المتناصین" لکھی تھی، جو بڑے پائے کی کتابیں بتائی جاتی ہیں۔ میں نے یہ کتابیں نہیں دیکھیں، مگر میں جانتا ہوں کہ الزامی اور جوابی یا مناظرہ کی کتابیں "پایہ" کی ہوتی ہی نہیں ہیں۔ وہاں تو بس فریق کو خاموش کر دینا مقصود ہوتا ہے اب جس طرح بھی ہو۔ اندرمن کا یہ خاص شغف تھا کہ وہ تحریری اور تقریری دونوں طرح بحث و جدال میں حصہ لینے میں پیش پیش رہتے تھے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انھوں نے "اصولِ دینِ ہنود" کے جواب میں "اصولِ دینِ احمد" کے عنوان سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ جس میں علم کا دریا بہا دیا ہے۔ نمونہ کے لیے "خاک" کی تعریف ملاحظہ ہو۔ معترض کو سمجھاتے ہیں کہ تمہارا یہ اعتراض کہ ہندو خاک پرست ہیں اور مٹی کے پتلوں کو پوجتے ہیں، برہنائے ناواقفیت ہے۔ بھلا خاکی انسان کے لیے، خاک کے سوا اور کون سا عنصر باعثِ کشش ہو سکتا ہے ؟

جو مشتِ خاک رہ پرماتما ہیں ٭ سمجھتے خاک ہی کو کیمیا ہیں
جو ہیں ذرہ خاکسارِ حضرتِ پاک ٭ ہوئے اس واسطے آلودۂ خاک
جو ہووے خاک بیثر کوئے دلدار ٭ اسے ہے خاک سے ہردم سروکار
جسے زر، خاک سے حاصل ہوا ہے ٭ بلے، خاک اس کے حق میں کیمیا ہے
نہ ہرگز خاکساروں سے ہو بدظن ٭ کہ ہووے خاک سے آئینہ روشن
نہ اصلا خاک پر کر طعن، بیباک ٭ کہ دنیا اوّل اور آخر میں ہے خاک
یہ باعث خاک کے ہے باغ و بستاں ٭ بدولت خاک کے ہے کاخ و ایواں
زرِ گل، خاک سے آتا ہے بیروں ٭ دبا ہے خاک ہی میں گنجِ قاروں
سپردِ خاک ہوتے ہیں خزائن ٭ اسی میں پنہاں رہتے ہیں دفائن
ہوا ہے قدسیوں کا جلکے افسر ٭ رکھا ہے جس نے اپنا، خاک پہ سر
بظاہر دیکھ لے اے حق فراموش ٭ کہ دنیا نے کیا ہے خاک سے جوش
طفیلِ خاک ہے روئیدگی سب ٭ بدولت اس کے ہیں چشمے، لبالب
تو خود بھی خاک ہے اے خاک برسر ٭ غرور اتنا نہ مشتِ خاک پر کر
غرض ہے خاک ہی سب جزو و کل ٭ سمجھ ہر شے اسی سے بے تامل

میں نے عرض کیا تھا کہ مناظرہ میں صرف فریق مخالف کو خاموش کر دینا ہی کارنامہ ہوتا ہے بس۔ بلا شک اندرامنی نے شاعری کی زمین پر حسنِ بیان کا دریا بہا دیا ہے، مگر نفسِ اعتراض اپنی جگہ اٹل ہے۔ میں نے کبھی نہیں سنا اور دیکھا کہ مناظرہ نے کسی کو بھی فائدہ پہنچایا ہو اور کوئی شخص بحث و مناظرہ سے قائل ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کہ قرآن نے بحث مباحثہ کی سخت ممانعت کی ہے اور فرمایا ہے کہ جب ایسا کوئی موقع آئے تو :۔

"کہہ دو کہ اللہ نے جتنی کتابیں اتاری ہیں، میں سب پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔ اللہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے کام آئیں گے اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ ہماری تمہاری کوئی بحث نہیں، ہم سب کو اللہ ایک دن جمع کرے گا اور ہم سب کو اسی کے پاس جانا ہے" (شوری - ۲ - $\frac{42}{15}$)

پیغمبرِ اسلام کو یہودیوں اور عیسائیوں نے بحث و مناظرہ کی بہت دعوت دی مگر انھوں نے کبھی کسی دوسرے مذہب والوں سے مناظرہ و مباحثہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ مباحثہ و مناظرہ کی ممانعت کردی گئی تھی اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مناظرہ سے کسی کو برِبنائے زیادتیٔ علم و عقل اور زبان آوری و دلائل "خاموش" تو کر دیا جا سکتا ہے مگر "مطمئن" نہیں بنایا جا سکتا۔ اور جب تک کوئی شخص دل سے مطمئن نہ ہو، اپنے تصوّر و عقیدہ کو نہیں بدل سکتا۔ اور اطمینانِ قلب، مطالعہ و فکر سے نصیب ہوتا ہے، بحث و مناظرہ سے نہیں۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں نے ہر حکمِ قرآن کے خلاف وطیرہ اختیار کیا، منجملہ ان کے یہ مناظرہ کی لعنت بھی تھی کہ انھوں نے یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے تو الگ رہے خود اپنے فرقوں ہی کے اندر مناظرہ کی وہ دھما چوکڑی مچائی کہ نعوذ باللہ۔

بخشی ۔ منشی سورج بخش

بخشی، خیرآباد ضلع سیتاپور کے رہنے والے اور منشی پیارے لال بخشی سرشتہ استو کے بیٹے تھے۔ ۱۹۱۰ء بکرمی (۱۸۵۳ء) میں پیدا ہوئے اور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

۱۹۱۸ء / ۱۳۳۶ھ میں انتقال کیا۔ اردو اور فارسی دونوں کے استاد تھے۔ صاحبِ "ہندو شعرا" نے ان کا سالِ وفات سنہ ۱۸۹ء ظاہر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

صاحبِ "ہندو شعرا" نے ان کی صرف ایک مثنوی "مثنوی بخشی" کا ذکر کیا ہے۔ مگر صاحبِ "بہارِ سخن" نے اُن کی حسب ذیل چھ مثنویاں نتیجۂ فکر ظاہر کی ہیں:۔

(۱) مثنوی بخشی (۲) مہاراج نامہ (۳) پہیلی نامہ

(۴) طلسم نامہ (۵) حیات نامہ (۶) انجم نامہ

ہرچند کہ ان میں سے کسی کا بھی نمونہ دستیاب نہ ہو سکا، مگر وہ بڑے خوش فکر شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک بہت مشہور شعر ہے:۔

ہمیشہ "عیش" و "راحت" کا رہا طالب زمانے میں

نہ وہ زیرِ فلک نکلا، نہ یہ زیرِ زمیں نکلی

یہ بڑا جامع ترجمہ ہے قرآنِ عظیم کی اس آیت کا:۔

"ہم نے انسان کو نہایت مشقت میں پیدا کیا ہے۔"

(البلد-۱-۹/۴)

برقؔ - منشی جوالا پرشاد

برقؔ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۳ء / ۱۲۸۰ھ کو قصبہ محمدی ضلع لکھیم پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ سیتاپور کے قریب ہے، اس لئے بعض لوگوں نے انہیں سیتاپوری سمجھا یا لکھا ہے۔ برقؔ کے والد کا نام منشی شیو دیال تھا۔ برقؔ نے ۱۸۸۲ء / ۱۲۹۹ھ میں لکھنؤ سے بی۔اے اور ۱۸۸۴ء / ۱۲۹۲ھ میں ال۔ال۔بی۔ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۵ء / ۱۳۰۲ھ میں بعہدۂ منصفی تقرری ہوئی اور سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۶ء / ۱۳۲۶ھ میں عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۹ء / ۱۳۲۷ھ میں منجانب سرکار "گریون کمیٹی" کے ممبر بھی منتخب ہوئے تھے۔

برقؔ نہایت ذہین و فطین اور صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ بچپن سے شعر و

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شاعری کا ذوق تھا اور انھوں نے اپنی پوری عمر خدمتِ زبان و ادب میں گذاری۔ شاعری میں بعض لوگ انہیں سفی کا شاگرد بتلاتے ہیں اور بعض امیر مینائی کا۔ طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت تھی، اس لئے ظریفانہ تحریر میں بھی خوب حصہ لیتے تھے۔ اور اُس عہد کے مشہور مزاحیہ اخبار" اودھ پنچ "کے نامہ نگاروں میں سے تھے۔ اور اُس حلقہ میں اپنا ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ زبان کی خدمت کو وہ اپنا اوّلین فریضہ تصور کرتے تھے، اس لئے انہیں تحقیقِ الفاظ کا بڑا شوق تھا۔ اسی لئے اُن کا کلام شاعری کے عیوب سے پاک بتایا جاتا ہے۔ انگریزی اور بنگلہ زبانوں سے شیکسپیئر اور بنکم چندر چٹرجی کی کئی کتابوں کا اردو میں انھوں نے ترجمہ بھی کیا تھا۔ ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء / ۱۳۲۹ھ کو بعارضۂ طاعون، لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔

برقؔ نے دو مثنویاں لکھی تھیں ایک "معشوقۂ فرنگ" جو شیکسپیئر کی "رومیو جولیٹ" کا منظوم ترجمہ تھا دوسری کا نام "مثنوی بہار" ہے۔ اوّل الذکر کا نمونہ مل نہ سکا۔ دوسری مثنوی کے بارے میں چکبستؔ نے لکھا ہے کہ جب اس مثنوی کو سرسید مرحوم نے دیکھا تھا تو بڑی تعریف کی تھی۔ "مثنوی بہار" بلاشبہ باغ و بہار ہے اور پڑھتے وقت بہار کا پورا سماں آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ سچی شاعری کی تعریف یہی ہے کہ وہ محاکاتی ہو۔ پڑھتے وقت آنکھوں کے سامنے کے سارے پردے ہٹا دے۔ نمونہ یہ ہے: ؎

بوٹا سا وہ قد بہار کے دن ؞ اُٹھتی کونپل، ابھار کے دن
گھونگھٹ اِک ناز سے نکالے ؞ سہرا پھولوں کا منہ پر ڈالے
ہریالی بنی، وطن میں آئی ؞ اک سبز پری چمن میں آئی
اُتری گلشن میں جب سواری ؞ سورج نے آرتی اُتاری
گل نے، زرِ گل کیا نچھاور ؞ صدقے ہوئی عندلیب، اُڑ کر
خورشید نے آئینہ دکھایا ؞ کرنوں نے مورچھل ہلایا
غنچوں نے چٹک کے لیں بلائیں ؞ بلبل نے چہک کے دیں دعائیں
بدلی پھولوں نے اپنی وردی ؞ اودی، زنگاری، لاجوردی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی ٭ کوئل نے یہ پھر دنا منادی

معشوقۂ گلعذار آئی

آئی - آئی - بہار آئی

نہایت عمدہ مثنوی ہے اور سدا بہار - شاید منشی بدری بہادر بدرؔ نے اسی مثنوی کو دیکھ کر یہ شعر کہا تھا :-

جاگے نصیب باغ کے، سبزہ ہرا ہوا

رکھا جو پائے ناز، عروس بہار نے

برقؔ - شیام سندر لال

برقؔ، موضع اسماعیل پور ضلع سیتاپور کے رہنے والے تھے - ان کے والد منشی کشن پرشاد عدالت میں سررشتہ دار تھے - اور ان کے دادا منشی سیتل پرشاد قانون گو تھے - برقؔ کا خاندان کھاتا پیتا زمیندار خاندان تھا - برقؔ ۱۸۷۱ء / ۱۲۸۸ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم فارسی سے شروع کی اور مولوی وزیر احمد استاد مقرر ہوئے - بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول میں انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے داخل ہوئے - بی اے تک تعلیم حاصل کی - ماں کے بیمار پڑنے کی خبر پاکر ان کی خدمت کے لئے گھر چلے آئے اور پڑھنا چھوڑ دیا - مکمل دو سال تک پڑھنا چھوڑ کر بیمار ماں کی خدمت میں لگے رہے - اللہ اللہ ایسے ہیں خدا کے بندے، جو احکام الٰہی کے پابند ہوتے ہیں - قرآن مجید نے "ماں" کے حق پر جس قدر زور دیا ہے، اتنا کسی انسان کے حق پر نہیں - اسی کی تاکید ہے کہ :-

(۱) "تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا - اور تم اپنے باپ ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو - اور اگر وہ دونوں، یا ان میں سے کوئی ایک، تمہاری موجودگی میں، اپنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی بہترین خدمت کرو - اور اگر وہ تمہیں کچھ ڈانٹیں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ڈپٹیں، تو اُف بھی نہ کرنا۔ اور تم اُن کو کسی بات پر جھڑکنا، بلکہ اُن سے
ادب کے ساتھ بات چیت کرنا اور اُن کے سامنے شفقت سے، انکساری
کے ساتھ، جھکے رہنا۔ اور اُن کے لئے اپنے پروردگار سے یوں دعا
کرتے رہنا کہ "اے میرے پروردگار! ان پر رحمت فرما، جس طرح
انھوں نے مجھ پر رحم کھاکر مجھ کو بچپن میں پرورش پالا تھا" یاد رکھو
کہ تمہارے اعمال تو کیا، تمہارے دلوں تک کا حال بھی اللہ کو معلوم
ہے اور اگر تم سعادت مند ہو، تو اللہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف
کر دیتا ہے" (بنی اسرائیل۔ ۳۔ ۱۷/۲۳-۲۵)

(۲) "اور ہم نے انسان کو، اُس کے باپ ماں کے متعلق سخت تاکید
کی ہے۔ کیونکہ اُس کی ماں نے، ضعف پہ ضعف اٹھاکر، اُس کو پیٹ میں
رکھا اور پھر دو برس تک وہ اُس کو دودھ پلاتی ہے۔ ہم نے کہہ دیا
ہے کہ تم لوگ میری اور اپنے ماں باپ کے احسانات کی شکر گذاری کیا کرنا
اور یاد رکھنا کہ تم کو لوٹ کر پھر میرے پاس آنا ہے" (لقمن۔ ۲۔ ۳۱/۱۴)

برق انتہائی خوش نصیب اور قطعاً جنت نصیب تھے جنھوں نے "ماں" کی خدمت کو
تعلیم و آرام ہر چیز پر مقدم جانا۔ ۱۸۹۵ء/۱۳۱۲ھ میں اُن کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے
دو برس بعد ۱۸۹۸ء/۱۳۱۶ھ میں ان کے والد بھی چل بسے۔ لہٰذا اُن کے چچا بابو ہرپرشاد
نے اُن کی مدد کی اور برق نے ۱۸۹۹ء/۱۳۱۷ھ میں ال۔ال۔بی کا امتحان پاس کیا۔ اور
سیتاپور میں وکالت کرنے لگے۔ برق کو اردو اور فارسی گھر پر پڑھائی گئی تھی۔
اور بعد میں انھوں نے اپنے شوق سے عربی اور سنسکرت میں بھی مہارت حاصل کرلی۔
شاعری کا شوق ہوا تو تیس جونوی سے اصلاح لینے لگے۔

برق کی دو مثنویاں ہیں۔ پہلی "شاہ لیئر" اور دوسری "سلکِ مروارید"
پہلی مثنوی شیکسپیئر کے ڈرامہ "کنگ لیئر" کا ترجمہ ہے۔ اس مثنوی سے برق کی
قادرالکلامی تو یقیناً ظاہر ہوتی ہے، مگر مثنوی باکیف نہیں ہے۔ نمونۃً ملاحظہ فرمائیے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مثنوی کی ابتدا یوں ہوئی ہے :

کروں پہلے ثنائے ایزدِ پاک ٭ دیئے انساں کو جس نے فہم و ادراک
کہا جب میں نے، حمدِ حق رقم کر ٭ پڑے سجدہ، قلم کا جھک گیا، سر
زباں سے کیا صفت اُس کی بیاں ہو ٭ نہیں ممکن اگر ہر مُو، زباں ہو
مُقر ہیں عجز کے خود شاہِ لولاک ٭ کہا ہے سر جھکا کر "ما عرفناک"
وہی جانے، جو ہے اس کی حقیقت ٭ نہیں کھلتا ہے کیا ہے رازِ قوت

قرآن حکیم نے بار بار فرمایا ہے کہ دنیا کے ہر حصہ، ہر قوم اور ہر زبان میں "پیغمبر" آیا کئے ہیں اور انھوں نے اپنی ہی زبان میں ہدایت و رشد فرمائی ہے۔

(۱) لِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد ۱۳-۷) "ہر قوم میں ایک ہدایت کرنے والا بھیجا گیا ہے"

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم ۱۴-۴)

"اور ہم نے تمام پیغمبروں کو اُن ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کے بھیجا ہے تاکہ وہ اُن سے ٹھیک سے بیان کر سکیں"

برقی کہتے ہیں :-

رسول اُس نے کئے پیدا جہاں میں ٭ زباں اپنی رکھی اُن کی زباں میں
ہدایت گمرہوں کو، کی انھوں نے ٭ خبر ہر ایک نیک و بد سے دی انھوں نے
عمل ہیں، اُن کا فرمانا، جو لایا ٭ بچا دوزخ سے، گھر جنت میں پایا

شاہ لیئر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اُس کی صرف تین لڑکیاں تھیں۔ باپ نے فیصلہ کیا کہ :-

جو میری نسل میں ہیں تین دختر ٭ کروں دریافت میں اُن کو بلا کر
کہ جس کو مجھ سے ہو جیسی محبت ٭ مطابق اُس کے دوں میں ملک و دولت

پھر بڑی بیٹی کو بلا کے اپنی محبت کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے بڑی لفاظی دکھائی اس لئے شاہ نے اُس کو ایک تہائی ملک و دولت عطا کر دیا۔ پھر دوسری کو بلایا اس نے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھی مبالغہ آمیز اظہارِ محبت کیا - لہذا ایک تہائی ملک و دولت اس نے پائی۔ اب
تیسری لڑکی کو بلاکے شاہ نے پوچھا تو اسنے نہایت صفائی اور سادگی سے بلا مبالغہ
صرف اتنا ہی کہا کہ ایک بیٹی کو باپ سے جس قدر بھی محبت ہوسکتی ہے اس قدر مجھے بھی
آپ کے ساتھ ہے - بادشاہ کو یہ جواب پسند نہ آیا اور اس نے اس تیسری لڑکی کو ملک
دولت سے محروم کرکے باقی تہائی ملک و دولت بھی بڑی اور منجھلی کو دیدیا - ایک
وفادار ملازم نے بادشاہ کو سمجھانا چاہا مگر اس نے ایک نہ سنی - بالآخر جب تجربہ
موقع آیا تو بادشاہ کو پتہ چلا کہ وہ دونوں بیٹیاں محض ناکارہ اور لفاظ تھیں - الب
یہی چھوٹی لڑکی اپنے بیان میں سچی تھی - مثنوی کا اختتام یوں ہوا ہے : ~

نہیں جائز پدر پر ظلم کرنا ∴ خدا کے قہر سے ہر وقت ڈرنا
وہ پاکر ملک برٹن کی حکومت ∴ بسر کرنے لگا با عیش و عشرت

اس مثنوی کا قطعہ تاریخ طباعت، مخرق سیتاپوری نے کہا ہے جس سے ۱۳۳۹ / ۱۹۲۱
سنہ طباعت ظاہر ہوتا ہے -

برق کی دوسری مثنوی "سلکِ مروارید" ہے، جو اخلاق و نصائح پر مشتمل ہے
اس میں ۳۶ کہانیاں ہیں - ابتدا یوں ہوئی ہے : ~

ہے واجب حمد پہلے اس خدا کی ∴ زباں کو جس نے گویائی عطا کی
وہی اک مالک ہر دوسرا ہے ∴ اسی کی ذات بے چون و چرا ہے
وہی اک خالقِ ارض و سما ہے ∴ فنا سب کو ہے اور اس کو بقا ہے
ہمیشہ کے لئے وہ حکمراں ہے ∴ حقیقت میں وہی شاہِ جہاں ہے

سببِ تالیف میں فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک دن بابو کنہیا لال سے کہا کہ : ~

کروں میں نظم ایسے چند نصائح ∴ دلِ مخلوق پر ہوں جو کہ لائح
کروں "سادی زباں" میں ان کو منظوم ∴ کہ مطلب ان کا ہو سب ہی کو معلوم
لبِ شیریں سے فرمایا بہت خوب ∴ ہدایت ایسی ہوں گی سب کو مرغوب
کمر ہمت کی باندھی میں نے فی الفور ∴ دکھایا سادگی کا، نظم میں طور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اب سے پہلے اردو کی "سادی زبان" کا کیا انداز تھا، ملاحظہ فرمائیے :-

روایت ہے کہ اک دانائے آفاق ؛؛ جہانِ علم و فضل و جانِ اخلاق
دُرِ غلطانِ بحرِ خاکساری ؛؛ مہِ تابانِ برجِ بختیاری
معاشِ زندگی سے فارغ البال ؛؛ خوش اوقات و خوش اوضاع و خوش اقبال
کئی رکھتا تھا فرزندانِ دلبند ؛؛ ذہین و صاحبِ علم و ہنرمند
جوان مردانِ میدانِ سیاست ؛؛ گلِ خندان و بستانِ ارادت

یہ تھی بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ایک ہندو کی "سادی زبان"۔ جہاں "عملِ خیر" کی تعریف یا تبلیغ کی ہے، فرماتے ہیں :-

بجے گا کوسِ رحلت جب جہاں سے ؛؛ نہ کچھ بھی ساتھ جائے گا یہاں سے
یہ سب مال و منال و حشمت و جاہ ؛؛ نہ ہوں گے کچھ سفر کے وقت ہمراہ
فقط جائیں گے اپنے ساتھ اعمال ؛؛ نہ کچھ بھی کام آئے گا زر و مال

یہ ایک ہندو شاعر کی تعلیم ہے۔ مگر کیا قرآنِ حکیم کی اس صاف و صریح آیت کا نہایت عمدہ ترجمہ نہیں ہے !

"ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کر لو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آجائے، پھر وہ کہنے لگے کہ "اے میرے پروردگار! مجھ کو اور تھوڑے دن مہلت کیوں نہ دی کہ میں خوب عملِ خیر کر لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا۔ جان لو کہ اللہ کسی شخص کو ذرّہ برابر مہلت نہیں دیتا جبکہ اس کی میعاد آجاتی ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ اللہ وہ ہے جس کو تمہارے سارے اعمال کی خبر ہے۔" (منافقین - ۲ - ۶۳/۱۰-۱۱)

"تصوف" میں غلو کر کے "ترکِ دنیا" کے فرسودہ تصور کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، مگر بھگتی کا تصوّف سنئے :-

زن و فرزند سے منہ موڑ لینا ؛؛ خیالِ زر کو دل سے چھوڑ دینا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh
Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تصوّف یہ نہیں، اے مردِ عاقل :. نہیں کچھ چھوڑنے سے ان کے حاصل
تصوّف ہے خدا کو یاد رکھنا :. خوش اعمالی سے دل کو شاد رکھنا

برق نے اپنی اس مثنوی میں بڑے فاضلانہ انداز سے اس طرح کے بہت سے غلط تصوّرات کی اصلاح کی ہے اور اس مثنوی کا نام "سلکِ مرداریہ" یعنی "موتی پرو ہوا ہار" غلط نہیں رکھا ہے۔ نہایت عمدہ، بلیغ اور حسین مثنوی ہے۔ قیس مھونوی نے قطعۂ تاریخ کہا ہے :۔

ہے تخلص برق بالا شیام سندر لال کا :. فکر سے کیا نیک انجامِ سخن کی داد دی
سال اب تصنیف کا یوں قیس لکھو درنگ :. ہے یہ نسخہ برق کا انمول موتی کی لڑی

پہلے مصرع سے سمبت سال ۱۹۷۸ء۔ دوسرے مصرع سے ہجری سال ۱۳۳۹ھ تیسرے مصرع سے فصلی سال ۱۳۲۸ء اور چوتھے مصرع سے عیسوی سال ۱۹۲۱ء نکلتا ہے یعنی جیسی حسین مثنوی ویسی ہی خوبصورت تاریخ بھی۔ جزاک اللہ۔

بشاش ۔ منشی دیبی پرساد

بھوپال میں منشی گھاسی رام کا نام ہر شخص جانتا ہے۔ وہ ایک صاحبِ علم بزرگ تھے اور خوشنویسی میں کمال رکھتے تھے۔ بشاش اُن ہی کے لڑکے ہیں۔ صاحبِ "ہندو شعرا" نے بشاش کے والد کا نام منشی بجن لال بتایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اصل نام یہی ہو اور معروف گھاسی رام کے نام سے ہوں۔

بشاش نے جب شاعری شروع کی تو "حریق" تخلص اختیار کیا تھا مگر بعد میں، اپنی زندہ دلی و خوش مزاجی کی رعایت سے "بشاش" تخلص فرمانے لگے تھے۔ بھوپال میں کائستھ خاندانوں میں اپنے علم و فضل کے سبب امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔

بشاش نے دو تذکرے بھی لکھے تھے جو اُن کی شہرت کا سبب ہیں۔ ایک

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تذکرہ فارسی گو شعرا کا تھا جس میں صرف اُن شعرا کا ذکر تھا جو ہندو تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اِس تذکرہ کا نام "معیار الشعرائے ہنود" تھا۔ یہ تذکرہ نایاب ہے۔ اردو کے ہندو شعرا کا تذکرہ "آثار الشعرائے ہنود" کے نام سے جو لکھا تھا وہ بھی کمیاب ہے۔ مجھے بڑی دقت سے اِس تذکرہ کے دو نسخے دیکھنے کو ملے۔ ایک سنہا لائبریری (پٹنہ) میں اور دوسرا "اردو لائبریری" (ڈمری) میں۔ دونوں نسخے نولکشور پریس لکھنؤ کے چھاپے ہوئے تھے۔ اِس میں کئی سو شاعروں کا ذکر ہے۔

بشاش نے ایک مثنوی "کلیلہ دمنہ" کے نام سے لکھی تھی جس کا ذکر ملتا ہے، مگر کہیں نہ تو مثنوی مل سکی اور نہ اُس کا کوئی نمونہ ہی دیکھنے میں آسکا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ جس نے "تذکرہ" لکھ کر ہزاروں کو زندہ جاوید بنایا، خود اُس کی فکرِ شعری زندہ نہ رہ سکی۔ میں نے اِس امر کی بڑی کوشش کی کہ مثنوی ملے مگر افسوس کہ کامیابی نہ ہوئی۔ بشاش بڑے زندہ دل انسان تھے اُن کا یہ شعر بہت مشہور ہے:-

دیکھ کر اُس تُرک کو کلمہ لگا پڑھنے حریق
ایک ہندو تھا یہاں، وہ بھی مسلماں ہو گیا

اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مثنوی بہت دلچسپ اور خوش فکری کے ساتھ لکھی ہوگی۔ خدا کرے میرے بعد کوئی محقق و تذکرہ نگار اُس کو حاصل کر کے پیش کرے۔

بہار ــ منشی بانکے بہاری لال

بہار، دلّی کے ایک کائستھ خاندان کے فرد تھے اور مذہبی خیال کے حامل پڑھے لکھے اور مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دو مثنویاں لکھی تھیں ایک "زہرۂ زمین" اور دوسری "راماین"۔ صاحبِ "اردو کے ہندو ادیب" نے اُن کا حاشیہ میں صرف اتنا ہی ذکر کیا ہے اور "راماین" کے چند شعر بطور نمونہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پیش کیے ہیں۔ یہ "رامائن" میں نے دیکھی ہے۔ اور اس کا ذکر اس کتاب کے دوسرے حصہ میں کیا گیا ہے۔ لیکن "زہرۂ زمین" کا نہ تو کہیں پتہ ملا اور نہ اس کا کوئی نمونہ دیکھنے میں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ بہار ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ "رامائن" سے اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے کہ بہار مذہبی انسان تھے تو یقیناً یہ مثنوی بھی کچھ اسی قسم کی ہوگی۔ اب پتہ نہیں کہ انھوں نے "زہرۂ زمین" سے کون سی ذات مراد لی تھی؟

بیتاب — منشی جگیشور ناتھ ورما

بیتاب، بریلی کے مشہور وکیل ہیں۔ دورِ حاضر کے تمام تذکروں میں مختصراً اُن کا ذکر موجود ہے۔ بریلی کے شرفا میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اپنی شاعری اور مصوّری کے سبب وہ ادبی و فنّی دنیا میں کافی متعارف ہیں۔ شعر کا شوق انہیں کیسے ہوا؟ اس کے بارے میں خود اُن کا اپنا بیان یہ ہے:

"شعر گوئی کے جراثیم، مورث خاندان دیوان گنگا پرساد صاحب مرحوم کے پسر اکبر عوامی مرتبت رائے بیجناتھ صاحب مشتاق، میر منشی دربار اودھ و تحصیلدار ایسٹ انڈیا کمپنی، سے جو صاحب دیوان تھے، مجھ تک منتقل ہوئے ہیں۔ بڑے بھیّا حضرت راجیشور ناتھ زیبا مرحوم کے قرب سے یہ متعدی مرض لاعلاج ہوا اور انہیں کی بدولت مشاہیر کی صحبتیں میسر آئیں۔ آگے چل کر برق دہلوی جیسا خضرِ راہ دستگیر ہوا جس نے اس مرض کو پروان چڑھایا۔ ابتداً چھپ چھپ کر اشعار موزوں کیے مگر بھنڈا پھوٹ گیا۔ اس کے بعد میدانِ صحافت میں قدم رکھا اور غزلیں، نظمیں، مقالے، افسانے، افسانے، ناول، ناٹک، قطعات اور رباعیات سبھی کو تختۂ مشق بنایا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بیتاب نے اردو اور ہندی میں بہت کچھ لکھا ہے جو میرے موضوع سے باہر ہیں۔ جہاں تک "مثنوی" کا تعلق ہے، بیتاب نے دو مثنویاں لکھی ہیں۔ ایک کا نام "امر کہانی" ہے جس میں شری رام چندر جی کا قصہ بیان ہوا ہے۔ مگر وہ پوری "رامائن" نہیں ہے اس لئے میں نے اِسی حصۂ کتاب میں اُس کا ذکر کیا ہے اور دوسرے حصہ میں اُس کو جگہ نہیں دی۔ مجھے افسوس ہے کہ بیتاب نے اپنی قادرالکلامی کے باوجود اِس کو مکمل نہیں کیا اور "امر کہانی" کو "ادھوری کہانی" بنا کر چھوڑ دیا۔ نمونہ ہے: ؎

رقصاں تھا شیشہ نورِ نظر آئی خاک میں ؛: رگھوبر لئے تھے تیر و کماں دستِ پاک میں

بھاگا تھا مارتا ہوا اسپِ صبا کو لات ؛: پیچھے پڑی شکاری دنیائے بے ثبات

پھولی ہوئی شفق تھی کہ آنکھیں تھیں جور کی ؛: پتلی تھی یا شبیہہ دلِ ناصبور کی

"امر کہانی" پر ریویو کرتے ہوئے "ہماری زبان" (۱۵ اپریل) نے لکھا تھا:۔

"امر کہانی" کی تمام نظمیں جدید رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ زبان خالص ادبی اور ٹکسالی ہے۔ اندازِ بیان میں، بقول علی جواد زیدی مدیر "نیا دور" (لکھنؤ) ندرت اور سوز و گداز ہے۔ ہر مسدس، انیس، شعلہ اور چکبست سے ٹکر لیتا ہے اور سرتا پا فصاحت و بلاغت سے مملو ہے۔ از اول تا آخر صنعتوں کا ایسا حسین التزام ہے کہ داد دینا مشکل ہے۔ نئی نئی تشبیہات اور اچھوتے استعاروں نے نظموں میں چار چاند لگا دیے ہیں"

اصل یہ ہے کہ بیتاب "شاعر" بھی ہیں اور "مصوّر" بھی، مصوّری پر اُن کی کتاب "تاریخ فنِ مصوری" شائع ہو چکی ہے۔ لہٰذا لامحالہ اُن کے افکار سمع و بصر دونوں کو یکساں تکلیف کرتے ہیں۔ وہ شعر کہتے ہیں تو شعر نہیں کہتے بلکہ تصویر بناتے ہیں اور اُس میں ہر طرح کے رنگ بھرتے ہیں۔ وہ تصویر بناتے ہیں تو تصویر نہیں بناتے شعر کہتے اور اُس شعر کو "صوت" میں نہیں "صورت" میں قلمبند کرتے ہیں۔ اس لئے اُن کی تصاویر شعر ہوتی ہیں اور شعر تصویریں۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دوسری مثنوی "پری زاد" ہے۔ یہ دراصل مشہور کہانی شکنتلا ہے۔ چونکہ شکنتلا اندر کی ایک اپسرا کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور "اپسرا" کا مطلب "پری" ہے اس لئے اس مثنوی کا نام رکھنے میں بھی بیتاب نے جدت، ندرت اور انفرادیت دکھائی ہے۔ اور بہت حسین نام رکھا ہے شاید شکنتلا سے بھی زیادہ حسین۔

بیتاب کی یہ مثنوی دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ آن کا گونہ طبع زاد ہے۔ شکنتلا کی پیدائش کی روایت بڑی عجیب بھی ہے اور نہایت دلکش بھی۔ اس سلسلہ میں پوری کہانی تو میں اشک کی مثنوی کے سلسلہ میں بیان کر چکا ہوں، البتہ میں نے وہاں جس واقعہ کو "سازش" کا لقب دے کر چھوڑ دیا تھا اُسے یہاں بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ کہا جاتا ہے یا کہا گیا ہے کہ رشی وشوامتر نے جب نہایت سخت عبادت و ریاضت شروع کی تو جنت کے راجہ اندر کو اپنی پوزیشن خراب ہوتی نظر آئی۔ لہٰذا انھوں نے رشی وشوامتر کو اس شاہراہ سے بھٹکا دینے کے لئے ایک پری یا جنتی حور "مینکا" کو جو جنت کی تمام حوروں میں نہایت حسین و جمیل تھی، زمین پر بھیج دیا اور اُسے حکم دیا کہ وہ ہر طریقہ و انداز کو کام میں لا کر رشی وشوامتر کو ملوث کر دے۔ چنانچہ مینکا نے وشوامتر کے پاس پہنچ کر ناز و انداز کے سارے حربے استعمال کئے، جس کے نتیجے میں رشی وشوامتر اپنی راہ سے بھٹک کر مینکا کے ساتھ ملوث ہو گئے، جس کے نتیجے میں شکنتلا پیدا ہوئی۔ یہ تھی وہ "سازش" جس کا مظہر شکنتلا قرار پائی۔ چونکہ وہ ایک زمینی یا ارضی رشی کے نطفہ اور ایک جنتی یا سماوی حور کے بطن سے تھی اس لئے غیر معمولی حسن و جمال کی مالک تھی۔ اور اسی لئے بیتاب نے اُسے "پری" کہا ہے۔ اب مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ مینکا کے جنت سے نکل کر زمین پر پہنچتے ہی کائنات ارضی پر بہار آ جاتی ہے:۔

کارواں، گلشنِ فردوس سے، بو میں آیا ❊ گرد لا ابر، گہر بار نے اٹھ کر سایہ
پھول جیبوں میں صبا اور کہاں تک بھرتی ❊ چل پڑی شکوہ کوتاہیِ داماں کرتی

مینکا، وشوامتر کے سامنے کچھ اس طرح پہنچتی ہے کہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دیکھنے لگتی ہیں - منیکا کہتی ہے :-

دیکھئے کیا ہو؟ اکیلے ہی ادھر آئی ہوں :: جس پہ گلشن ہو فدا، وہ گلِ صحرائی ہوں
مدعائے دلِ معصوم تو معلوم نہیں :: کچھ غم تشنہ لبی کیف سے محروم نہیں
کچھ سمجھتے بھی ہو، کیوں فصلِ بہار آتی ہے :: سر بسر جھوم کے گردوں پہ گھٹا چھاتی ہے؟
کیوں تمنائیں جواں ہو کے حسیں ہوتی ہیں :: شوخیاں ساز کے پردے میں کہیں ہوتی ہیں!
شب کی دوشیزہ بہاروں کا تقاضا کیا ہے :: دل کی بے چین امنگوں کا اشارہ کیا ہے؟

پیدائشِ شکنتلا سے متعلق سنیئے :-

ماہتابے جو کفِ حسن میں لی انگڑائی :: چاندنی غنچہ صفت، برجِ حمل میں آئی
غنچۂ نور گندھا، برقِ گلِ خنداں میں :: اب قفس میں تھی پری اور پری زنداں میں

منیکا کو، جب اس کی وہ سہیلیاں جو جنت سے ساتھ آئی تھیں، واپس چلنے کہتی ہیں تو وہ جواب دیتی ہے :-

وسعتِ شوق کو نسبت نہیں پیمانے سے :: وہ گھٹا اور ہے، اٹھتی ہے جو میخانے سے
منزلِ عشق تھی زنجیر مرے بچپن کی :: خود اتر آئی ہے تصویر مرے بچپن کی
بڑھتی رہتی ہے شب و روز جو دولت یہی :: ہو گی جنت کوئی، گلزار کی جنت ہے یہی

مثنوی کا دوسرا حصہ جو کالیداس سے ماخوذ ہے، وہ دوسری بحر میں ہے راجہ دشینت شکنتلا کو دیکھ کر دل میں کہتا ہے :-

جھپکتی آنکھ کے پانی میں ضو فشاں ہے کنول :: رہینِ جنبشِ مژگاں ہے بجلیوں کا عمل
ریاضِ حسن کی رنگینیاں سمٹ آئیں :: چراغِ طور کو لو دے رہی ہے پرچھائیں
خمارِ بادۂ گلگوں ہے، چشمِ حیرت میں :: فروغِ جلوۂ رعنا ہے موجِ نکہت میں

راجہ دشینت، شکنتلا کے حمل کی جانب کس قدر لطیف اشارہ کرتا ہے :-

علاجِ خیرگیٔ زلفِ مشکبار کرو :: گہن سے چاند نکلنے کا انتظار کرو

شکنتلا دربارِ دشینت میں، ماں سے کہتی ہے :-

بپا ہے شورِ دلِ مبتلا میں طوفاں کا :: نکل رہا ہے جنازہ عروسِ ارماں کا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہوا، ہوا تو محبت کا خون ہونے دو : ہٹو، ہٹو، مجھے تہمت کے داغ دھونے دو

پوری مثنوی ایک مسلسل جواہر نگار ادبی تسبیح ہے۔

بیدل ــ منشی بہاری لال

صاحبِ "اردو مثنویاں" نے "انڈیا مطبوعات" کے حوالہ سے بیدل کی ایک مثنوی "پدم سماج اردو" کا ذکر کیا ہے جو ۱۳۰ صفحات پر بجنور سے ۱۸۸۵ء / ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ملک محمد جائسی کی "پدماوت" کا منظوم ترجمہ تھی، جس میں سنگلدیپ کے راجہ گندھر وسین کی حسین بیٹی پدماوت اور چتوڑ کے راجہ رتن سین کے عشق کا قصہ بیان ہوا ہے۔ نمونہ کہیں بھی نہیں مل سکا۔ نہ مثنوی کہیں دستیاب ہو سکی۔

بیصبر ــ منشی بال مکند لال

بیصبرؔ، سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد منشی کانجی مل سکندر آباد کے ممتاز کائستھ تھے۔ شاعری شروع کی تو منشی ہرگوپال تفتہ کے شاگرد بنے۔ جو سکندر آباد ہی کے رہنے والے تھے۔ پھر اُن ہی کی وساطت سے غالب کے شاگرد ہوئے۔ بقول صاحبِ "ہندو شعرا" انھوں نے ستر سال کی عمر پاکر ۱۸۹۰ء / ۱۳۰۸ھ میں انتقال کیا۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ مگر نہ تو کہیں کتاب ملی، نہ اُس کا نام معلوم ہوا۔ اور نہ کوئی نمونہ مل سکا۔ میرے بعد جو محقق اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے گا، شاید اُسے قارون کا یہ خزانہ مل جائے۔ بیصبر نہایت خوش گو شاعر تھے اور بقرینہ غالب اُن کی گمشدہ مثنوی عمدہ ہو گی۔ بیصبر کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

رخصت ہوا وہ، اشک ہمارے نکل آئے : خورشید کے چھپتے ہی ستارے نکل آئے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بیہوشؔ ۔ منشی گوردیال

لالہ گوردیال، لکھنؤ کے رہنے والے، کائستھ خاندان کے ایک مشہور و ممتاز فرد تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے خوش فکر شاعر مانے اور رکھے جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ بقول صاحبِ "ہندو شعرا" بیہوشؔ ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ تک بقیدِ حیات تھے۔ ڈاکٹر گیان چند نے رہنمائی فرمائی ہے کہ انھوں نے ایک مثنوی "کرشمۂ عشق" کے نام سے لکھی تھی جو ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں مطبع کارنامہ (لکھنؤ) سے شائع ہو گئی تھی۔ تقریباً آٹھ نو سو اشعار کی مثنوی ہے۔ نمونہ کے لیے "ماہ پارہ" کے سراپا کے یہ شعر پیش کیے ہیں۔ قدیم رنگ غالب ہے اور لکھنؤ اسکول والی صفت بھی اس میں موجود ہے:۔

صورت میں قمر، جلال میں مہر ٭ بیدرد و جفا شعار و بے مہر
زلف اس کی ہے شام روزِ شامت ٭ قد فتنۂ حشر کی علامت
رفتار سے اُس کے سرو، پامال ٭ منہ غنچے کا اُس کے سامنے لال

تمناؔ ۔ منشی رام سہائے

تمناؔ، لکھنؤ کے ایک ممتاز کائستھ خاندان کے فرد اور نہایت مشہور و معروف شاعر ہیں۔ ان کے جدِ اعلیٰ منشی اودے راج مطلعؔ لکھنوی فارسی زبان کے اچھے شاعر تھے۔ مطلعؔ کے لڑکے منشی ایشوری پرشاد شعاعؔ، جو تمناؔ کے دادا تھے، فارسی زبان کے عمدہ انشا پرداز اور شاعر تھے۔ تمناؔ کے والد منشی پورن چند ذرّہؔ لکھنوی شاعر ضرور تھے مگر ان کی شہرت اپنے اخبار "تمنائی" کے ذریعہ ہوئی۔ ذرّہؔ لکھنوی کے تین لڑکے تھے اور تینوں آسمانِ شاعری کے درخشاں ستارے بن کر چمکے:۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(۱) منشی رام سہائے تمنّاؔ لکھنوی - وفات ۱۹۳۲ء / ۱۳۵۱ھ

(۲) منشی ماتا پرشاد نیساںؔ لکھنوی - وفات ۱۹۳۸ء / ۱۳۵۷ھ

(۳) منشی دوارکا پرشاد اُفقؔ لکھنوی - وفات ۱۹۱۹ء / ۱۳۳۱ھ

ان ہی اُفقؔ لکھنوی کے لائق بیٹے اور اردو کے نامور شاعر منشی بشیشور پرساد منورؔ لکھنوی ہیں۔

تمنّاؔ لکھنؤ کے قدیم محلہ نوبستہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۴ء / ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی اور انگریزی کے قابل اسکالر تھے۔ محکمۂ تعلیم میں نوکر تھے اور ڈپٹی انسپکٹر ہو کر ریٹائر کئے۔ شاعری میں اپنے ماموں منشی شنکر دیال فرحتؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ تمنّاؔ نے کافی عمر پاکر ۱۹۳۲ء / ۱۳۵۰ھ میں انتقال کیا۔

تمنّاؔ نہایت صاحب علم اور اردو کے پرستاروں میں سے تھے۔ انھوں نے ایک اردو رسالہ بھی "دربار" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کے مدیر وہ خود تھے، جو ان کے اپنے "مطبع تمنائی" میں چھپتا تھا۔ قومی خدمت کا بھی گہرا جذبہ رکھتے تھے۔ ؎

کمسنی گذری، جوانی گذری اب پیری ہوئی
پھر بھی اب تک خدمتِ قومی کو میں تیار ہوں

تمنّاؔ نے متعدد مثنویاں لکھیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) رہس پنج ادھیائے --- اس مثنوی میں کرشن جی کی لیلا کا ذکر پانچ ادھیائے میں کیا گیا ہے۔

(۲) رام لیلا ——— اس میں رامؔ اور لچھمن کے بن باس ہونے کا ذکر ہے۔

(۳) گیتا ——— اس مثنوی کا ذکر حصہ دوم میں کیا گیا ہے۔

(۴) گلزارِ فرنگ ——— یہ مثنوی ترجمہ ہے شیکسپیر کے شہرۂ آفاق ڈرامہ "رومیو جولیٹ" کا۔

(۵) گلگشتِ باغِ لکھنؤ۔ اس مثنوی میں ملکہ وکٹوریہ کے ولی عہد کی لکھنؤ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں آمد کا بیان ہے۔

(۶) شبنلستانِ حیرت — اِس مثنوی میں مہاراجہ اسد جنگ بہادر، وزیر نیپال کی وفات اور اُن کی رانیوں کے ستی ہونے کا بیان ہے۔

(۷) شکار نامہ — اِس مثنوی میں اسد جنگ بہادر کے شکار کے حالات نظم ہوئے ہیں۔

(۸) سلکِ مروارید — اس مثنوی کے بارے میں منوّر صاحب نے مجھے بتایا کہ ہے ضرور مگر وہ ڈاکٹر گوری سرن سکسینہ کے قبضہ میں ہے۔

(۹) نظمِ دلپذیر — اس مثنوی میں مہاراجہ بلرام پور کے حالات منظوم ہوئے ہیں۔

"رام لیلا" میں سے اِس موقع کے اشعار ملاحظہ ہوں جبکہ راون کے ساتھ پہلی جنگ ہوئی تھی:-

شمشیر صفت قلم چلا ہے ∴ ہے فتح نصیب رد بلا ہے

چمکا جو فلک پہ مہرِ خاور ∴ جاگ اٹھا وہ راونِ دلاور

سب صاحبِ زور، بہرِ پیکار ∴ تھے شوکت و شان سے گرم رفتار

نقارۂ فوج نے صدا دی ∴ دشمن کی عیاں ہے نامرادی

اتنے میں بڑھا عدو کا لشکر ∴ یعنی شہِ تند خو کا لشکر

اک ایک وہ راکھشش زبردست ∴ جس کے قامت سے چرخ تھا پست

وہ طرز، وہ خوفناک صورت ∴ وہ شیوۂ زشت وجہِ کدورت

دونوں لشکر جو ہو گئے وصل ∴ تھا جلوۂ روزِ حشر، دراصل

راون نے جو حالِ جنگ دیکھا ∴ لوگوں کو بہ حالِ تنگ دیکھا

کرنے لگا فکرِ سحر و جادو ∴ اڑنے لگا سنگ تیر، ہر سو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ظاہر وہ کبھی، کبھی ہوا گم ÷ تھا سحر طلسم کا تلاطم
خود صورتِ شیر بڑھ کے آیا ÷ فوجِ "میموں" پہ چڑھ کے آیا

کہا جاتا ہے کہ رام چندر جی کا لشکر "بندروں" پر مشتمل تھا جس کے سردار "ہنومان" تھے۔ "میمون" کے معنی "بندر" کے بھی ہیں۔ لہٰذا جو لوگ بندروں ہی کے قائل ہیں اُن کے لئے بھی ٹھیک ہے۔ دوسرے معنی "مبارک" کے ہیں۔ انسانوں کا لشکر ماننے والوں کے لئے بھی یہ لفظ ٹھیک ہے۔

جگر۔ شیام موہن لال

جگرؔ، بریلی کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ یہ رائے کنہیا لال دلؔ بریلوی کے چوتھے صاحبزادے ہیں۔ ۱۸۹۰ء/۱۳۰۷ھ میں بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۱ء/۱۳۲۹ھ میں میٹرک اور ۱۹۱۶ء/۱۳۳۴ھ میں بریلی کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء/۱۳۳۶ھ میں نائب تحصیلداری سے ملازمت کی ابتدا ہوئی۔ پنشن پا کر آجکل میرٹھ میں مقیم ہیں۔ ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ میں شاعری شروع کی۔ جلیلؔ مانکپوری، شوکتؔ میرٹھی اور عزیزؔ لکھنوی سے فخرِ تلمذ رہا۔ انہیں اردو دنیا میں روشناس کرانے کی ضرورت نہیں، اِس لئے کہ جگرؔ نے خادمانِ اردو میں اپنا ایک ایسا مقام پیدا کر لیا ہے جو اُن کی وفات کے بعد بھی، کوئی اُن سے نہ چھین سکے گا۔ وہ بڑے قادر الکلام شاعر اور اعلیٰ درجے کے ناظم ہیں۔

جگرؔ کی مشہور مثنوی "پیامِ ساوتری" ہے، جو گلزارِ نسیم کی بحر میں چودہ سو اشعار کی طویل اور ۱۹۳۰ء/۱۳۴۹ھ کی تصنیف ہے اور جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہو گئی تھی۔ اِس مثنوی میں جو قصہ نظم ہوا ہے، اُس کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا ہے کہ مہابھارت سے ماخوذ ہے۔ رشی مارکنڈے نے یہ قصہ یدھشٹر کو، خانہ دار عورت کی صفات کے بیان میں سنایا تھا۔ قصے کا پلاٹ بالکل معمولی ہے مگر ساوتری کے کردار میں جو غیر معمولی ثبات، پامردی اور جرأت ہے، اُس کی بنا پر یہ قصہ بہت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مقبول رہا ہے۔ ہندوؤں میں ہر سال "براماوس" کے تیوہار پر عورتیں اِس قصے کو سنتی اور سناتی ہیں جس کا مقصد پاکبازی و وفاشعاری کے اوصاف سکھانا ہے۔ اس قصہ کو جگر کے سوا اور کسی نے نظم نہیں کیا۔ ابتدا حمد سے ہوئی ہے مگر جدت طرازی کا اظہار بھی یہیں سے شروع ہو جاتا ہے :-

تخلیق ہوئی تھی جب بشر کی ÷ حیران تھا جس طرف نظر کی
جو دفترِ کائنات دیکھا ÷ نیرنگِ عجائبات دیکھا
جب عقل و خرد نے پر نکالے ÷ دفتر دنیا کے دیکھ ڈالے
مجبور ہوا جو ہو کے ششدر ÷ سر عجز رکھ دیا زمیں پر
کہنے لگا اے مدارِ قوت ÷ اے جوہرِ کائنات و فطرت
آتا نہیں تو سمجھ میں کیا ہے؟ ÷ لیکن یہ یقین ہے، بڑا ہے
قدرت نہیں کوئی تیری محدود ÷ کیونکر نہ بنائیں تجھ کو معبود؟
سر عجز سے خم ہے، تیرے آگے ÷ خاموش قلم ہے، تیرے آگے

مناجات بھی دلپذیر ہے :-

جب سے مجھ کو شعور آیا ÷ جب سے آنکھوں میں نور آیا
بازارِ جہاں کو خوب دیکھا ÷ ارزاں کو، گراں کو، خوب دیکھا
دولت ہے تو ہے سخن کی دولت ÷ عزت ہے تو ہے سخن کی عزت
یہ کان میں کہہ گیا ہے ساقی ÷ فانی ہے بغیر سخن ہے باقی
اے خالقِ جوہرِ معانی ÷ سرچشمۂ فیضِ جوش بیانی
رحمت سے مجھے نہال کر دے ÷ دامانِ سخن گہر سے بھر دے

آغازِ قصہ بھی بالکل جدید انداز سے ہوا ہے :-

ست جگ کا نہیں یہ ہے فسانہ ÷ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ
طفلی کا تھا کائنات کا عہد ÷ جو طور تھا مادہ کا تھا طور
بھولے تھے لوگ، بچے جیسے ÷ سیدھے سادے، زبان کے سچے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھولی تھیں عادتیں، زندگی کی ؛ معصوم تھی عقل آدمی کی
آپس میں بشر تھے بھائی بھائی ؛ یکساں تھی نگاہ میں خدائی

اِس شعر کو پڑھتے ہی چکبستؔ مرحوم کا یہ شعر از خود زبان پر آگیا:۔

غرورِ جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

ساوتری کو جگرؔ کی آنکھ سے دیکھئے:۔

طفلی تھی شباب کے اثر میں ؛ ملتی تھی چاندنی سحر میں
چہرہ، کہ کنول کھِلا ہوا تھا ؛ یا پھول کوئی گلاب کا تھا
بوٹا سا وہ قد، بدن سنہرا ؛ کندن سا دمک رہا تھا چہرہ
وہ آنکھ کا حسن روح پرور ؛ بھونرا سا کنول کی پنکھڑی پر
وہ بارِ حیا کہ جھک گئی آنکھ ؛ نرگس کی تھی نیم وا کلی آنکھ
تھا لعلِ لب اِس طرح نمایاں ؛ گلنار کی جیسے سرخ کلیاں

نمودِ صبح کا ایک باکیف منظر ملاحظہ ہو:۔

تاروں کی ہے چھاؤں کچھ اندھیرا ؛ ہوتا چلا آتا ہے سویرا
تارے ابھی جھلملا رہے ہیں ؛ چھپنے کو ہیں، ٹمٹما رہے ہیں
تاریکی میں نور کے ہیں آثار ؛ پردے میں جھلک رہے ہیں انوار
سناٹا فضا میں چھا رہا ہے ؛ فطرت کو کچھ انتظار سا ہے
کیا نور و سرور کا سماں ہے ؛ رحمت کے ظہور کا سماں ہے
منہ دیکھتا ہے اثر، دعا کا ؛ ہے وقت قبولِ التجا کا

خوب شعر ہے۔ صبح کے بارے میں جوشؔ ملیح آبادی کا تو کہنا ہے کہ:۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو، ثبوتِ حق کے لئے
اگر "رسول" نہ ہوتے تو "صبح" کافی تھی

جگرؔ نے "کرشن سداماں" "پریم کہانی" "انتظار" اور "بہشتی رُوداد" کے عنوان

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے اور بھی چار مثنویاں لکھی ہیں، مگر "پیام ساوتری" ہی اُن کی عظمت شاعری کی ضامن ہے۔ مسٹر وریندر پرشاد سکسینہ کا خیال ہے کہ:-

"پیام ساوتری" میں بظاہر سیتہ وان اور ساوتری کا افسانہ نظم کیا گیا ہے مگر بہ باطن افسانہ کے پیرایہ میں بڑے اخلاقی و روحانی مسائل پر بحث کی گئی ہے جن میں یقین و عمل خاص موضوع ہیں"

مسٹر سکسینہ، ادبی حیثیت سے "پیام ساوتری" کے سامنے "سحرالبیان" "گلزار نسیم" اور "زہر عشق" سب کو ہیچ سمجھتے ہیں جس کی وجہ بقول اُن کے یہ ہے کہ:-

"نہ ہی زہر عشق، گلزار نسیم اور سحرالبیان کی طرح اِس میں وہ حصہ ہیں جن سے تہذیب شرماتی ہے"

میر لوئی نے کیا مزے کی بات کہی تھی کہ:-

"شاعر، مصنف اور مدبّر، اپنی اعلےٰ ذہانت کے باوجود، پرانے افسانہ کی شاہانہ بردباری کو، سیہ کاری کا لقب نہیں دیتے"

سکسینہ صاحب نے شاید مثنوی "زہر عشق" کبھی دیکھا یا پڑھا ہی نہیں ہے ۔ "زہر عشق" میں سے ایک شعر بھی، کبھی بھی ایسا نکال کے دکھایا ہی نہیں جا سکتا جس سے تہذیب شرمائے۔

جنوں ۔ چندر کا پرشاد

صاحب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بتایا ہے کہ جنوں نے ایک مثنوی "پند نامہ پُر فنون" کے نام سے لکھی تھی جو مہدی علی خاں قبول کے اہتمام سے لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۱۳ صفحے تھے جن میں تقریباً ساڑھے چار سو اشعار ہوں گے۔ یہ مثنوی عبرت و نصائح پر مشتمل ہے۔ ابتدا یوں ہوئی ہے:-

شکرِ حق، حق ہے بجالائے بشر ۔ عقل اول سے دئے علم و ہنر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جوؔہر — رائے جواہر سنگھ

جوؔہر، رائے بختیاور سنگھ راقمؔ لکھنوی کے بیٹے اور منشی رائے بہاری لال کے پوتے ہیں، جو لکھنؤ کے محلہ پورن ٹولہ میں مشہور تھے۔ ان کے چچیرے دادا منشی رائے منولال صفاؔ لکھنوی اپنے عہد کے اچھے فارسی کے شاعر تھے۔ جوؔہر صاحبِ علم بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنی تاریخ ولادت خود کہی ہے جو نہایت دلچسپ ہے:-

وجودِ جوہر آمد نکو فال
پیغمبرِ نختیں چہار دہ سال

"پیغمبر" کے اعداد از روئے ابجد ۱۲۵۴ ہوتے ہیں، اس سے چودہ سال پیشتر، یعنی ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء سالِ ولادت ہے۔ جوؔہر کائستھ قوم کے فرد تھے اس لئے حسب دستور اردو اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ دو شعر انھوں نے لطیف فرمائے ہیں:-

فیضِ انوارِ ازل حصہ میں ہے اوّل ہے ٭ جملہ مخلوق سے پہلے ہوئے "ہندو" پیدا
شکلِ آئنہ گزر خلوتِ اصنام میں ہے ٭ شکرِ خالق ہے کہ جوہرؔ ہوئے "ہندو" پیدا

صاحبِ "اردو کے ہندو ادیب" نے جوؔہر کے اِس شاعرانہ دعویٰ و بیان پر اعتراض کیا ہے کہ ساری مخلوق میں پہلے "ہندو" پیدا ہوئے، محض شاعری نہیں تو اور کیا ہے؟ ناظر کاکوروی خود اچھے شاعر ہیں اور جانتے ہیں کہ جوؔہر نہایت صاحبِ علم شاعر تھے، پھر حیرت ہے کہ انھوں نے جوؔہر پر کیوں ایسا اعتراض کر دیا؟ "ہندو" سے جوؔہر کی مراد "ہندو مذہب" ماننے والا نہیں، بلکہ "ہندوستان کا رہنے والا" ہے، اِس معنی کر ہم، وہ سب ہی "ہندو" ہیں۔ ہر ہندوستانی "ہندو" ہے چاہے اُس کا عقیدہ و مذہب کوئی بھی ہو۔ دراصل اِس قطعہ میں اِس عام روایت کی طرف شاعرانہ اشارہ ہے کہ حضرتِ آدم جنت سے کوہِ سراندیپ پر یعنی ہندوستان کی سرزمین پر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اتارے گئے تھے - ظاہر ہے کہ جب آدم و حوا نے پہلے پہل ہندوستانی سرزمین پر قدم رکھا اور ان ہی سے نسلِ انسانی چلی تو جملہ مخلوق سے پہلے "ہندو" یعنی "ہندوستانی" نہیں پیدا ہوئے یا کیا "یورپین" پیدا ہوئے ؟

جوہر نے فارسی میں گل محمد خاں ناطق سے اور اردو میں امام بخش ناسخ سے رشتہ تلمذ جوڑ رکھا تھا - مگر ان کی فارسی شاعری پر اردو شاعری حاوی ہوگئی - اور اسی میں نام پیدا کیا - لکھنؤ کی شاہی سرکار سے وابستہ تھے - جب اودھ کی حکومت ختم ہوگئی تو وہ مہاراجہ سر درگبجے سنگھ والیٔ بلرام پور سے وابستہ ہوگئے - اور وہیں اپنی عمر گزار دی - ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں انتقال فرمایا -

جوہر کا رجحانِ طبع ، وحدانیت اور تصوف کی طرف بطورِ خاص تھا - اور وہ خواجہ اجمیری کے بہت عقیدت مند تھے - انہوں نے بقول صاحب "ہندو شعرا" پانچ دیوان یادگار چھوڑے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں -

جوہر نے تین مثنویاں لکھی تھیں - پہلی "جوہرِ افلاک" دوسری "جوہرِ ادراک" اور تیسری "شکار نامہ" جس میں شاہزادہ اڈنبرا کے شکارِ ہاتھی کے حالات قلمبند کیے گئے تھے - اول الذکر دونوں مثنویوں میں قیافہ و نجوم کے مسائل کو نظم کیا گیا تھا - مگر کسی کا بھی نمونہ دستیاب نہ ہو سکا -

جہانگیر - کیسرا سنگھ

صاحب "اردو مثنویاں" نے فرمایا ہے اور صحیح فرمایا ہے کہ "سسی پنوں" کے قصے کو شمالی مغربی ہندوستان میں وہی اہمیت حاصل ہے جو "ڈھولا مارو" کو راجستھان میں یا "مادھونل" اور "کام کندلا" کو بہار میں - سندھ ، کچھ ، بلوچستان اور پنجاب میں یہ قصہ بچے بچے کی زبان پر ہے - سندھی عوام میں تو "سسی پنوں" کو اولیا کا مرتبہ حاصل ہے - لیکن اس کے باوجود پنجاب میں جو اسے قبولِ عام کا شرف

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

حاصل ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ وہاں بعض مقامات پر لوہڑی کے دن اب بھی "سسی پنوں" کا سوانگ رچایا جاتا ہے اور عوام ہاشم کی پنجابی "سسی پنوں" گاتے ہیں۔ پنجابی میں "سسی پنوں" کا قدیم ترین نسخہ سندر لال آرام کا ہے لیکن جو اہمیت ہاشم کی "سسی پنوں" کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔ بعد کے اکثر و بیشتر ترجمے ہاشم ہی کو بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں۔

موصوف نے قصہ کی نوعیت بھی تفصیل سے بیان کی ہے کہ بھن بھور کے بادشاہ کے گھر "سسی" نام کی ایک لڑکی بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوئی مگر شاہی منجموں نے بتایا کہ یہ لڑکی جوان ہو کر عشق و محبت میں گرفتار ہو کر شاہی خاندان کو بدنام کر دے گی۔ لہذا اُسے ایک بکس میں رکھ کر پانی میں بہا دیا گیا جسے "اتّا" نام کے ایک دھوبی نے نکالا۔ وہ دھوبی لاولد بھی تھا اور لڑکی کے ساتھ بکس میں خزانہ بھی تھا اس لئے دھوبی بہت خوش ہوا اور اس نے بڑے لاڈ پیار سے "سسی" کی پرورش کی۔ "سسی" جوان ہوئی تو دھوبیوں نے اُس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اُس سے شادی کرنی چاہی مگر "سسی" کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ شاہزادی ہے اِس لئے اُس نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ بات مشہور ہوئی تو بادشاہ کو بھی ساری حقیقت معلوم ہو گئی۔ بادشاہ نے اُسے اپنے گھر تو نہیں بلایا مگر دریا کنارے ایک محل بنوا کے شاہانہ انداز سے اس کے رہنے کا نظم کر دیا۔ اِسی محل میں رہتے ہوئے ایک سوداگر کے پاس، جو اُس کے محل کے باغ میں دوسرے سوداگروں کے ساتھ فروکش تھا، "کیچ" کے شاہزادے "پنوں" کی تصویر "سسی" نے دیکھی اور وہ اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ اگلے سال اُس نے کیچ کے سوداگروں کے ذریعہ "پنوں" کو دعوتِ ملاقات دی اور چونکہ ہونا یہی تھا اِس لئے ساری شاہی ممانعت کے باوجود "پنوں" بھن بھور پہنچ گیا۔ "سسی" سے ملاقات ہوئی اور بالآخر دونوں شیر و شکر ہو گئے اور "پنوں" یہیں رہ پڑا۔ آخر پنوں کے بھائی آئے اور دھوکا سے بیہوش کر کے "پنوں" کو لے بھاگے۔ "سسی" کو خبر ہوئی تو وہ دیوانہ وار کیچ کی طرف چل پڑی۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اور پیدل لمبے سفر کی تاب نہ لاکر راستہ ہی میں مرگئی جسے ایک گڈریئے نے دفن کر دیا۔ اُدھر جب "پُنّوں" کو ہوش آیا تو وہ بھی اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر بھنبھور کی جانب چل پڑا۔ سرِ راہ ایک نئی قبر دیکھ کر جھجکا اور بالآخر اُس گڈریئے نے بتایا کہ ایک دیوانی کی یہ قبر ہے جو "پُنّوں پُنّوں" کی رٹ لگاتے لگاتے مر گئی۔ یہ جانکاہ خبر سن کر "پُنّوں" نے ایک لمبی آہ کھینچی اور وہیں ڈھیر ہو گیا جسے اُسی گڈریئے نے سسّی کے بغل میں دفن کر دیا۔ چونکہ اس قصہ میں محبّت و وفا کی پوری شدّت دکھائی گئی ہے اور خاتمہ المیہ ہے اس لئے درد مند شعرا نے اس قصہ میں بڑی دلچسپی لی ہے جس کی تفصیل صاحبِ "اردو مثنویاں" نے بہ وضاحت پیش کی ہے، جو ہرنام سنگھ شان کے مقدمہ سسّی ہاشم سے ماخوذ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے شان کی تحقیق کے مطابق، اپنی کتاب میں "سسّی پنّوں" کو منظوم کرنے والوں میں ایک مثنوی جہانگیر کی بھی ظاہر کی ہے، مگر انھوں نے کوئی نمونہ نہیں پیش کیا ہے۔ شان کی مرتبہ "سسّی ہاشم" پر دسترس حاصل نہ ہو سکا اس لئے پتہ نہیں شان نے بھی اپنے مقدمہ میں اس کا کوئی نمونہ دیا ہے یا نہیں۔

جھمّن۔ منشی جھمّن لال

جھمّن کا ذکر، شمالی ہند کے سب سے پہلے ہندو مثنوی نگار کی حیثیت سے "مقدمہ" میں کیا جا چکا ہے۔ اُن کا آبائی وطن دِلّی تھا۔ ان کے بزرگ سرکار شاہی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔ ان کے بڑے بھائی، ضابطہ خاں کے یہاں میر منشی تھے۔ جھمّن حسب دستور اردو فارسی دونوں زبانوں کے خوش فکر شاعر تھے۔ خواجہ میر درد (وفات ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۵ء) کے شاگرد تھے۔ تذکرہ "گلشنِ بیخار" میں اُن کو "تازہ فکر و کہنہ مشق" شاعر کہا گیا ہے کریم الدین اور ڈاکٹر فیلن کے تذکرہ میں بھی اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں اور فنّی کمالات کا کافی ذکر ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے اشعار میں صنائع و بدائع استعمال کرتے تھے۔ کسی کی ہجو بھی کرتے تھے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تو اس حسن و ملاحت سے کرتے تھے کہ وہ بظاہر مدح معلوم ہوتی تھی۔ بعض کی ہجو اس طرح کی ہے کہ ہر مصرع سے اگر ایک ایک حرف لیا جائے تو ممدوح کا نام نکل آتا ہے۔ اور ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔ صاحب "تذکرہ" نے لکھا ہے کہ چمن نے اپنی مثنوی "بہار دانش" کو :۔

"عجب طرح منظوم کیا ہے کہ لائق دیکھنے کے ہے"

نمونہ کہیں نہیں مل سکا جس کا افسوس ہے۔

چمن۔ منشی رنگ لال

امام بخش ناسخ کے شاگرد منشی رام سہائے رونق لکھنوی (وفات ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۴ء) کے تلامذہ میں سب سے زیادہ مشہور چمن لکھنوی ہوئے ہیں۔ اُن کا ننہالی خاندان فنِ شاعری میں لکھنؤ کا ممتاز خاندان سمجھا گیا ہے۔ چمن اپنے دور کے شیریں بیان سمجھے گئے ہیں۔ انھوں نے ایک مثنوی "سنگھاسن بیتی" کے نام سے لکھی تھی جس کے بارے میں صاحب "تذکرۂ شعرائے ہنود" نے لکھا ہے کہ :۔

"عجب دلچسپ اور دلآویز مثنوی ہے"

"سنگھاسن بیتی" ادبی دنیا کی ایک شہرۂ آفاق کہانی اور سنسکرت زبان کی ایک مستقل کتاب ہے۔ ہندو میتھولوجی کے مطابق اس سے مراد وہ تختِ زریں ہے جو بہشت کے راجہ چندر کرن سے منتقل اور عطا و بخشش ہوتا ہوا، ۵۷ قبل مسیح میں راجہ بکرماجیت کو عطا ہوا تھا اور جس میں ۳۲ حورانِ جنت سنگی پتلیوں کی صورت میں مقید تھیں۔ میں اس قصہ کا تفصیلی ذکر آرام شاہجہاں آبادی کے ذکر میں کر چکا ہوں۔

"سنگھاسن بیتی" اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی مقبول کتاب ہے اور بہت سے ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں نے اس کے منظوم و منثور ترجمے کئے ہیں۔ چمن نے بھی اس مشہور نام کہانی کو مثنوی کی شکل میں نظم کیا ہے جو سلیس اور رواں ہے :۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

الٰہی! سبز کر میرے سخن کو ٭ بہار بے خزاں دے اس چمن کو
مرے خامہ کو دے طوطی کی منقار ٭ رہے تا حشر میں تیرے شکر بار
زباں گلبانگ وحدت سے ہو یکسر ٭ برنگ عندلیب نغمہ پرور
تری نکہت سے ہر گل میں ہے خوشبو ٭ تری قدرت سے بلبل ہے سخن گو

"ساقی نامہ" خالص ایرانی چیز ہے کیونکہ ایرانی، زندگی کے بڑے شیدا اور رومان کے متوالے تھے۔ تقشف اُن کی اُفتادِ طبع اور مزاج کے خلاف تھا۔ اُن کا مطمح نظر ہی "خورد و نوش کن خوش باش" تھا۔ اردو میں یہ چیز نہ چلی، تاہم چمن پرانے ٹائپ کے آدمی تھے، انھوں نے ساقی نامہ لکھا ہے: ؎

ظہورِ فصلِ گل ہے اتفاقی ٭ کہاں میں اور کہاں پھر تو ہے باقی؟
عطا کردہ شرابِ ارغوانی ٭ کہ دے پیری میں وہ لطفِ جوانی
خمِ گردوں ہے تا دنیا میں باقی ٭ رہے عالم میں تیرا دور ساقی
شرابِ تلخ سے شیریں دہاں کر ٭ عنایت سے مجھے عذبُ اللساں کر

چمن — منشی شادی لال

یہ چمنؔ، بھتیجے ہیں منشی رام سہائے رونقؔ لکھنوی کے، جو اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے بڑی شہرت کے مالک ہوئے ہیں۔ چمنؔ، بڑی صلاحیت کے انسان تھے۔ زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۵ء میں ایک مثنوی "الف لیلہ" منظوم کے نام سے لکھی تھی۔

"الف لیلہ" بجائے خود ایک دلچسپ موضوعِ گفتگو ہے۔ اور "چھنے منہ آتی باتیں" کے مصداق اِس کتاب کے سلسلہ میں عجیب عجیب راتیں مذکور ملیں گی۔ ساسی کہتا ہے کہ "الف لیلہ" میں کوئی عنصر ایرانی یا ہندی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے مسعودی اور ابن الندیم کا خیال ہے کہ یہ خالص ایرانی چیز ہے اور فارسی زبان کی کتاب "ہزار افسانہ"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کا ترجمہ ہے۔ نولڈکی، اوسٹروپ اور فناون نے بہ تفصیل بتایا ہے کہ اس کا کون سا افسانہ فارسی سے آیا ہے، کون سا سنسکرت سے اور کون سا عربی سے؟ عام خیال یہ ہے کہ دراصل "الف لیلہ" کے افسانوں کا موضوع سنسکرت سے مستعار ہے اور یہ کتاب پہلے پہل فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اور تیسری صدی ہجری میں اسے عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ بعد میں کچھ افسانے اس میں اور بھی شامل کیے گئے۔

اس کے سنسکرت سے لیے جانے کا ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے افسانوں کا پلاٹ خالص ہندوستانی ہے۔ مثلاً دو شہزادوں کی بیویوں کی بے وفائی جس پر کتاب کی بنیاد ہے، بالکل "کتھا سرت ساگر" سے ملتی جلتی ہے۔ یا ایک قصہ کو نا تمام چھوڑ کر دوسرا قصہ شروع کر دینا، یا باقی قصے کو دوسرے دن پر ملتوی کرنا بالکل ہندی ترکیب ہے اور مہابھارت یا پنچ تانتر کا سا انداز رکھتا ہے۔

اس کے ماخذ کے فارسی ہونے کا ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے نام فارسی ہیں مثلاً شہریار، شاہ زماں وغیرہ۔ بہر حال! میرا اپنا خیال یہ ہے کہ دراصل یہ ہندوستانی چیز ہے اور چونکہ اہلِ ایران بھی آریہ قوم ہی کی ایک شاخ ہیں اور ان کا ادب و مذہب میں لین دین رائج تھا، اس لیے یہاں سے یہ قصے ایران گئے اور فارسی میں ترجمہ ہوئے اور جب ایران، عربوں کے تسلط میں آیا اور استحکامِ سلطنت کے بعد فارسی ادب کا مطالعہ شروع ہوا تو وہاں سے یہ قصے عربی میں لیے گئے۔ اور وہیں سے اس کتاب کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ قصہ گوئی اور داستان سرائی عربوں کے مزاج اور مذاق کے خلاف ہے اس لیے ابتداً یہ کتاب عرب میں لکھی نہیں جا سکتی تھیں۔ ادب میں عربوں کا مذاق، سوائے شعر گوئی کے اور کچھ نہ تھا، چاہے وہ طربیہ ہو یا حزنیہ۔ فخریہ ہو یا ہجویہ۔ ایرانی مطلقاً داستان سرا اور قصہ گو تھے مگر "الف لیلہ"، کا جو انداز ہے وہ اہلِ ایران کا نہیں تھا کہ وہاں ایسی کتاب لکھی جاتی۔ یہ ہندوستان اور صرف ہندوستان ہے جہاں اصلاحی نقطۂ نظر سے کہانیاں انسانوں، جانوروں اور پرندوں کی زبان سے ادا کرائی جاتی تھیں اور قصہ در قصہ کا انداز تو دنیا میں سوائے ہندوستان کے اور کسی ملک کا نہیں تھا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لہذا بلاشک و ریب یہ خالص ہندوستانی چیز ہے البتہ اس کتاب کی شہرت عربوں کے ذریعہ ہوئی اور آج بھی وہ "الف لیلہ" ہی کہی جاتی ہے۔ چمن کی مثنوی کا نمونہ یہ ہے ؎

کدھر ہے ساقی میکش کدھر ہے ؛ طبیعت کچھ ہماری جوش پر ہے
بہت جلدی صراحی بھر کے مے لا ؛ کہ تا ہو نظم نثرِ "الفِ لیلا"
خوشی سے تیری، ساقی ہے ہمیں کام ؛ نہ دے تو دوسرا، بس ایک ہی جام
ہوس نے بے طرح ہے مجھ کو گھیرا ؛ پلا دے ساقی ہوں میں مشتاق تیرا

مثنوی بیجا نہیں ہے۔

چمن ـــ منشی سیتا پرشاد

ڈاکٹر گیان چند نے گارساں دتاسی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ سیتا پرشاد متخلص بہ چمن تھے، جو میرٹھ کے رہنے والے تھے، ۱۸۷۷ء میں ایک مثنوی "گلزارِ چمن" کے نام سے لکھی تھی۔ مگر مجھے اور خود انھیں بھی اِس مثنوی کا کوئی نمونہ کہیں نہیں ملا۔

حزیں ـــ منشی گوپال سہائے

مردم خیز ارضِ پنجاب کے ضلع مظفر نگر میں ایک گاؤں بودھانہ ہے، جہاں سے بعض اہلِ کمال پہلے بھی اٹھ چکے ہیں۔ مثلاً بندسیری پرشاد، شاد، گیارہویں صدی میں فارسی کے زبردست اور مشہور شاعر گزرے ہیں۔ حزیں بھی اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ اردو فارسی دونوں زبانوں پر قادر تھے۔ حزیں نے "موجۂ غم" اور "نالۂ حزیں" کے نام سے دو مثنویاں لکھی ہیں۔ "موجۂ غم" میں انھوں نے بتایا ہے کہ میری زندگی کے دو سال تھے۔ اِس کا ذکر منشی درگا پرشاد شری بڑھانوی سے آیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ: ؎

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دو نام سے مثنوی اگر ہو :: کر جان یقیں کہ کچھ نہ ڈر ہو

پہلی کا ہو نام "موجۂ غم" :: اور "نالۂ حزیں" ہو جزوِ دوم

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ "موجۂ غم" المیہ مثنوی ہے اور "نالۂ حزیں" طربیہ۔ ان کی ٹریجیڈی، ان کی کامیڈی سے بہتر ہے۔ "موجۂ غم" یوں شروع ہوتی ہے:-

آغازِ سخن بنامِ خلاق :: پیدا کیا جس نے "کن" سے آفاق

اس شعر میں "کن" سے خلاقِ عالم کے آفاق پیدا کرنے کی بات بیان کی گئی ہے۔ غور کیجیے، اس دور کے ہندو قرآنِ حکیم پر کیسی گہری نظر رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :-

(۱) "اور اللہ جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو بس اس کام کی نسبت کہہ دیتا ہے کہ "کن" (ہو جا) اور وہ ہو جاتا ہے" (بقرہ ۱۱۷/۱)

(۲) "اللہ نے آدم کو مٹی سے بنایا یوں کہ کہا "کن" (ہو جا) بس وہ پیدا ہو گئے" (آل عمران ۳- ۵۹)

(۳) "وہ اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا، اور لاکھ جس دن کہہ دیا کہ "کن" (ہو جا) بس وہ پیدا ہو گئے"

(انعام ۶ - ۷۳)

(۴) "وہ اللہ ایسا ہے کہ جو تمہیں زندہ رکھتا اور مارتا ہے۔ اور جب کسی کام کے بارے میں چاہتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ "کن" اور بس وہ کام ہو جاتا ہے" (مومن ۴۰ - ۶۸)

اسی فکر و مطالعہ نے اس عہد میں "قومی یکجہتی" کا وہ انداز پیدا کیا تھا جو خواب ہو کر رہ گیا ہے اور بہت سے دردمند دل چاہتے ہیں کہ وہ زمانہ پھر لوٹ آئے۔ بہرکیف! آگے فرماتے ہیں :-

انسان کو بنا کے حورِ طلعت :: فرمایا عطا خرد کا خلعت

سیمابی عطا کی غم کشتوں کو :: بے مہری سکھائی مہ وشوں کو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بخشی گُل کو، قبائے احمر ∴ بلبل کو کہا، بن عاشق اُس پر
کتّاں کو کیا قمر پر عاشق ∴ انساں کو کیا بشر کا عاشق

"کتّاں" کپڑہ کی ایک ایسی لطیف قسم تھی کہ وہ چاندنی کی تاب نہ لاتا تھا اور چاند کی روشنی اُس پر پڑجاتی تھی تو وہ پھٹ جاتا تھا۔ آخر میں حزیں نے کہا ہے :

یارب! تو کرا تنا چارہ سازی ∴ میں چھوڑ دوں اُلفتِ مجازی

اس مثنوی کا قطعۂ تاریخ شوق بڈھانوی نے کہا ہے :

سنو، "اک چاند کے ٹکڑے کی ہے مہری کا قصہ ہے"

اِس سے سنہ تصنیف ۱۲۸۸ھ فصلی نکلتا ہے جو ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء کے مطابق ہے۔

"نالۂ حزیں" طربیہ مثنوی ہے اور اس کا اختتام وصل و شادکامی پر ہوتا ہے۔

اب تو ہر روز اُن سے ملتا ہے ∴ سیر کو جبکہ ساتھ چلتا ہے
ختم کر اے حزیں، یہ افسانہ ∴ توڑ دے یہ سبو و پیمانہ

ابتدا یوں ہوئی ہے :

ایک دن ناگہاں وہ غیرتِ حور ∴ گھر پہ آیا مرے بہ فرطِ سرور
اِس طرح تھا خوشی کا دل میں جوش ∴ ہوکے بیتاب، ہوگیا بیہوش
مضطرب ہوکے دل ہوا بیتاب ∴ گفتگو کی نہ لاسکا میں تاب

یہ عجب مثنوی ہے۔ حزیں نے لکھا ہے کہ اُن کی ہیروئن کے بہت سے عاشق تھے۔ اور سب کے سب کامیاب و باریاب بھی۔ آخر میں ان کا نمبر آیا۔ اور انھوں نے آخر دم تک اُس کا ساتھ دیا۔ اصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ حزیں ذی حیثیت اور بڈھانہ کے رئیس تھے لہٰذا آخر میں جب پرستاروں کی بھیڑ چھٹ گئی تو وہ اِن کے گلے کا ہار بنی۔

حیرت ۔ پنڈت اجودھیا پرشاد

حیرت کے آباء واجداد کشمیری برہمن تھے مگر لکھنؤ آکر بس گئے تھے۔ کبھی کبھی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دلی میں بھی رہتے تھے - شاعری اور موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے - بڑے ہونہار اور طباع تھے - شاعری شروع کی تو قلندر بخش جرأت کے شاگرد بنے ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے اور عین عالم شباب میں ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸ء میں چل بسے - "نغمۂ عندلیب" میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہے :-

"جامع مثنوی ہائے کثیر - بعلم موسیقی دلپذیر - تیر اندازی میں قدرت قوی - خوش گلوی میں حنجرۂ داؤدی، دہلی میں بہ عمر سی و پنج سال، آئینہ ہستی، سنگ قضا نے چور کیا سطے مرحلہ تا بمقدور کیا - حیرت کے استاد جرأت - جرأت کے شاگرد حیرت"

بہت سے تذکروں میں ان کا نام مذکور ہے - مگر یہ بیان کرتے ہوئے بھی کہ حیرت نے کئی مثنویاں لکھی تھیں، کسی نے بھی نہ کسی کا نام پیش کیا اور نہ کوئی نمونہ - افسوس ہے - لوگوں نے "غزل" ہی کو سب کچھ سمجھا اور دیگر اصناف سخن کی حفاظت کی طرف کوئی توجہ نہ کی -

خرد - منشی راجہ رام

شاید یہ قدرتی نظم تھا کہ ہر ریاست میں ایک "خرد" ضرور ہوا کیے - گوالیار اسٹیٹ میں منشی ہر دیال پرشاد خرد تھے - دربار رام پور میں منشی راجہ رام خرد تھے - یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے - صاحب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بتایا ہے کہ خرد نے ایک مثنوی "بہارستان فرحت عرف گلزار عشرت" کے نام سے ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں بعہد حامد علی خاں لکھی تھی جس کا قلمی نسخہ رام پور لائبریری میں موجود ہے - اس مثنوی میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد نواب صاحب کی مدح کافی لمبی ہے - مثنوی سات آٹھ صفحات پر مشتمل ہے -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا مقصود تحریر اس ذریعہ سے نواب صاحب

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی قصیدہ خوانی تھی، اِس لئے کہ خرد نواب صاحب کے بہت عزیز مصاحب یا دوست تھے۔ نمونہ یہ ہے :-

تو ہی لائق حمد ہے کردگار :. کہ پیدا کئے تو نے لیل و نہار

خستہ ۔ منشی جیالال

خستہ کا ذکر صاحبِ "خمخانۂ جاوید" نے بھی کیا ہے اور صاحبِ "ہندو شعرا" نے بھی۔ خستہ دہلی کے ایک باعزت کائستھ خاندان کے فرد تھے اور دہلی کے میونسپل بورڈ میں ملازم تھے۔ صاحبِ "ہندو شعرا" نے انہیں کائستھ بتایا ہے۔ "جیالال" کے نام سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر صاحبِ "اردو مثنویاں" نے "ضمیمے" میں انہیں "پنڈت جیالال خستہ دہلوی" لکھا ہے۔ اور چونکہ "ہندو شعرا" سے زیادہ وقیع اور مستند کتاب "اردو مثنویاں" ہے اور ڈاکٹر نارنگ، حضرتِ عشرت لکھنوی سے، میرے نزدیک، زیادہ قابلِ اعتماد ہیں، اِس لئے میں سمجھتا ہوں کہ وہ پنڈت ہی ہوں گے۔ مگر چونکہ مجھے نسل و ذات سے بحث نہیں، اس لئے جو عام طور سے مشہور ہے، میں نے انہیں کائستھ لکھا ہے۔

خستہ نے "سسّی پنوں" کے قصہ کو "نسیم سحر" کے عنوان سے مثنوی کا جامہ پہنایا ہے۔ خستہ اردو، فارسی کے ماہر تھے اور شاعری کا بہترین ذوق اور ملکہ رکھتے تھے۔ "نسیم سحر" ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء کی تصنیف ہے اور خستہ نے خود قطعہ تاریخ کہا ہے :-

جبکہ یہ داستاں تمام ہوئی :. دلِ ناشاد، باغ باغ ہوا
سالِ تاریخ کا ہوا جو فکر :. ہاتفی نے کہا "فراغ ہوا"

حالانکہ یہ مثنوی میر صادق علی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اور انہیں کو قطعہ تاریخ کہنا تھا :-

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

خصوصاً جو ہیں، میر صادق علی ٭ نمبردارِ سرّ ِ مخفی و جلی
لکھا جن کے کہنے سے قصہ تمام ٭ رہیں تیری رحمت سے خرّم مدام

"نسیم سحر" تقریباً پانسو۵۰۰ اشعار کی لمبی مثنوی ہے۔ ۱۸۸۴ء میں دہلی سے چھپ گئی تھی۔ دہلوی لب و لہجہ، صاف سلیس الفاظ اور بے تکلف بول چال کی حامل ہے اگرچہ بقول صاحب "اردو مثنویاں" ادبی اعتبار سے محبت خاں محبت کی مثنوی کو نہیں پہنچتی۔ ابتدا یوں ہوئی ہے :-

لکھوں پہلے حمدِ خدائے کریم ٭ کہ ہے نام اُس کا غفور الرّحیم
ہوا عشق کا بھی اُسی سے ظہور ٭ کیا یعنی پیدا محمدؐ کا نور
وہ ساقیؐ کوثر رسولِ امیں ٭ بنا جن کی خاطر زمان و زمیں
امام رُسُل، ختمِ پیغمبراں ٭ محبِّ خدا، سرورِ دو جہاں
ہیں اصحاب اُس کے جو والا گہر ٭ عروجِ فضیلت کے شمس و قمر
ابوبکر صدّیق، عالی جناب ٭ سپہر کرامت کا اک آفتاب
دوئم عمر عادل، مبارک شیم ٭ ہے نوشیرواں جن کے جھک کر قدم
سوئم حضرت عثمان عالی وقار ٭ چہارم علی سرورِ نامدار
ثنائیں کروں جو کچھ اُن کی رقم ٭ وہ بیشک ہے کم، بلکہ کم سے بھی کم

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے :-

"ایک پنڈت، پیغمبرِ اسلام اور خلفائے راشدین کی شان میں کس خضوع و خشوع سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے، یہ اِن اشعار میں ملاحظہ فرمائیے"

یہ ہے نمونہ اُس "قومی یکجہتی" اور "NATIONAL INTEGRATION" کا جو سابق میں کارفرما تھی اور قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ فی زمانہ ایک طرف تو مسلمانوں کے پیغمبروں، ولیوں، بزرگوں اور حکمرانوں کو گالیاں دی جاتی ہیں، اور اسی منہ سے دوسری جانب مسلمانوں سے "قومی یکجہتی" کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ممکن نہیں۔ بہر کیف، مثنوی خاصی ہے اور دعائیہ اشعار پر ختم ہوئی ہے۔ سالِ وفات معلوم نہ ہو سکا۔

خوشتر۔ منشی جگن ناتھ لال

خوشتر، لکھنؤ کے معزز اور ذی علم خاندان کے لائق و نامور فرد تھے۔ ان کے والد کا نام منشی منا لال تھا۔ خوشتر اردو، فارسی کے زبردست ماہر اور عربی و سنسکرت کے پورے واقف کار تھے۔ ان کا خاندان تاجدارانِ اودھ کے دربار میں، بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ چکا تھا۔ یہ خود بھی واجد علی شاہ کے صدر دفتر میں متصدی تھے۔ شاعری کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیت کے مالک تھے۔ اور ان کے کلام میں نہایت بلند پایہ قنوطیت پائی جاتی ہے۔ صاحبِ "ہندو شعراء" نے لکھا ہے کہ غدر کے سات برس کے بعد ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔ مگر صاحبِ "اردو کے ہندو ادیب" نے ان کا سالِ وفات ۱۲۷۹ھ/۱۸۸۴ء بتایا ہے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء ہوتا ہے۔

خوشتر نے تین مثنویاں لکھی تھیں ایک "رامائن" دوسری "بھاگوت گیتا" تیسری "پدم پوتھی" جس کو بعضوں نے "چترگپت" اور بعضوں نے "چندر گپت" کے نام سے یاد کیا ہے۔ ۱۸۸۳ء میں خوشتر کے لائق بیٹے لالہ روشن لال ماہر لکھنوی نے "بھاگوت گیتا" کو شائع کراتے ہوئے، اس کے قطعہ تاریخِ طباعت میں کہا ہے:—

دعا کے بعد راقم شاد خاطر ۔۔ رقم کر اک نئی تاریخ نادر

کہ تصنیف پدر ہیں تین پوتھی ۔۔ کروں نام ان کے میں عالم میں ظاہر

سری رامائن و سی بھاگوت ہے ۔۔ پدم پوتھی بھی ہے تصنیف آخر

کیا جو غور میں نے بہرِ تاریخ ۔۔ کہا ہاتف نے تب یوں مجھ کو ماہر

سرِ دشمن قلم کر بہرِ تاریخ ۔۔ کہ تینوں نسخے ہیں اردو میں نادر

یہ قطعہ تاریخ صنعتِ تخرجہ میں ہے۔ اعداد ۱۸۶۸ ہوتے ہیں۔ اس میں سے "دشمن

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے سر" یعنی "دال" کے چار عدد کم کر دیجئے تو ۱۸۶۲ آ ئیں گے اور یہی خوشتر کا سالِ وفات بھی ہے۔

خوشتر، شاعر ہوتے ہوئے بھی مذہبی آدمی تھے اور انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو مذہبی کتابوں کی تصنیف میں صرف کرنا اپنی سعادت سمجھا، ورنہ ادبی شاہکار بھی لکھ کر رہ جاتے، کیونکہ خوشتر غیر معمولی صلاحیتِ شعری رکھتے تھے۔

خوشتر کی اوّل الذکر دونوں مثنویوں کا ذکر اِس کتاب کے حصّہ دوم میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہی اُن کا محل ہیں۔ البتہ "پدم پوتھی" کا نمونہ یہاں ملاحظہ فرمائیے:

شبے خوش صورتِ صبحِ دل افروز ؛ دکھایا نورِ مہ نے جلوۂ روز
رکھے گلشن میں گُل ہائے معنبر ؛ رواں ہر سو نسیم روح پرور
عنادل نغمہ پرور، ہر چمن میں ؛ بہارِ تازہ ہر سرو و سمن میں
جو دیکھا چت گپت نے نیک ہنگام ؛ مئے گل رنگ سے مملو کیا جام
جو تھیں وہ دونوں محبوب پریوش ؛ دل افگن، دلبر و دلدار و دلکش
خوشی سے عینِ وقتِ بادہ خواری ؛ لیا دونوں کو بر میں باری باری

پوری مثنوی اِسی شان دار اندازِ بیان کی حامل ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ خوشتر بڑے پائے کے شاعر تھے۔ ان کا کلام پُر شکوہ، پُر جلال اور پُر عظمت ہے۔ زمزمہ پردازی جس صلاحیت کا نام ہے وہ خوشتر کے کلام میں اپنے پورے جوش و ولولہ کے ساتھ جلوہ ریز ہے۔ کاش خوشتر رامائن اور گیتا کے بجائے مہابھارت کو نظم فرماتے۔

خوشگو۔ بابو امر سنگھ

شاعری کی دنیا میں، بنارس بہت محبوب و مقبول خطۂ ارض ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ وہاں کی صباحی لطافتیں اور آبی رنگینیاں ہیں۔ لہٰذا اس سرزمین سے بعض اچھے شاعر بھی اٹھے ہیں۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی کے شاگرد دلوان سنگھ راجہ بنارسی۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

خوش گو بھی اسی بنارس کے تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "بہار دانش" کے نام سے لکھی تھی۔ نمونہ نہیں مل سکا۔

داس ــ لالہ بھگوان داس

داس ضلع سہارن پور کے گاؤں، سلطان پور کے رہنے والے تھے۔ ان کا اتنا ہی مختصر ذکر ملتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ داس نے ایک مثنوی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں "گلزار لطیف" نام کی لکھی تھی جو چھپ بھی گئی تھی۔ مادۂ تاریخ یہ ہے:

"چہ زیبا داستانِ عشقِ بہرام"

مثنوی کا نمونہ یہ ہے:

گلستاں، یا کہوں تھا باغِ رضواں ⁂ جسے ہوں دیکھ حیراں، حور و غلماں
مصفّا حوض، ہر سُو نہر جاری ⁂ لطافت سے رواں، بادِ بہاری
کہیں تھی گل پہ بلبل نغمہ پرداز ⁂ کہیں شمشاد سے قمری تھی دمساز
کہیں تھا بولتا، طوطی شکر خوار ⁂ زمرّد گوں لباس و سُرخ منقار
کہیں کوئل، کہیں بولے پپیہا ⁂ کسی جا کوکلا، خوش لحن گویا

معلوم ہوتا ہے داس زبان پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے اور ان میں ہندوستانیت بلکہ پوری طرح رچی بسی تھی۔

داس ــ منشی سکھ داس

صاحب "اردو مثنویاں" نے بلوم ہارٹ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ سنہ ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں "پدماوت" کو "سنگیت پدماوت" کے نام سے سکھ داس ولد نرائن داس نے ترجمہ کیا تھا جو مثنوی کی صورت میں تھی۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

داسؔ — منشی شنکر داس

داسؔ، پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں پنڈی بھٹیاں کے رہنے والے تھے۔ اور وہیں کسی اسکول میں ملازم تھے۔ صاحبِ "تذکرہ شعرائے ہنود" کے عہد میں زندہ تھے اور دونوں کے درمیان مراسلت تھی۔ داسؔ نے دو مثنویاں لکھی تھیں۔ ایک "نقشۂ زندگی" جس میں روزمرّہ کے حالات نظم کیے گئے تھے۔ دوسری "کارزارِ مغربی"، جو روسؔ اور رومؔ کی جنگ کے واقعات پر مبنی تھی۔ نمونہ کسی کا نہیں مل سکا۔

دولتؔ — دولت سنگھ چھوٹے جی

صاحب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بتایا ہے کہ دولتؔ نے ایک مثنوی "گلشنِ بہار" کے نام سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں لکھی تھی۔ مگر نمونہ، نہ انھوں نے پیش کیا ہے اور نہ کہیں اور ملا۔

ذرّہ — یالاجی ترمک

ذرّہ، ہوتا ہی ہے اتنا مہین، کہ آنکھ سے اوجھل ہوتے اس کو دیر نہیں لگتی۔ لہٰذا صرف اتنا ہی پتہ چل سکا کہ وہ صاحبِ علم و فضل تھے زیادہ تر اورنگ آباد میں رہتے تھے۔ رسا حیدرآبادی کے شاگرد تھے۔ اور ان کا دور ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء سے ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء تک میں رہا ہے۔

ذرّہ نے دو مثنویاں لکھی تھیں۔ ایک "مظہر نامہ" اور دوسری مثنوی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"مثنوی لطیف"۔ مگر کوئی نمونہ دو میں کسی کا کہیں نہیں مل سکا۔

"بالاجی" نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالاجی وشوناتھ اور بالاجی باجی راؤ کے خاندان یا اُسی سلسلہ کے لوگ تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو باجی راؤ کا عہد ۱۷۴۰ء / ۱۱۵۳ھ سے ۱۷۶۱ء / ۱۱۷۵ھ تک رہا ہے۔ لہٰذا وہ اُسی دور میں ہوئے ہوں گے۔

راجہ ـــ مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر

راجہؔ عام طور سے "کاشی والا راجہ" کے لقب سے مشہور ہیں۔ اُن کے دادا بلونت سنگھ راج گدی پر تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے لڑکے چیت سنگھ کی گدی نشینی کو بہ سبب خرابیٔ انتظام ریاست، شجاع الدولہ نے منظور نہ کیا، تو انھوں نے روپیہ کے زور پر انگریزوں سے مدد لی اور کامیاب ہوئے۔ انگریزوں نے سمجھ لیا کہ اب چیت سنگھ اُن کے قبضہ میں ہیں لہٰذا اُن کے مطالبے ہمیشہ قائم اور بڑھتے رہے۔ آخر تنگ آ کر چیت سنگھ نے انکار کر دیا۔ نتیجتاً جنگ کی نوبت آ گئی اور چیت سنگھ شکست کھا کر گوالیار چلے گئے۔ جہاں اُن کو انگریزوں سے دو ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔

۱۶ر اکتوبر ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ کو راجہ صاحب کے یہاں جو مشاعرہ ہوا تھا اُس کا حال "گلدستہ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس مشاعرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر شاعر اپنا نام، قومیت، تخلّص، عمر، سکونت، استاد کا نام، شاعری کی مدت اور تصانیف کی تفصیل خود لکھ کر دے۔ چنانچہ راجہ صاحب نے اپنے بارے میں بھی لکھا۔ راجہ کے بارے میں جو کچھ راویوں کے اختلافات ہیں وہ سب خود راجہ کی اِس خود نوشت تحریر سے دور ہو جاتے ہیں:-

"مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر راجہ کاشی۔ گوتم برہمن۔ خلف مہاراجہ چیت سنگھ بہادر راجہ کاشی۔ تخلص راجہ در اردو و در زبان

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھاکا کاشی راج ۔ شاگرد میاں نظیر در علم فارسی و شاگرد لالہ بھٹ در ہندی ۔ عمر ۷۰ سال ۔ مدتِ شاعری ۳۷ سال سکونت قدیم بنارس ۔ سکونت حال آگرہ ۔ تصنیفات ۔ ۳ دیوان و یک مثنوی و یک بیاضِ سلام و مرثیہ و یک کتاب بھاکا موسوم بہ چترچندر و کتابِ دیگر در زبان بھاکا موسوم بہ رس سمدر ....."

راجہ کو کئی "تذکرہ نگاروں نے حاتم علی مہر کا شاگرد بتایا ہے مگر اس تحریر سے ان کی تردید ہو جاتی ہے ۔

جس مثنوی کا اِس تحریر میں ذکر ہے ۔ وہ "گل بکاؤلی" کے رنگ کی ہے ۔ اس کا تاریخی نام "داستان گلِ سخن" ہے جس سے ۱۲۷۶ھ / ۱۸۵۹ء میں برآمد ہوتا ہے ۔ چودہ سو اشعار سے زیادہ کی حامل لمبی مثنوی ہے ۔ ۱۸۶۱ء / ۱۲۷۸ھ میں شائع ہو گئی تھی ۔ حمد، نعت اور منقبت حضرت علی کے بعد اپنا حال کہا ہے ۔ فرمایا ہے ؎

پہلے کچھ اپنا حال ہو تحریر :: تا یہ ظاہر ہو، کون ہے یہ حقیر؟
شکرِ خالق کروں نہ کیوں ہر دم :: ذرّہ آفتابِ تابانم!
مجھ کو اُس قوم میں کیا پیدا :: ہند میں جو ہیں اشرف و اعلا
شکرِ خالق کا کس زباں سے کروں :: یعنی گوتم برہمنوں میں ہوں
جدّ و آبا ہوئے ہیں والیِ ملک :: سب کے سب تھے رئیسِ عالیِ ملک
یعنی راجوں میں راجۂ کاشی :: مرتبہ اُن کا کیوں نہ ہو عالی
راجہ بلونت سنگھ عالی قدر :: جدِّ امجد تھے میرے زینتِ صدر
پسرِ راجہ چیت سنگھ ہوں میں :: جگرِ راجہ چیت سنگھ ہوں میں
عجز لیکن ہے یاں طبیعت میں :: خاکساری ہے اپنی طینت میں
جدّ و آبا پہ افتخار نہیں :: جاہ و حشمت کا اعتبار نہیں
کیجئے کوئی اس طرح کا کام :: جس سے باقی رہے جہاں میں نام

اِس مثنوی میں ایک دلچسپ چیز دیونی کا مرقّع ہے ۔ سراپا دہشت انگیز و نہایت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

خوفناک اور حد درجہ بدہیئت - ذرا تصور کیجئے، اُس ذات کا جس کی یہ تصویر کھینچی گئی ہے فرماتے ہیں: ؎

سر ناپاک گنبدِ دوّار ٭ بال بھی کمبلوں کا اِک انبار
آنکھیں دونوں الاؤ کی صورت ٭ حدقے ان کے کڑھاؤ کی صورت
تھا دہن اُس کا گویا کرۂ نار ٭ درِ دوزخ کی شکل آتش بار

پورا سراپا اِسی طرح ہیبت ناک ہے۔

راحت - منشی بھگونت رائے

کاکوری (ضلع لکھنؤ) کی سرزمین نہایت شعرا خیز واقع ہوئی ہے محسن کاکوروی یہیں کے تھے، جن کا نعتیہ قصیدہ "سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل" زبان زد خاص و عام ہے۔ راحت کا وطن بھی یہیں تھا۔ اُن کے والد منشی دین دیال صاحب رئیس تھے۔ راحت کو اردو، فارسی پر عبور کامل حاصل تھا۔ شاعری میں سید آغا حسن امانت لکھنوی کے شاگرد تھے۔ سالِ ولادت ۱۸۳۶ء / ۱۲۵۲ھ اور سالِ وفات ۱۸۸۴ء / ۱۳۰۰ھ ہے۔ شعرا، بربنائے عشق رویا کرتے ہیں، مگر راحت کا رونا کسی اور سبب سے ہوتا تھا: ؎

اعمالِ بد پہ اپنے نہ روؤں میں کس طرح ٭ دھونا ضرور چاہئے فردِ گناہ کو

راحت کی مثنویوں کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ جس کو جتنی مثنویوں کا علم تھا، اُس نے اتنی ہی کا ذکر کیا۔ کچھ دقّت یا دھوکا اس لئے بھی ہوتا گیا کہ راحت کی مثنویاں دو دو ناموں سے معروف ہیں۔ دراصل راحت نے چھ مثنویاں لکھی ہیں:-

(۱) نل دمن - جو "داستانِ راحت" بھی کہلاتی ہے۔

(۲) زہرہ و بہرام - جو "بہارستانِ راحت" اور "بہارستانِ کلام" بھی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کہلاتی ہے ۔

(۳) غنیمت اردو۔ جو "نگارستانِ راحت" بھی کہلاتی ہے ۔

(۴) بوستانِ راحت۔

(۵) مدھ مالتی ۔

(۶) سوزِ عاشقانہ۔

ہر چند کہ راحت کی سب ہی مثنویاں معیاری اور بیش قیمت ہیں۔ مگر ان سب میں "نل دمن" سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے جس میں "نل" اور "دمن" کے مشہور عشق کی داستان ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے لکھا ہے :۔

"ہندوستان کا یہ ہر دل عزیز قصۂ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب مہابھارت سے لیا گیا ہے۔ یہ پانڈووں کو ان کی جلا وطنی کے زمانے میں تفریحاً سنایا گیا تھا۔ اِس لحاظ سے نل دمن کی کہانی پُرانوں کے زمانے سے بھی قدیم ہے ۔ سنسکرت میں اِس قصّے کے متعدد نسخے ملتے ہیں، لیکن مستند متن مہابھارت ہی کا ہے۔ نل دمن ہندوستان کے اُن چند قصّوں میں سے ہے جن کی شہرت و مقبولیت ہندوستان سے باہر بھی ہے اور جن کا غیر ملکی زبانوں میں بار بار ترجمہ کیا گیا ہے۔"

جنوبی ہند میں، حیدرآباد دکن سے اسّی میل دور مغرب کی طرف، ایک چھ سو فٹ کی بلند نرم پتھر کی پہاڑی "منجیرا پربت" پر قدیم دور میں ایک شہر آباد تھا جس کی بلندی سطحِ سمندر سے ۲۳۲۲ فٹ تھی۔ اس شہر کا قدیم نام "وِدربھ" تھا۔ بعد میں یہ شہر "بیدر" کے نام سے مشہور ہوا۔ جب یہ شہر مع چند پرگنوں کے قاسم بریدر کو ملا تو اُس نے لٹیروں کی دن رات کی یورش سے تنگ آ کے اِس شہر کے چاروں طرف ایک مضبوط فصیل تعمیر کرایا۔ اُس وقت سے یہ شہر "حصار بیدر" کہلانے لگا۔ آج بھی یہ حصار یا فصیل موجودہ شہر بیدر سے چودہ[۱۴] میل دور مغربی سمت میں کھنڈر کی صورت میں موجود ہے۔ بہمنی دور میں اس شہر کا نام "محمد آباد بیدر" مشہور ہوا۔ آج کل پھر یہ شہر صرف "بیدر" کے نام سے مشہور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اور ریاست میسور کے ایک ضلع کی صورت میں موجود ہے۔ آثارِ قدیمہ کی فراوانی کے اعتبار سے یہ شہر دہلی اور بیجاپور کے بعد تیسرے نمبر پر شمار ہوتا ہے۔

قدیم شہر بیدر، راجہ بھیم سین کی راجدھانی تھا۔ اس راجہ کی ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی دمینتی تھی جس کو لوگ پیار سے دمن کہا کرتے تھے۔ اس راجکماری کے غیر معمولی حسن و جمال کی شہرت سن کر ریاست مالوے کے شہر اُجین کا نوجوان راجہ نل اس راجکماری پر نادیدہ عاشق ہو گیا۔ حسنِ اتفاق سے نل کے ہاتھ ایک ایسا ہنس لگا جس کے ذریعہ دونوں کے درمیان نامہ و پیام ہونے لگا۔

دمینتی کے باپ نے بیٹی کو آزارِ عشق کا مریض دیکھ کر اُس کی شادی کا نظم کیا اور کہا کہ وہ سوئمبر کے ذریعہ اپنے شوہر کا انتخاب کرے۔ اِس سوئمبر میں بہت سے راجے شریک ہوئے۔ نل بھی شریک ہوا۔ اور اگنی، اندر، ورن اور یم چار دیوتا بھی مقابلہ کے لئے آئے۔ دیوتاؤں نے کئی طرح یہاں تک کہ نل کی شکل اختیار کر کر کے بھی دمینتی کو دھوکا دینا چاہا مگر اصلی نل کامیاب رہا اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ انہیں ایک لڑکا اندر سین اور ایک لڑکی اندرا پیدا ہوئی۔ چند برسوں کے بعد نل ایک ناراض دیوتا کالی کی سازشوں کی بنا پر اپنے بھائی سے چوسر کھیلنے میں تاج و تخت ہار گیا۔ چنانچہ نل نے جنگل کی راہ لی اور اُس وقت روانہ ہوا جب دمینتی سوئی ہوئی تھی۔ دونوں بچھڑ کے نہایت تباہ حال رہے تاآنکہ نل، اجودھیا کے راجہ رِتوپرن کے یہاں رتھبان اور خانساماں کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ دمینتی اس مدت میں اپنے باپ کے یہاں رہی اور نل کو تلاش کراتی رہی۔ جب پتہ چلا کہ نل وہاں ہے مگر اُس کی شکل بدل چکی ہے تو تصدیق کے لئے دمینتی نے اپنے کو کنواری بنا کر اپنے سوئمبر کا سوانگ رچایا اور اُس میں راجا رِتوپرن کو بھی مدعو کیا۔ چنانچہ راجہ شریک ہوا۔ راستہ میں اُس راجہ نے نل کو چوسر کا کھیل اعلیٰ پیمانہ پر سکھا دیا۔ آخر چند امتحانوں کے بعد حقیقی نل پہچان لیا گیا اور ایک سانپ کی بتائی ہوئی ترکیب کے ذریعہ اپنی اصلی ہیئت میں آ گیا۔ اِس کے بعد بچھڑے ہوئے آپس میں ملے۔ دمینتی کے باپ نے ایک فوج کے ساتھ نل کو اپنی حکومت حاصل کرنے بھیجا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پھر دونوں بھائیوں میں چوسر کا کھیل ہوا۔ اب نل ماہر ہو چکا تھا لہٰذا جیت گیا۔ سلطنت مل گئی اور نل دمن آرام سے رہنے لگے۔ اس قصۂ عشق و محبت نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ اس نے تقدس کا درجہ حاصل کر لیا اور مہابھارت میں جگہ پا گیا۔

شہر بیدر آج بھی موجود ہے اور اس سے ہٹ کر اس کے نواحی جنگل میں ایک ٹیلہ بھی موجود ہے جو "دمینتی کی سمادھی" کے نام سے اس وقت بھی مشہور ہے۔ یہ قصہ شہنشاہ اکبر نے سنا تو اپنے وزیر اعظم فیضی کو مہابھارت سے فارسی نظم میں اس قصہ کو منتقل کرنے کا حکم دیا اور فیضی نے اپنی مشہور مثنوی "نل دمن" لکھی۔ اور اردو میں اس قصے سے متعلق جتنے بھی نسخے ملتے ہیں، ان میں سے اکثر میں کہانی کی بنیاد فیضی ہی کے متن پر رکھی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فیضی نے ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۳ء میں یہ مثنوی لکھی تھی۔ تیاری کے بعد جب فیضی اکبر کے سامنے اس قصہ کو سنانے کھڑا ہوا اور اس نے پہلا شعر پڑھا: ؎

اے در رگِ و پوے تو ز آغاز
طاؤس نظر بلندِ پرواز

تو عرفی نے اعتراض کیا:۔

"طاؤس را چہ پرواز؟ ازیں بام تا آں بام؟ بگو" عنقاے نظر بلندِ پرواز"

چنانچہ اس وقت فیضی کی نل دمن کے تمام نسخوں میں یہ مصرع یوں ہی ملتا ہے۔

راحت نے اپنی مثنوی ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں لکھی تھی۔ یہ بڑی لمبی چوڑی مثنوی ہے:۔

گنی میں نے جو بیتیں، کہہ کے یکسر ؛؛ ہوئیں گنتی میں سولہ سو پچھتر ۱۶۷۵

دمن کی تعریف نل کے سامنے یوں کی جاتی ہے: ؎

عجب اک ماہرو ایسی وہاں ہے ؛؛ کہ جس کا مشتری سارا جہاں ہے
بناتی ہے جو دلکش زلف سے دام ؛؛ دمن کہتے ہیں سب اس گلبدن کا نام
بنے موقع سے کیا، ہر ایک اعضا ؛؛ مہذب ہے بدن اس کا سراپا
ہزاروں برہمن اس پر فدا ہیں ؛؛ اسی سیمیں صنم کے آشنا ہیں
نہ دے ہندی فقط اس زلف پر جان ؛؛ مسلماں بھی کرے قربان ایمان

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اگر دیکھے ہلال اُس مہ کی ابرو ٭ نہ دکھلاوے کبھی پھر حشر تک رُو

وہ آنکھیں مست چشم رشک آہو ٭ بھرا جس میں سراسر عین جادو

"عین جادو" خوب ہے۔ "عین" کے معنی "آنکھ" کے بھی ہیں اور "بعینہٖ" کے بھی۔ چوٹی کی تعریف میں کہا ہے:

گُندھی دل کش عجب خُورِ معنبر ٭ بھرے ہیں پیچ و خم جس میں سراسر

جو ناگن، ایک بھی خم دیکھ پائے ٭ ہزاروں سے کلی سے پیچ کھائے

شعر خوب ہے۔ چوٹی کو سانپ سے سبھوں نے تشبیہ دی ہے۔ مگر درویش سہارنپوری نے جو شعر کہا ہے، وہ اپنا جواب نہیں رکھتا:

پڑا جو سایۂ گیسو، جھجک کے ساقی نے

یہ کہہ کے، رکھ دیا ساغر، کہ ہے شراب میں سانپ

وہاں بے عقل جانور کو، چوٹی پر سانپ ہونے کا دھوکا ہوا تھا۔ یہاں خود چوٹی والی کو اپنی ہی چوٹی پر سانپ ہونے کا دھوکا ہو جائے تو دوسرے کا کیا ذکر؟ ہندوستان کا ذکر ملاحظہ ہو:

عجب نزہت فزا ہندوستاں ہے ٭ کہ ہر شہر اُس سے رنگیں بوستاں ہے

غضب ہیں بت یہاں کے شوخ و بیباک ٭ کہیں زاہد کا دل لینے میں چالاک

دیا ہے حق نے ایسا حُسنِ نمکیں ٭ کفِ پا کو نہ پہنچے لُعبتِ چیں

وہ کافر زلف رکھتے ہیں کمر تک ٭ پھنسے جس میں دلِ اسلام بیشک

جہاں ایسے بتوں کی ہو خدائی ٭ کریں کیونکر نہ واں سب جُبّہ سائی

ہندوستان خود فارسی لفظ ہے جس کے معنی "ہندوؤں کا ملک" ہے۔ سعدی نے کہا ہے:

بہ شوخی و غلغل بہ ہندوستاں

اس لئے "ہندی" کوئی اور زبان نہیں بلکہ "اردو" ہی کو "ہندی" کہا جاتا ہے۔ یعنی "ہندوستان کی زبان"۔ جیسے "فارسی" کے معنی ہیں "فارس کی زبان"۔ چنانچہ مخزن الفوائد

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) میں مرزا جانجانان مظہر کے ذکر میں ہے کہ :۔

"با زبان ہندی کہ مراد از اردو است"

راحت نے بھی "ہندی" سے مراد "اردو" ہی لیا ہے ۔ چنانچہ سببِ تالیف میں کہا ہے :ـــ

جو دیکھا آج کل ہندی کا چرچا :: ہوا دل ایک دن مشتاق اس کا
کہ عشقِ نل جو ہے عالم میں مشہور :: کریں ہندی زباں میں اس کو مذکور
اگرچہ فارسی میں سب بیاں ہے :: مگر طول اس کی ہر اک داستاں ہے
اشارہ دل سے یوں میں نے جو پایا :: سخن کا جلد تر دریا بہایا

اور یہی دریا نلدمن یا داستانِ راحت کے صفحات میں رواں دواں ہے ۔ اصل قصہ جو مہابھارت میں ہے وہ کامیڈی ہے مگر راحت نے اسے ٹریجیڈی بنا دیا ہے :ـــ

پڑی تھی لاش عاشق کی جہاں پر :: گئی ہنستی ہوئی آخر وہاں پر
گلاب و عطر سے پھر لاش نہلا :: دیا رنگین کفن پھر اس کو پہنا
وہاں سے پھر اسے تختوں پہ لاکر :: لیا زانو پہ رکھ سر کو اٹھا کر
ستی ہونے کا جو ہوتا ہے دستور :: کیا اک اک بجا، غم دل سے کر دور
اٹھا اس غم سے باہر شورِ محشر :: چلے پیر و جواں سب حال سن کر
دمن کے دل میں تھی جو عشق کی آگ :: بدن میں خود بخود بس لگ گئی آگ
لگی جلنے برنگِ شمع کافور :: دکھایا مہر کا ہر ایک کو نور
زبس اس سیم تن کا عشق تھا پاک :: صنم کے ساتھ جل کر ہو گئی خاک

اس مثنوی کا قطعہ تاریخ خود مصنف نے لکھا ہے :ـــ

ہوئی جب مثنوی تیار یکسر :: بندھا تاریخ کا دل میں تصوّر
مرے ہیں ایک مشفق کالی پرشاد :: ہوئے اِس مثنوی کو سن کے جو شاد
عنایت کر اُسی دم غور فرما :: کہا "یہ داستاں ہے راحت افزا"

اِس سے سنہ تصنیف (۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء) نکلتا ہے ۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

راحت کی دوسری اچھی مثنوی "غنیمت اردو" ہے جو "نگارستانِ راحت" کے نام سے بھی مشہور ہے اور جس میں شاہد اور عزیز کا فسانۂ عشق نظم ہوا ہے۔ دراصل یہ مثنوی ملا غنیمت کی مثنوی "غنیمت المعروف بہ نیرنگِ عشق" کا ترجمہ ہے۔ نمونہ یہ ہے:

اشکوں سے غبارِ زلف دھویا :: ہر بال کو مشک میں ڈبویا
پیشانی پہ چُن کے تازہ افشاں :: گردوں کا بنایا ماہِ تاباں
نقشہ جھوری کا وہ جمایا :: آنکھوں سے اسے لہو رلایا
آراستہ کر کے ساری پوشاک :: بیٹھا محفل میں چست و چالاک
ہر سازِ طرب ہوا مہیّا :: سازوں نے مٹایا غم کا کھٹکا

"سوزِ عاشقاں" چھوٹی سی مثنوی ہے اور مجازی نہیں حقیقی ہے:

منظورِ عشق، یا خدا، ہو دل :: مصدرِ صدمۂ صفا ہو دل
گُل پہ گُل روز سیکڑوں کھائے :: بے کلی سے ذرا نہ گھبرائے
زخم اس کا نہ ہو رفو برسوں :: اور ٹپکا کرے لہو برسوں
اشک چمکائے چشمِ گریاں سے :: برق چمکائے آہِ سوزاں سے
آتشِ عشق سے جلے ہمہ تن :: خرمنِ ننگ پر ہو شعلہ مگن
ایسا سوزِ دروں سے ہو بیتاب :: غم سے بن جائے جاہِیِ بے آب

راحت کی مثنوی "زہرہ و بہرام" نہ مل سکی۔ ڈاکٹر گیان چند نے مجھے بتایا کہ اس پر ڈاکٹر محمد باقر کا ایک مضمون اورینٹل کالج میگزین کے فروری نمبر ۱۹۴۳ء ۳۶۲ الف میں شائع ہوا تھا۔ مگر کوشش کے باوجود یہ پرچہ مجھے دستیاب نہ ہو سکا۔ خود باقر صاحب نے عنایت فرمائی سے معذوری ظاہر کی۔

راحت - منشی چتربھوج سہائے

صاحبِ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بتایا ہے کہ راحت موصوف مسلا،

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جیسا کہ ڈاکٹر عقیل کے مقالہ سے ظاہر ہوتا ہے، ایک مثنوی "راحت سبھا" کے نام سے لکھی تھی، جس میں راجہ اندر کے اکھاڑے کا حال درج تھا۔ کوئی نمونہ نہیں مل سکا۔

راضی - منشی پیارے لال

راضی، آگرہ کے رئیسوں اور فاضل لوگوں میں سے تھے۔ اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے راجہ جسونت سنگھ کے زمانہ میں وہ وکیل ریاست بھرت پور رہے تھے۔ شاعری کا اچھا ذوق تھا۔ بشاش اور عشرت لکھنوی نے اُن کا تخلص راضی بتایا ہے مگر شہابی صاحب نے انہیں رضی لکھا ہے۔ عشرت صاحب نے اُن کا نام پیارے لال لکھا ہے، مگر بعض جگہ بہاری لال کر کے ذکر ہوا ہے۔ ۱۸۹۵ء/۱۳۱۳ھ میں بعالمِ ضعیفی انتقال فرمایا۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے :ے

کیوں نہ اچھوں کو بُرے گھیرے رہیں، اللہ نے
خاروں میں گُل، پتّھروں میں سیم و زر پیدا کیا

راضی بہت پُرگو شاعر تھے اور اُن کے اکثر اشعار مشہور اور ضرب المثل کی حد تک معروف ہیں۔ مثلاً یہی ایک شعر :ے

بھول جاتا ہے آپ کو، کم ظرف
کچھ بھی گر اقتدار ہوتا ہے

راضی نے تین مثنویاں لکھی تھیں جن میں انھوں نے گلستاں، بوستاں اور انوارِ سہیلی کو نظم کیا تھا۔ "نگارِ راضی" (گلستاں) کا نمونہ یہ ہے :ے

تھا حکیموں میں نامی ایک حکیم ÷ اپنے فرزند کو برائے سلیم
ہوا مانع زیادہ کھانے سے ÷ خوف بیماری کا دکھانے سے
کہ پسر، سیری رکھتی ہے رنجور ÷ مرد کو سیری سے حذر ہے ضرور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"دلا رام راضی" (بوستاں) کا نمونہ یہ ہے:۔

قحط ایسا دمشق میں آیا ؛ فرق یاروں کے عشق میں آیا

سعدی کے شعر:۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق ؛ کہ یاراں فراموش کردند عشق

کا کیا صحیح اور صاف ترجمہ ہے؟ راضی نے مثنوی نگاری کی دنیا میں یہ انوکھا کام کیا تھا کہ سعدی کی گلستاں، بوستاں کو نظم کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ اردو اور فارسی دونوں کی کامل صلاحیت اور ترجمہ کی پوری قدرت رکھتے تھے۔ مگر اس ترجمہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لطافت مطلقاً کھو دے، جیسا کہ عام طور پر ترجموں میں ہوا کرتا ہے۔ مثلاً اسی مثنوی کے یہ شعر کیسے حسین ہیں:۔

ہوا ایسا زمیں پہ چرخ بخیل ؛ کئے ترلب نہ اس نے کشت ونخیل

ہوئے جاری نہ چشمہ ہائے قدیم ؛ خشک تھا کل، سوائے چشم یتیم

"انوار سہیلی" کا نمونہ یہ ہے:۔

کرتا ہوں اس کتاب کا آغاز ؛ نام سے اس کے جو ہے واقف راز

گرد کشمیر مرغزار تھا ایک ؛ گویا فردوس پُر بہار تھا ایک

تھی زمیں پر جو کثرتِ انہار ؛ بنی تھی صحن، گنبدِ دوّار

عکس ایماں سے اس کے زاغ کا پر ؛ دُمِ طاؤس سا تھا آتا نظر

جہاں تک قدرتِ شاعری اور سلاستِ زبان کا تعلق ہے اِس میں کلام نہیں لیکن جس حد تک مزے داری کا تعلق ہے، کوئی خاص مرتبہ نہیں۔

راغب ۔ منشی سمن لال

صاحبِ "اردو مثنویاں" نے، بلوم ہارٹ کے حوالے سے بتایا ہے کہ راغب نے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ایک مثنوی "راجہ چیتر مکٹ و رانی چندر کرن" کے نام سے لکھی تھی۔ راغب امروہے کے رہنے والے تھے۔ راغب نے یہ مثنوی لکھ کر سر ہنری ایلیٹ گورنر کے نام سے معنون (DEDICATE) کیا تھا جسے وہ اپنا مربی کہتے اور سمجھتے تھے اور جس کی شان میں چند قصیدے اسی مثنوی میں شامل ہیں۔ ایک شعر میں اپنا ذکر یوں کیا ہے :-

سمن لال معروف ہوں در جہاں ؛ تخلص ہے راغب، مرا دوستاں

ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی "اردو مثنوی شمالی ہند میں" میں اُن کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دو ہزار سینتیس ۲۰۳۷ اشعار کی لمبی مثنوی ہے ابتدائی نو ۹ فصلوں میں ایلیٹ صاحب اور امروہہ کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ جس نسخہ کو جین صاحب نے کیٹلاگ میں دیکھا تھا وہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۱ ستمبر ۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ برٹش میوزیم میں ہے۔ نمونہ کہیں سے نہ ملا۔

رائے ۔ منشی اروڑا رائے

صاحب "اردو مثنویاں" نے "سوہنی مہیوال" کے ذکر میں کہا ہے کہ اروڑا رائے کی بھی ایک مثنوی، اس قصہ پر دریافت ہوئی ہے جو برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ یہ مثنوی ۱۸۷۱ء ۱۲۸۸ھ میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اسّی صفحات ہیں۔ اندازہ ہے کہ رائے نے انت رام بیتاب کے نثری نسخہ کو سامنے رکھ کر یہ مثنوی لکھی تھی۔ نمونہ نہیں مل سکا۔

رعد ۔ منشی خوب لال

رعد، ہنڈیا ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے مگر اُن کے والد منشی گنیش پرشاد کا قیام ریاست گوالیار میں رہا کیونکہ اُن کے بہنوئی انت پرشاد، گوالیار میں کونسل اور ایجنسی کے ممبر تھے۔ رعد، اردو، فارسی اور انگریزی میں یکساں استعدادِ کامل رکھتے تھے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

۱۸۹۸ء / ۱۳۱۶ھ میں گوالیار میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۰۲ء / ۱۳۲۰ھ سے شاعری شروع کی اور داغ کے شاگرد بنے۔ اُن کی ایک مثنوی "نغمۂ رازِ حقیقت" ہے جو شاید ۱۹۲۸ء / ۱۳۴۷ھ میں چھپ گئی تھی۔ نمونہ نہیں مل سکا۔

رفعت — منشی منّو لال

رفعت، مراد آباد میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "مفید الدہر" لکھی تھی جس میں پند و نصائح وغیرہ کو صنعتِ تجنیس قافیہ میں نظم کیا تھا۔ شعر کو 'بازیگری' بنا دینا عجیب مذاق ہے۔ صنعت گری سے شعر کی عظمت و روانی اور لطافت و شاعرانہ دل پذیری ختم ہو جاتی ہے اور خاص طور سے پند و نصائح تو اور بھی سلاست و لطافت کے خواہاں ہیں۔ تکلّف و تصنّع سے وہ کبھی باثمر اور بار آور نہیں ہو سکتے۔ نمونہ یہ ہے:-

عدل سے آپ کو، تہی مت کر :: عدل سے آپ، کوتہی مت کر
رہِ انصاف سر کے بل، سر کر :: رہِ انصاف میں فدا، سر کر
عدل کر، عدل کر، نہ کر بیداد :: مخلصی ہے نہ حشر میں، بے داد

رِند — منشی لکھیم نرائن

ڈاکٹر عقیل نے "اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں" میں بتایا ہے کہ رند نے ایک مثنوی "باغ و بہار" کے نام سے لکھی تھی۔ یہ لکھنؤ کے تھے۔ صاحبِ "ہندو شعرا" نے انہیں "نبیرۂ راجہ لچھمی نرائن و رفیق مہاراجہ ٹکیٹ رائے" بتایا ہے۔ نمونہ کہیں نہیں ملا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

رنگین — منشی رنگین لال

صاحب "اردو مثنویاں" نے لکھا ہے کہ بشاش نے رنگین کو خیالی رام خیالی لکھنوی (شاگرد قتیل (وفات سنہ ۱۸۸۲ء / ۱۲۹۹ھ) کا برادر زادہ اور منشی جواہر سنگھ جوہر (شاگرد ناطق وفات سنہ ۱۸۸۰ء / ۱۲۹۶ھ) کا شاگرد لکھا ہے۔ رنگین نے "سنگھاسن بتیسی" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جو لکھنؤ سے چھپ گئی تھی۔ نمونہ نہیں ملا۔

رواں — منشی جگت موہن لال

رواں، ۱۴ر جنوری ۱۸۸۹ء / ۱۳۰۶ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء / ۱۳۵۳ھ کو انتقال کئے۔ ان کے والد کا نام چودھری گنگا پرشاد تھا۔ رواں کا آبائی وطن اناؤ تھا، مگر قیام لکھنؤ میں رہا اس لئے خود اور دوسرے بھی رواں کو لکھنوی ہی کہتے اور بولتے تھے۔ شاعری شروع کی تو پہلے افضل لکھنوی کے، بعدہٗ عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور واقعہ یہ ہے کہ عزیز نے رواں کو رواں کر دیا۔ رسالہ سہیل (علیگڑھ) میں جب ان کی دو ایک غزلیں شائع ہوئیں تو وہاں سے مشورہ دیا گیا کہ:-

"غزل گوئی کا میدان تنگ ہے اور بالخصوص لکھنؤ کا رنگِ تغزل روز بروز تنگ ہوتا چلا جاتا ہے اور جناب رواں کی جدتِ طبع اور زورِ خیال کے لئے ایک وسیع تر میدان کی ضرورت ہے۔ بہتر ہو کہ اگر رواں "غزلگوئی" جہاں تک ممکن ہو کم کریں اور اپنا وقت عزیز "نظموں" کی تصنیف میں گزاریں۔"

شاید رواں نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور وہ نظم کی جانب متوجہ ہو گئے۔

رواں نے دنیائے مثنوی نگاری میں، پہلی بار مثنوی کو سوانح حیات کے کام میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لایا اور مثنوی "گوتم بدھ" لکھی۔ رواںؔ کے سوا غالباً اردو زبان کے کسی شاعر نے اس عنوان کو اپنا موضوعِ فکر نہیں بنایا۔ رواںؔ مرحوم، بڑے ہی آزاد خیال، بلند نظر اور انسان نواز شخص تھے۔ وہ مذہب پر انسانیت کو اور خدا پر انسان کو ترجیح دیتے تھے۔ اقبالؔ نے کہا تھا:۔

"میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا"

بدھ ازم میں بھی یہی چیز ہے۔ وہاں خدا کا تصوّر ہی نہیں پایا جاتا صرف عملِ نیک اور کارِ خیر پر سارا زور اور مذہب کا دارومدار ہے۔ اور پھر عمل میں بھی عذاب و ثواب کا تصوّر اور اندیشہ و امید نہیں بلکہ صرف بر بنائے انسانیت، اس کی فرضیت لازم کی گئی ہے۔ وہاں عملی کارِ خیر صرف اس لیئے کیا جاتا ہے کہ انسانی زندگی کو مصائب و آلام سے نجات دلائی جائے۔ اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کی، بلا تفریقِ نسل و رنگ اور عقیدہ و مسلک خدمت کی جائے۔ رواںؔ کا بھی یہی مطمحِ نظر تھا، فرماتے ہیں:؎

مآلِ زندگی ہے کام کرنا، کام کرتا ہوں
مانتھے ہے، اگر ہو کاوشِ سُود و زیاں مجھ کو

رواںؔ ہر چیز کو بدھ ازم کی فلسفیانہ بلند نظری سے دیکھتے تھے۔ "تصوّف" میں بھی بجز خدا کے اور کسی چیز کا لوگ یقین نہیں رکھتے۔ "بدھ ازم" میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، خدا کا کوئی تصوّر نہیں ہے کہ اُس پر ایمان و یقین کا سوال پیدا ہو۔ رواںؔ کا بھی یہی تصوّر تھا، فرماتے ہیں:؎

رواںؔ، سوائے اجل، اِس جہانِ فانی میں
نہیں ہے اور کوئی شے، یقین کے قابل

"موت" کو "یقین" کے لفظ سے قرآنِ حکیم میں بھی یاد کیا گیا ہے:۔

"تم اپنے پروردگار کی عبادت کیے جاؤ یقین (موت) آنے تک"

(الحجر ۶ - $\frac{15}{99}$)

رواںؔ کا جو "یقین" صرف "اجل" تک محدود تھا وہ بالآخر آ ہی گیا۔ اور ابھی وہ مثنوی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مکمل بھی نہ کر پائے تھے اور جنگل کی صبح کا منظر قلمبند فرما رہے تھے کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ رواںؔ کے سب سے بڑے دوست کرشن سہائے وحشیؔ کانپوری نے ، باقی حصہ کو نظم کر کے مکمل کیا اور اسے شائع کرا دیا۔ اس طور پر یہ مثنوی یا محنت ضائع ہونے سے بچ گئی۔

مثنویاں عام طور سے حمد یعنی خدا کی تعریف سے شروع ہوتی ہیں، رواںؔ کا رجحان "بدھ ازم" کی طرف تھا جہاں خدا کا کوئی تصور نہیں ہے اس لئے انھوں نے کوئی حمد نہیں لکھی، بلکہ مثنوی یوں شروع کی: ؎

آدمی ہے آئینہ خانہ میں دنگ ÷ عقل منہ ور اور پائے فکر لنگ
خالق اس ارض و سما کا کون ہے ÷ بانیٔ اس بزمِ بقا کا کون ہے؟
کھل نہیں سکتا کبھی ہرگز یہ راز ÷ بے محل ہے مذہبوں کی ترکتاز
جتنے پردے ہم اٹھاتے جائیں گے ÷ اور پردے آگے آتے جائیں گے

شاید اُن کی نگاہ میں، دیوی دیوتا اور بتوں کی بھی کوئی عظمت و اہمیت نہ تھی: ؎

سنگ دل، سنگیں بدن بنگیں قبا ÷ ان بتوں سے کیا تمنائے وفا
یہ مدد آخر ہماری کیا کریں ÷ دیوتا بیکار ہیں، مجبور ہیں
سارے یہ بلدان اور قربانیاں ÷ یہ عبادت ہے کہ خوت، بے گماں
دیوتا گر ایسے نعوں آشام ہیں ÷ آخر ان کے "دیوتا" کیوں نام ہیں؟

جبر و قدر اور مجبوری و مختاری کا مسئلہ بڑا الجھا ہوا ہے۔ میرؔ نے کہا ہے: ؎

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

پیارے لال راضیؔ نے کہا ہے: ؎

پست ہمت، روتے رہتے ہیں سدا تقدیر کو
صاحب ہمت، ہمیشہ کرتے ہیں، تدبیر کو

رواںؔ، عظمتِ انساں کو یوں ظاہر کرتے ہیں: ؎

دوسرا رخ بھی ہے اِس تصویر کا ÷ نام ہے تقدیر بھی، تدبیر کا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

وہ اس سلسلہ میں ثبوت و دلائل بھی رکھتے ہیں اور پورے اطمینان سے فرماتے ہیں: ؎

از زمیں تا آسمانِ ہفتمیں ∴ کیا ہے جو انساں کے امکاں میں نہیں؟
عرشِ اعلیٰ ہے مقامِ آدمی ∴ نار و جنت ہیں، مقامِ آدمی
آپ اپنا سحر بھی، تسخیر بھی ∴ آپ اپنا زہر بھی، اکسیر بھی
آدمی یرا، چاہیے حسنِ عمل ∴ ہے یہی ہر عقدۂ مشکل کا حل

چاند و مریخ تک کی پرواز، کیا یہ ثبوت نہیں کہ رواں کا کلام الہامی ہے؟ فلسفۂ موت وحیات سنئے: ؎

یا بڑھے یا آدمی پیچھے ہٹے ∴ اک مقامِ مستقل دشوار ہے
یوں ہی دنیا چال چلتی جائے گی ∴ ظاہری صورت بدلتی جائے گی
ہے یہی تعبیرِ روحِ کائنات ∴ ہیں یہی تبدیلیاں رازِ حیات
موت سے ڈرنا خیالِ خام ہے ∴ موت انہیں تبدیلیوں کا نام ہے
ہے تغیر تا قیامِ کائنات ∴ ہے تغیر تک یہ سب رنجِ وحیات
حدِّ منزل تک اگر آجائیں ہم ∴ اس تغیر سے رہا ہو جائیں ہم
گر نہ ان تبدیلیوں سے ہو نجات ∴ پھر تو ہے دار المحن، دار الحیات

رواں مسئلہ تناسخ کے شاید قائل تھے۔ آخری اشعار سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ بہرحال! ان کا یہ شعر بڑا قیمتی ہے: ؎

ہے فقط حسنِ عمل، تزئینِ زیست
خدمتِ خلقِ خدا، آئینِ زیست

سالک — منشی سالک رام

سالک، غازی پور کے رہنے والے تھے۔ شاعری میں وہ شمشادِ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ صاحب "ہندو شعرا" نے انہیں ۱۹۳۱ء میں بقیدِ حیات لکھا ہے۔ صاحبِ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"اردو مثنویاں" نے "ستّی بنّوں" کے ذکر میں سالک کی بھی مثنوی "ستّی بنّوں" کا ذکر کیا ہے۔ نمونہ نہیں مل سکا۔

سحرؔ - منشی دیبی پرشاد

سحرؔ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۴۰ء / ۱۲۵۵ھ کو پیدا ہوئے۔ اجداد کا وطن بانگرمئو مضافاتِ سندیلہ (اودھ) تھا۔ مگر ان کا قیام برابر دلّی اور لکھنؤ میں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے والد منشی چُنّی لال اخگرؔ اور ان کی والدہ دونوں شاعر تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہوئے اور ڈپٹی انسپکٹری کے عہدہ سے پنشن حاصل کی۔ سحرؔ بحرالعلوم تھے۔ مختلف علوم و فنون میں ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ خطّاطی میں یگانۂ روزگار تھے اور ان کے سیکڑوں شاگرد نامور ہوئے ہیں۔ صاحبِ دیوان تھے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۰۵ء / ۱۳۲۳ھ کو انتقال کیے۔

صاحبِ "تذکرہ شعرائے ہنود" نے ان کی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے جس کا نام "نظم پروین" تھا۔ نمونہ نہیں ملا۔ ہر چند کہ "نظم پروین" مثنوی بھی ہو سکتی ہے، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ یہ مثنوی نہیں بلکہ خطّاطی سے متعلق کوئی کتاب ہوگی۔ اور مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے بچپن میں کتاب اپنے یہاں دیکھی تھی۔

سحرؔ - منشی اقبال ورما

سحرؔ، ہتگام کے رہنے والے نہایت صاحبِ علم و فضل اور زبان آور شاعر تھے۔ انھوں نے شکنتلا کے قصہ کو "نیرنگِ سحرؔ" کے نام سے مثنوی کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ مثنوی انھوں نے ۱۹۱۰ء / ۱۳۲۸ھ سے لکھنی شروع کی تھی۔ اور ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۴ھ میں ختم کی تھی، جو اُسی سال شائع بھی ہو گئی تھی۔ جس طرح کالیداس نے ایک ولولہ انگیز

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کامیڈی کو دردانگیز ٹریجیڈی میں بدل دیا ہے، اسی طرح سحر نے بھی اپنی طرف سے حک و اضافہ فرمایا ہے۔ "التماس" میں خود فرمایا ہے کہ:-

"یہ نظم قریب قریب بالکل میری طبعزاد ہے۔ اصل ڈرامہ کی تقلید صرف اسی حد تک کی گئی ہے، جہاں تک محض خاص خاص واقعات کا تعلق ہے۔ نیز قصہ کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے مجھ کو چند ابواب کا بطور خود اضافہ بھی کرنا پڑا ہے"

نمونہ کے لئے سراپا کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

فرق اُس کا تھا تختِ فہم و ادراک ۔ تمثال نمائے صنعتِ پاک
پیشانی میں آئینہ کی تنویر ۔ دکھلاتی شان، حسنِ تقدیر
پُتلی آنکھوں میں جلوہ گر تھی ۔ یا مہر کی چرخ پر نظر تھی
پلکیں تھیں برنگِ ابرِ دلجو ۔ دو قوسِ قزح تھیں دونوں ابرو
رخساروں میں کچھ عجب سماں تھا ۔ سعدین کا باہمی قِراں تھا
وہ گردنِ سرخ مست و مغرور ۔ شیشہ میں بھری شراب انگور

نہایت عمدہ شعر ہے۔ شکنتلا کے جذبات کی تصویر :-

واں تک نہ گیا خروش تیرا ۔ اے نالہ! عبث ہے جوش تیرا
اے عشق! یہ نفرتِ وفا کیوں؟ ۔ مظلوم پہ جبر کیوں؟ جفا کیوں؟
احساں ترا کیا رہے گا مجھ پر ۔ نکلی جو تڑپ کے جانِ مضطر؟
اے دل! تجھے ہائے کیا ہوا ہے ۔ کیا دہر میں تو ہی مبتلا ہے؟

آخر میں یہ مثنوی اصل کی طرح کامیڈی بنا دی گئی ہے:-

تصویر جو راہ پر پائی ۔ تو جادۂ وصل پر وہ آئی
یعنی یہ چلی اِدھر سے پُر شوق ۔ دیکھا اُدھر اُس کو شہ نے باذوق
رُک رُک کے قدم بڑھاتے دیکھا ۔ شرماتے، لجاتے، آتے دیکھا

اِس شعر کو پڑھ کر قرآن عظیم کی ایک آیت یاد آگئی جو حضرت موسیٰ کے ذکر میں ہے کہ:-

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"پھر موہنی کے پاس ایک لڑکی آئی جو شرماتی ہوئی چلتی تھی۔"
(قسم ۳ - $\frac{۲۸}{۲۵}$)

لوگ قرآن مجید کو ایک خشک کتاب سمجھتے ہیں۔ بھلا فطری شعریت کی اس سے بہتر مثال کیا ملے گی؟ آگے ملاحظہ فرمائیے: ؎

جانا دلدار دلربا کو :: پہچان لیا شکنتلا کو
آنکھوں میں لیا وہیں نظر ساں :: پہلو میں لیا وہیں جگر ساں
عارض کی نگہ سے لیں بلائیں :: گیسو کی مژہ نے لیں بلائیں
قربان کیے نثار گوہر :: آنکھوں نے کیے نثار گوہر
واں شرم تھی مقتضائے فطرت :: یاں اپنے کیے پہ تھی ندامت
نظارۂ اجتماع وہاں تھا :: باہم مہر و مہر کا قراں تھا

خاتمہ یوں ہوا ہے: ؎

سامانِ طرب جو تھے فراہم :: سب رہنے لگے خوشی سے باہم
تھا شاہ بھرت وہ طفلِ خوش کام :: مشہور ہے جس کا آج تک نام

اس مثنوی کے بارے میں صاحب "خمخانۂ جاوید" کی رائے ہے کہ:-

"سحر نے فسانہ شکنتلا کو اردو کا جامہ پہنا کر مثنوی نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔"

یہ مثنوی "گلزارِ نسیم" کی بحر میں ہے۔ انداز بھی ویسا ہی ہے، مثلاً: ؎

بھاگی وہ اُدھر سے ہٹ گئی پھر :: جھجکی، ٹھٹھکی، سمٹ گئی پھر

منشی دیا نرائن نگم نے فرمایا ہے کہ:

"ہمارے خیال میں اس کی بندش میں گلزارِ نسیم سے کہیں زیادہ شعریت اور جدّت ہے۔"

بلاشبہ، یہ صحیح ہے۔ گلزارِ نسیم لکھنؤ اسکول کی آئینہ دار ہے اور وہ اس مثنوی کے پایہ کو نہیں پہنچتی۔ نگم صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:-

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"اب تک کسی نے اس کو مثنوی کی صورت میں لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔"

یہ صحیح نہیں ہے۔ سحر سے بہت پہلے نہ صرف مسلمان شعرا سید قمر تقی "رشکِ گلزار" کے نام سے اور غلام احمد "فراموش یاد" کے عنوان سے مثنوی ہی کی صورت میں اس قصہ کو لکھ چکے تھے، بلکہ ایک ہندو شاعر کنور عنایت سنگھ بھی ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء میں "غازۂ تعشق" کے نام سے اس کہانی کو اردو مثنوی کا جامہ پہنا چکے تھے۔

سرشار ۔ پنڈت رتن ناتھ

سرشار اردو زبان کے مشہور ترین ادیبوں اور نثاروں میں سے ہیں۔ ان کے والد کا نام پنڈت بیجناتھ پرشاد تھا۔ کشمیری برہمن تھے۔ لکھنؤ میں ان کا خاندان بہت ممتاز تھا۔ ۱۸۵۱ء / ۱۲۶۸ھ میں کشمیر میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۳ء / ۱۳۲۱ھ میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ شاعری میں مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ مدت تک "اودھ اخبار" لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ آخر عمر میں حیدرآباد چلے گئے تھے اور وہاں "دبدبۂ آصفی" کے مدیر ہوئے اور وہیں پچپن ۵۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ "فسانۂ آزاد" اردو کی ایک ممتاز و مشہور کتاب انہی کے قلم کی مرہونِ منت ہے اور اسی کتاب کی وجہ سے سرشار زندۂ جاوید بن گئے ہیں۔

سرشار نے دو مثنویاں لکھی تھیں ایک "ساقی نامہ" جس میں سراپا خوب ہے۔ نمونہ یہ ہے:

حسن پر اس پری کے کی جو نگاہ ٭ نظر آئی وہ شکل غیرتِ ماہ

حسن و خوبی میں وہ بتِ مغرور ٭ سر سے پا تک بہ رنگِ شعلۂ نور

مست صہبائے غمزہ و انداز ٭ اٹھتا جوبن، شباب کا آغاز

انکھڑیاں قہر کی نگاوٹ باز ٭ دلربا بات کا نیا انداز

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نشّہ کے لال لال وہ ڈورے ٭ جس پہ نرگس کے پڑتے ہیں ڈولے
ناک میں بھی وہ نور کا تڑکا ٭ چشمِ زہرہ میں جس کے کھٹکے منیا
اور گلے میں وہ نور کی ہیکل ٭ دیکھ کر جس کو جان ہو بیکل
کاندھوں پر وہ ڈوپٹہ ململ کا ٭ فالسائی رنگا ہوا ہلکا
کُرتی شبنم کی آستینوں دار ٭ ملگجے پن پہ اُس کے اور بہار
نشّۂ بادۂ شباب سے چور ٭ چال مستانہ حُسن پر مغرور
سیکڑوں بل کمر کو دیتی ہوئی ٭ جانِ طاؤس و کبک لیتی ہوئی

دوسری مثنوی "تحفۂ سرشار" ہے یہ اُس وقت لکھی گئی تھی جب پنڈت بشن پرشاد نرائن در کے ولایت سے واپس آنے پر ملک میں طوفانِ بے تمیزی برپا کیا گیا تھا: ؎

لندن کی بلا دو آتشہ مے ٭ اے پیرِ مغاں! کہاں چھپی ہے؟
ہاں بس سے گا میکدہ برائے یار ٭ رندوں کو جو تو کرے گا سرشار
وا ناب پلوا شراب اچھوتی ٭ خوشبو، خوش رنگ، تیز، چوکھی
کوثر کی کبھی نہیں ہے منظور ٭ لیڈی وائن، جسے پیئے حور
گھنگھور گھٹا ہے آج بادل ٭ میخانے کو کر دے تو جل تھل
برسا دے شرابِ ناب ساقی! ٭ دکھلا دے آفتاب ساقی!
فتوی ہی کاشی کا کون مانے ٭ لاکھوں میں ہیں ہوں، کھلے خزانے

سرشار کا قلم، نثر کی طرح نظم میں بھی تیز تھا۔ اُن کا شعر: ؎

نشّہ کے لال لال وہ ڈورے ٭ جس پہ نرگس کے پڑتے ہیں ڈورے

پڑھا تو مجھے اپنے ایک ہندو دوست راجندر ناتھ وحشی کا ایک شعر یاد آ گیا جو مجھے بہت پسند ہے: ؎

نہیں ہے آنکھوں میں تیرے یہ سرخ سا ڈورا ٭ لگی ہوئی ہے ذرا سی شراب شیشے میں

یہ تشبیہ ایسی نازک، باریک اور لطیف ہے کہ اور کہیں نظر نہیں آئی۔ سرشار کی صبح کا سماں ملاحظہ ہو: ؎

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جھلکا جھلکا سپیدۂ صبح ٭ ہلکا ہلکا سپیدۂ صبح
بھینی بھینی مہک گلوں کی ٭ اور نغمہ زنی وہ بلبلوں کی
اے ساقیٔ مہ لقا! یہ دم ہے ٭ اے مردِ خدا اب خواب کب تک؟
وقتِ سحر اور خنک ہوا ہے ٭ سب سے سب کر کرا مزا ہے
دریا کی طرف چلے نہانے ٭ غٹ پریوں کے زنان خانے
مرغانِ چمن یہ نکتہ رانی ٭ چوں برہمناں بہ وید خوانی

سرور — منشی خوشی لال

صاحبِ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بتایا ہے کہ سرور نے ایک مثنوی "نالۂ نایاب" کے نام سے ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء میں لکھی تھی۔ سرور کا وطن پٹیالہ تھا جو ضلع ایٹہ میں ہے۔ اُن کی اِس مثنوی کا ذکر ڈاکٹر عقیل نے بھی اپنے مقالہ "اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں" میں کیا ہے۔ نمونہ کسی نے نہیں دیا۔

سیوا — منشی رام راؤ

سیوا کا کچھ زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا، جتنا کچھ ملا تھا وہ مقدمہ میں پیش ہو چکا ہے۔ اُن کی ایک مثنوی "روضۃ الشہدا" تھی جو نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعاتِ کربلا کے بیان پر مشتمل ہوگی۔

شاد — منشی بھوانی پرشاد

ڈاکٹر جین نے بتایا ہے کہ شاد نے "شاد نامہ" کے نام سے ایک ہندوستانی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شاہنامہ یا ہندوستان کی منظوم تاریخ بہ شکلِ مثنوی، دو جلدوں میں لکھا ہے، جن کے اشعار کی تعداد چوبیس ۲۴ ہزار ہیں۔ یہ شاہنامہ ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں چھپ گیا تھا۔ نمونہ یہ ہے: ؎

راجہ پانڈو، صاحبِ تدبیر، چمکا کر کے برق دم شمشیر
زورِ پنجہ سے توڑا پنجہ غنیم :. اپنے قبضے میں لایا ہفت اقلیم

مثنوی کوئی خاص مرتبہ یا زور نہیں رکھتی۔

شاد ــ مہاراجہ سر کشن پرشاد

یہ شاد، محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ اردو زبان کے مشہور و معروف ادیب اور شاعر ہیں۔ راجہ ٹوڈر مل کی نسل کے مشہور مہاراجہ چندو لال شاداں آنجہانی (وفات ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء) کے نواسے اور حکومتِ آصفیہ حیدر آباد، دکن کے وزیر اعظم تھے۔ حکومتِ برطانیہ سے "KNIGHT HOOD" یعنی "سر" کا خطاب پائے ہوئے تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کے علاوہ تمام دکنی زبانوں اور بعض یوروپین زبانوں میں بھی مہارتِ تامّہ رکھتے تھے۔ ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء میں انتقال فرمایا۔ عام طور سے اُن کی دو مثنویاں مشہور ہیں جن کا ذکر متعدد جگہ ہوا ہے۔ مگر صاحبِ "بہارِ سخن" نے ان کی اور بھی چند مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ تمام اذکار کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل پانچ مثنویاں اُن کا نتیجۂ فکر ہیں: ؎

(۱) آئینۂ وحدت

(۲) آئینۂ وجود

(۳) سرِّ وجود

(۴) پیاری باتیں

(۵) جلوۂ کرشن

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"پیاری باتیں" کا نمونہ یہ ہے :-

ساقی دے جامِ ارغوانی ٭ جس سے ہو اُمنگ پر جوانی
طاقت نہیں مجھ کو، کر توانا ٭ غم منہہ سے لگا، نہ کر بہانا
آمادہ ہوں آج کچھ لکھوں میں ٭ مدحِ خواجہ میں کچھ کہوں میں
ممدوح کی مدح لکھ رہا ہوں ٭ مداحِ حبیبِ مصطفےٰ ہوں

"جلوۂ کرشن" کا نمونہ یہ ہے :-

یہ قہر کا گرم آشیانہ ٭ وہ مہر کا سرد آستانہ
تریاق بھی اور زہر بھی تھا ٭ تھا مہر بھی اور قہر بھی تھا
تھا سوز بھی اور ساز بھی تھا ٭ تھا ناز بھی اور نیاز بھی تھا
جبّاری و قہرِ جاں ستانی ٭ اور شفقت و لطفِ مہربانی

کنس کے قتل کے موقع کی منظر کشی فرمائی ہے :-

نیرنگیٔ دہر کے کرشمے ٭ عبرت کے سبق کے ہیں نمونے
آلودہ بہ خوں تڑپ رہا ہے ٭ سرتن سے کہیں جدا پڑا ہے
بیجا تھا غرورِ حکمرانی ٭ عبرت کی ہے جا جہانِ فانی
جو تاجوروں کا تاج لیتا ٭ راجاؤں سے جو خراج لیتا
بیجان پڑا ہے سر کٹائے ٭ سب دور ہیں پاس کون آئے؟
تاج اُس کا زمین پر پڑا تھا ٭ جو ظلم کو رحم جانتا تھا

اِس مثنوی کا قطعہ تاریخ مرزا عابد بیگم ریختی گو (وفات سنہ ۱۹۴۰ء / ۱۳۵۸ھ) نے کہا ہے جو حیدر آباد کے رہنے والے تھے :-

اے میں صدقے ہو گئی سب پیاری پیاری بول چال
دیکھتے ہی لوٹ ہو جاتا ہے جس پر سب کا جی
اُس کے بَل بَل جائیے، جس نے سنوارا ہے اسے
اس کی چیپ سختی پہ صدقے، ہے پرستاں کی پری

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

چاہ والوں کی چھیتی ہے، یہ یوسف کی طرح

دیکھیں تو قربان ہو جائیں، زلیخا جان بھی

شاد کی خدمت میں یہ تاریخ بیگم منزہ دد

مثنوی اُن کی نویلی ہے، چھیتی، موہنی

اس سے ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء برآمد ہوتا ہے۔

شاداں۔ منشی بساون لال

شاداں، اردو سے زیادہ فارسی زبان کے شاعر و ماہر تھے اور صاحبِ علم و عقل، فہم و بصیرت اور ہمت و شجاعت تھے۔ وہ نواب امیر خاں، والیٔ ٹونگ (وفات سنہ ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) کے میر منشی اور معتمد خاص تھے اور جب کبھی ضرورت ہوئی تو دالسرائے ہند سے ملنے برابر یہی بطور سفیرِ ریاست بھیجے جاتے تھے۔ پوری ریاست میں وہ سب سے زیادہ صاحبِ صلاحیت اور قابلِ اعتماد رکنِ حکومت تسلیم کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے لیے ان کو موقع بہت کم ملتا تھا۔ اُن کی ایک اردو مثنوی "کھٹمل نامہ" ہے جس کا نمونہ یہ ہے:-

ذکر کھٹملوں کا کیجیے گر ارقام ॰ نقطے کاغذ کو کاٹتے ہیں تمام

کھٹملوں سے دوات ہے لبریز ॰ رنگ سیاہی ہے شنگرف آمیز

شاکر۔ پنڈت پیم نرائن

شاکر کانپور کے رہنے والے صاحبِ استعداد اور خوش فکر شاعر تھے۔ بلال لکھنوی (وفات ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء) کے شاگرد تھے۔ انھوں نے "گلزارِ نسیم" کے جواب میں ایک مثنوی "بہارِ کشمیر" کے نام سے لکھی تھی جس میں قصۂ سروشِ سخن کو ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نظم کیا تھا۔ یہ مثنوی ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء میں چھپ گئی تھی۔ نمونہ یہ ہے :۔

چڑیاں پیڑوں پہ بولتی تھیں ✤ اُڑنے کو پر اپنے تولتی تھیں
ہشیار ہوئے تھے مرغ و ماہی ✤ چلتی تھی نسیم صبح گاہی
مسجد، گرجا، شوالہ، درگاہ ✤ ہر ایک جا تھا، ذکرِ اللہ
بابِ رحمت کھلا ہوا تھا ✤ ہنگامِ اجابتِ دعا تھا
سرخی جو شفق کی تھی نمودار ✤ پَو پھٹنے کے سر بسر تھے آثار

شاکر۔ پنڈت شیو ناتھ کول

شاکر، گوالیار کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام پنڈت کاشی ناتھ تھا۔ ان لوگوں کا قیام بنارس میں تھا اس لیے کہ شاکر وہاں مہاراجہ بنارس کے اسٹیٹ میں نائب دیوان کے معزز عہدہ پر فائز تھے۔ شاکر، پہلے منشی روشن لال دانا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور رشید تخلص اختیار کیا تھا۔ جب استاد بدلا اور داغ کے شاگرد بنے تو تخلص بھی بدل دیا اور شاکر بن گئے۔ صاحبِ "بہارِ سخن" نے ان کی ایک مثنوی "مرآۃ الخیال" کا ذکر کیا ہے۔ مگر نمونہ نہیں مل سکا۔

شائق۔ لچھمن داس

شائق، یکم فروری ۱۸۹۷ء / ۱۳۱۵ھ کو پیدا ہوئے۔ حضرتِ لبھو رام جوش ملسیانی کے شاگرد ہیں۔ ان کی ایک مثنوی "نوائے الست" ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مرکبِ اضافی یا توصیفی استعمال نہیں ہوئے۔ نمونہ یہ ہے :۔

بالیقیں ہوں تری مخلوق میں، خالق تو ہے ✤ بے گماں رزق عطا کرتا ہے، رازق تو ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تجھ سے روشن مری آنکھوں میں ہے کیا راز یہ آشکارا ایسا ہے تو، پھر بھی کہاں ہے یا رب؟
خاک کا فرش مرے پاؤں تلے کس کا ہے؟ عرش آنکھوں سے ولے اور پرے کس کا ہے؟
چاند تاروں سے منوّر ہے شبستاں کس کا؟ لالہ و گل سے معطر ہے گلستاں کس کا؟
سانولا چہرہ ہے کس کا، یہ فلک پہ نہاں ہے؟ کون لیتا ہے یہاں شام و سحر انگڑائی؟
چھیڑ رکھا ہے مرے دل میں ترنم کس نے؟ میرے منظر میں بکھیرا ہے تبسم کس نے؟

شایاں - منشی طوطا رام

شایاں، قوم کائستھ سریواستو ایسے سے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام منشی آتما رام، دادا کا لالہ منشی منصور رائے اور پردادا کا لالہ منسا رام تھا۔ اچھے شاعر اور اعلیٰ صلاحیت کے مالک تھے۔ ان کے والد آتما رام بھی بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ عربی و ترکی زبانوں پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے ترکی زبان میں ایک قطعہ بھی نظم کیا تھا۔ شایاں فرماتے ہیں :-

وہ آتما رام بے شبہ تھے بے مثال ٭ کہ حاصل تھا منشی گری میں کمال
زبانِ عرب سے بھی آگاہ خوب ٭ سمجھتے تھے ترکی کی وہ راہ خوب
شہنشاہ تھا جنصر رہا اس کا نام ٭ اسی نظم سے ہے وہ رنگیں کلام
نہایت جو دلچسپ تھی داستاں ٭ کیا اس کو ترکی زباں میں بیاں
بنائی کتاب "ریاض اللغات" ٭ نہ چھوڑی کوئی اس میں مطلب کی بات

شایاں ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ۱۸۸۰ء / ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔ صاحبِ خمخانۂ جاوید نے لکھا ہے کہ :-

"آپ نے امیر حمزہ کی داستان اور الف لیلہ منظوم کی تھی اور مہابھارت کا بھی منظوم ترجمہ منشی نولکشور کی فرمائش سے لکھا تھا۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

صاحب "آثار الشعرائے ہنود" نے بھی ان ہی تین مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ صاحب "ہندو شعرا" بھی "الف لیلہ" اور "مہابھارت" کے ذاکر ہیں اور تیسری کا نام "طلسم شاہاں" بتلاتے ہیں، غالباً اس سے مراد داستان امیر حمزہ ہی ہے۔ مگر خود شایاںؔ نے "مہابھارت" کے دیباچہ میں اپنی چار مثنویوں کا ذکر کیا ہے:-

قلم سے نکلے چار قصے رقم ÷ کروہ نظم عالی کا بھرتے ہیں دم
رقم دو میں احوال ہیں طبعزاد + عیاں حسن اور عشق کے اتحاد
ستی کا ہے اک مثنوی میں بیاں ÷ اسی لکھنؤ کی وہ ہے داستاں
چہارم ہے اس داستاں سے کلام ÷ ندا جس پہ ہوں سن کے سب خاص و عام

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "مہابھارت" کے علاوہ جو اور تین مثنویاں انھوں نے لکھی تھیں، وہ متذکرہ مثنویوں سے مختلف تھیں جن میں دو طربیہ تھیں اور ایک حزنیہ۔ اور "الف لیلہ" نام کی کوئی مثنوی انھوں نے نہیں لکھی تھی اور نہ داستان امیر حمزہ لکھی تھی۔ جہاں تک داستان امیر حمزہ کا تعلق ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر یہ قرینِ قیاس بات نہیں کہ لوگوں نے غلط لکھ دیا ہے۔ اندازہ ہے کہ "مہابھارت" کے بعد یہ دونوں مثنویاں لکھی گئی تھیں، کیونکہ اس منظوم دیباچہ میں "الف لیلہ"، کا بھی ذکر نہیں ہے، مگر میں نے شایاںؔ کی یہ مثنوی خود دیکھی ہے۔ بہر حال! قرینہ یہی ہے کہ شایاںؔ نے دراصل چھ مثنویاں لکھی تھیں۔ تین مہابھارت کی تصنیف سے پہلے اور دو مہابھارت کی تکمیل کے بعد جو یہ ہیں:-

(۱) مثنوی حُسن
(۲) مثنوی عشق
(۳) مثنوی ستی
(۴) مہابھارت
(۵) طلسم شاہاں (یعنی داستان امیر حمزہ)
(۶) الف لیلہ (جس کو "ہزار داستان" بھی کہا گیا ہے)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"مہابھارت" کا ذکر ہیں نے اس کتاب کے حصہ دوم میں کیا ہے۔ اول الذکر تینوں مثنویوں اور "طلسم شاہانہ" کا نمونہ نہ مل سکا۔ "الف لیلہ" کا نمونہ یہ ہے: ؎

زمانہ، ساقیا ہے برسرِ جنگ ✻ نہ رکھ تو دیدۂ سوزاں سے دل تنگ
صبوحی دے، دلِ مشتاق ہے چور ✻ جھکی پڑتی ہے ساقی، چشمِ مخمور
پلا دے، ہو لیا دل کی بیکلی جاتے ✻ عنایت مجھ پہ ہے ساقی، چلی جائے

صبح کا سماں ملاحظہ ہو: ؎

جو نکلا خور۔ بیاضِ صبح لے کر ✻ رقم تھے نسخۂ پُرنور اس پر
ہوا مشرق سے پیدا شعلۂ طور ✻ شبِ مشکیں ہوئی چل پھر کے کافور

شایاں کی اس مثنوی میں "ساقی نامہ" بار بار آیا ہے اور خوب ہے: ؎

طبیعت کو دئے ہیں پھول نے خار ✻ یہ دارو راس آئے گی نہ زنہار
میں کیوں منت کشِ پیرِ مغاں ہوں ✻ نہ آبِ تلخ کو کیوں زہر سمجھوں!
مسیحا بن، پلا، دو چار ساغر ✻ مزاج اپنا ہے چوتھے آسماں پر
تمنا ہے یہی اب بے شش و پنج ✻ پلا سہ آتشہ، تا دور ہو رنج
کہاں تک انتظارِ آبِ گلگوں ✻ بطِ مے کا روا ہے، ساقیا خوں
عروسِ فصلِ گل جانِ چمن ہے ✻ بندھا رنگِ عروسانِ چمن ہے
شگفتہ بلبلیں ہیں شاخِ گل پر ✻ گل افشانی سے ہے گلشن معطر

یہ اشعار واقعی شایانِ شایاں ہیں۔

شرما۔ منشی کندن لال

ڈاکٹر جین نے بتایا ہے کہ شرما، سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ اور انھوں نے ۱۹۱۰ء / ۱۳۲۸ھ میں ایک مثنوی "نیرنگِ بیخودی" کے نام سے لکھی تھی۔ نمونہ نہیں مل سکا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شعلہ — منشی بنواری لال

پنجاب میں حصار کا علاقہ بڑا مشہور ہے۔ یہ پہلے ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر اب ضلع ہو گیا ہے۔ ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء میں فیروز شاہ تغلق نے یہاں ایک قلعہ تیار کرایا تھا جو "فیروزہ حصار" کہلاتا تھا اور اس نے ایک شہر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اکبر کے عہد میں یہ شہر صوبہ کا صدر مقام ہو گیا تھا جسے "سرکار" کہا جاتا تھا۔ ہمایوں، شیر شاہ اور اکبر کے عہد میں یہیں ہندوستانی ٹکسال قائم تھی۔ اور سکے ڈھلتے تھے۔ اب وہاں صرف شعر ڈھلتے ہیں۔

یہاں کا کائستھ خاندان ہر زمانہ میں ادب نواز اور سخن سنج رہا ہے۔ شعلہ کے والد منشی موتی لال ناظر بھی شعر و ادب میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ موتی لال نے بعد میں حصار چھوڑ کر علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شعلہ نے علی گڑھ ہی میں تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں غالب کے مشہور شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے شاگرد ہوئے۔ کچھ دن منشی بالمکند بیصبر سے بھی اصلاح لی تھی۔ مرزا حاتم علی مہر اور مرزا عنایت علی ماہ سے خاص مراسم تھے۔ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء میں انتقال کیا۔

شعلہ نے غزل گوئی میں بڑا نام پیدا کیا تھا اور ان کی غزلوں کا مجموعہ "ارمغانِ شعلہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان کی مثنوی "بندرابن" ان کا شاہکار ہے۔

بندرابن وہ مشہور جنگل ہے جس میں از روئے روایت، سری کرشن جی، عہدِ طفلی میں، جبکہ وہ نند جی کے گھر میں رہتے تھے، نند جی کی گائیں چراتے اور بانسری بجایا کرتے تھے۔ ہندوؤں کے نزدیک اس جنگل کو بڑا مرتبہ ہی نہیں بلکہ تقدس حاصل ہے شعلہ کو بھی غالباً، ہندو ہونے کے ناطے، اس جنگل سے بڑی عقیدت تھی، کیونکہ خلافِ رواج، منفرد انداز سے انھوں نے اپنی مثنوی کے لئے یہ موضوع چنا اور پورے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جوش کے ساتھ یہ مثنوی لکھی اور شاعرانہ سحر آفرینی کی ہے۔ اس مثنوی کا دوسرا نام "برجِ چھب" بھی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ نے اس مثنوی کو از راہِ قدردانی بجا طور پر ایم۔اے۔ کے نصاب میں رکھا ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

کدھر ہے ساقیٔ بزمِ شبِ ماہ :: کھلا بندِ قبائے حسن دل خواہ
صدائے نغمہ کی افسوں گری ہے :: عجب در پردہ سازِ دلبری ہے
فلک جلوہ فروشِ ماہِ تاباں :: زمینِ برجِ چھب گسترده داماں
شبِ مہتاب فرشِ چادرِ نور :: بیاباں در بیاباں، جلوۂ طور
مجلّا نور تھا ہر اک طبق میں :: زمیں لپٹی تھی چاندی کے ورق میں

چاندنی رات کا نورانی سماں، آپ نے خود بھی بارہا دیکھا ہوگا اور بہتوں کے یہاں پڑھا ہوگا مگر نہ خود آپ کے تخیّل نے یہاں تک پرواز کی ہوگی اور نہ کسی کے یہاں یہ قلمبند دیکھا ہوگا کہ: ع

زمیں لپٹی تھی چاندی کے ورق میں

اور سنئے:-

شگفتہ موجِ ہوا سے آسماں میں :: جھلک سیماب کی ریگِ رواں میں
ملمّع تھا ہر اک گل پر سنہرا :: نظر آتا تھا ہر پتّہ، رُو پہلا
معطّر دشت تھا عطرِ جناں میں :: لپٹ کافور کی موجِ ہوا میں
یہ آب و تاب تھی انوارِ مہ میں :: جھلکتی تھی زمیں، جمنا کی تہ میں
بنا افشاں تھا ہر تابندہ کوکب :: مہِ انور تھا اک خالِ رُخِ شب
بھرا تھا نور، مہ سے تا بہ ماہی :: بنی تھی چاندنی ظلِّ الٰہی

"چاندنی" کو "ظلِّ الٰہی" کہتے ہوئے دوسرے کسی اور کو آپ نے سنا تھا؟ "ظلّ" سایہ کو کہتے ہیں اور سایہ کے معنی ہی اندھیرا کے ہیں جو روشنی کی ضد ہے، مگر شعلہ نے "چاندنی" کو "ظلِّ الٰہی" بنا دیا جو نور ہی نور ہو گئی۔ اثراتِ نغمہ ملاحظہ ہوں:-

دھری مرلی ادھر گردھر نے جب سے :: سہرے سُر شیام نے اعجازِ لب سے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

قیامت نا عجب اندازِ نَے تھا ÷ لبِ جاں آفریں دمسازِ نَے تھا

ہوا تھا سوز سے بیتاب پانی ÷ بنا تھا آگ پر سیماب پانی

پانی کی روانی کو، آگ پہ سیماب، سے تشبیہہ دینا، شعلہ ہی سے ممکن تھا۔ سہ

تھمی رک رک کے لہروں کی روانی ÷ جما، چلتا ہوا جمنا کا پانی

نغمہ وِلے پر، پانی کا بھی رُک رک کے متوجہ ہو جاتا، اُس نغمہ دلکے کی دلکشی کی آخری حد ہے جو کرشن جی ہی کے لئے ممکن ہو سکتا تھا اور جس کو شعلہ ہی منضبط کر سکتے تھے۔

تلاشِ دل میں ہر نغمہ رواں تھا ÷ بندھا مرلی کے دُھن کا اک سماں تھا

غرض جو عالمِ ایجاد میں تھا ÷ بر رنگِ نَے عجب فریاد میں تھا

ہر اک آوازِ پیغامِ بشارت ÷ ہر اک انگلی میں تھی رمزِ اشارت

سپیے بوسے دے پیغام لب کے ÷ پکارے جنتری میں نام سب کے

کیا بیچین ساری گوپیوں کو ÷ پکارا پریم پیاری گوپیوں کو

یہ کہہ کے سب نے تن، من، دھن لیا ÷ "چلو سکھیو کہ منہہ تیرے کا پیارا"

وفورِ شوق سے رعشہ بدن میں ÷ نہ جاں تن میں، نہ تن تھا پیرہن میں

روانہ سوئے بن از خود فراموش ÷ پری رویانِ متھرا دوش بردوش

سپر اجادو تھا بنسی کی صدا میں ÷ ہزاروں کر گئی رخنے حیا میں

ہر چند کہ میں واقعاتی اعتبار سے گوپیوں کے ساتھ کرشن جی کی رنگ رلیوں کی داستان کو قطعاً غلط بلکہ قابلِ اعتراض سمجھتا ہوں اور اس کا ذکر میں نے اس کتاب کے حصہ دوم میں سری کرشن جی کی سوانح حیات میں کیا ہے، مگر یہاں شاعری ہے اور اس حسین انداز و الفاظ کی شاعری ہے جس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ نغمہ کی یہ تعریف کہ وہ حیا میں رخنے ڈالتا ہے، عورتوں کی والہانہ شیفتگی اور نغمہ کی سحر آفرینی دکھانے کے لئے عجیب و لطیف ہے۔ شعلہ واقعی شعلہ تاباں تھا اور اس نے اپنی اس مثنوی میں اپنی شاعرانہ صلاحیت اور والہانہ عقیدت کا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ایسا بے پناہ اظہار کیا ہے، جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ شعلہ کا یہ شعر بہت مشہور ہے: ؎

رہے نہ عشق میں اے شعلہ دین و دنیا کے۔ ملے بتوں سے خدائی میں خواہ پھنسنے کو

یہ شعر بھی ان کا بہت پسند کیا جاتا ہے: ؎

کہہ کے "بسم اللہ" کرو بیجے ستم جو دل میں ہے۔ یاں تو اب "اللہ" ہی باقی دمِ "بسمل" میں ہے

شفق - منشی لالتا پرشاد

شفق، لکھنؤ کے محلہ بھوانی گنج کے رہنے والے اور منشی نیجے لال کے بیٹے تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ پیشہ کاپی نویسی تھا۔ زباندانی انھوں نے بطور خاص اس عہد کے سب سے بڑے ماہر زبان آغا علی شمس لکھنوی سے حاصل کی تھی۔ شاعری میں ان کے استاد منشی کنور جی مدہوش اور شنکر دیال فرحت تھے۔ خود فرمایا ہے: ؎

بندہ ناچیز بے حقیقت ہے۔ فیض مدہوش، شمس و فرحت ہے

ان کے اشعار استعارات و تشبیہات گوناگوں اور تناسب لفظی و معنوی اور حسنِ بندش سے مرقع ہوتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں اپنے وقت کے بے مثل شاعر مانے گئے ہیں۔ بقول صاحبِ "تذکرۂ شعرائے ہنود":۔

"چار مصرعے ہیں، سولہ سولہ مادّے نکلتے ہیں۔"

شفق نے "بہارِ شفق" کے نام سے ایک لمبی مثنوی لکھی تھی جس میں "قصہ چہار درویش" کو نظم کیا تھا۔ یہ مثنوی بقول منور لکھنوی محاوراتِ لکھنؤ کا خزانہ تھی مگر کہیں سے نمونہ حاصل نہ ہو سکا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شفیق — منشی لچھمی نرائن

شفیق کا اصلی وطن لاہور تھا، مگر چونکہ ان کے دادا عالمگیر کے ساتھ دکن کی مہم پر گئے اور انھوں نے وہیں سکونت اختیار کرلی اور ان کے والد رائے منسا رام بھی آصف جاہ کے دیوان مقرر ہوگئے، اس لئے شفیق کا خاندان اورنگ آباد میں ہی مستقلاً قیام پذیر ہوگیا۔ وہ علامہ آزاد بلگرامی (وفات سنہ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء) کے شاگرد اور علی جاہ بہادر کے ملازموں میں سے تھے۔ تاریخ کا خاص ذوق تھا جو ان کو اپنے استاد آزاد سے ملا تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں "صاحب" اور اردو میں "شفیق" تخلص کرتے تھے۔

شفیق کی ایک مثنوی "تصویرِ جاناں" کے نام سے مذکور ہوئی ہے۔ صاحب "اردو کے ہندو ادیب" نے اس کے ذکر میں لکھا ہے کہ "معراج پر جو مثنوی شفیق نے لکھی ہے، اس سے زیادہ باادب الفاظ کوئی مسلمان بھی نہیں لکھ سکتا۔ اندازہ ہے کہ یہی مثنوی "تصویرِ جاناں" کے نام سے موسوم ہے۔ بڑی کوشش کی مگر کہیں سے بھی کوئی نمونہ نہیں مل سکا جس کا مجھے افسوس نہیں بلکہ صدمہ ہے۔

شیام — منشی شیام لال

صاحبِ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بتایا ہے کہ شیام ریاست نرسنگھ گڑھ میں ملازم تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کے عالم تھے۔ انھوں نے شکنتلا کو انگریزی سے اپنی مثنوی "بہارِ کشمیر" میں منتقل کیا تھا۔ یہ مثنوی ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں شائع ہوگئی تھی۔ نمونہ یہ ہے:

کہنے لگی دل میں ہائے قسمت :: کیسی پڑی مجھ پہ ہے مصیبت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شادی کا بھی ہائے شوق ہے اسکو ۰:۰ اندھیر میں یہ دکھاؤں کس کو ؟
قسمت مری ہے یہ کیسی پھوٹی ۰:۰ کیسی مری ہائے آس ٹوٹی

صدر — منشی لچھمن پرشاد

صدر، قوم کائستھ سکسینہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور ادیب و شاعر نوبت رائے نظر لکھنوی (وفات ۱۹۱۶ء/۱۳۳۴ھ) کے بیٹے ہیں۔ ۱۸۶۸ء/۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے محلہ بازار کھالہ میں مکان تھا۔ ان کی شادی مشیر الدولہ مہاراجہ بال کشن بہادر جسارت جنگ کی نواسی سے ہوئی تھی۔ ان کے نانا منشی لال چند اُنس لکھنوی، مرزا قتیل (وفات ۱۸۱۷ء/۱۲۳۲ھ) کے شاگرد تھے۔

صدر، اردو، فارسی کے ماہر تھے اور عربی زبان میں "شرحِ جامی" تک تعلیم حاصل کی تھی۔ فارسی زبان میں شاعری شروع کی تو عزیز لکھنوی کے شاگرد بنے اور بعد میں جب انہیں محسوس ہوا کہ عزیز کافی نہیں ہیں، تو وہ اُس عہد کے مشہور ایرانی شاعر سنجر ایرانی سے رابطہ قائم کرکے اُن سے اصلاح لینے لگے۔ اردو میں نسیم لکھنوی کے شاگرد رشید منشی خیراتی لال شگفتہ لکھنوی (وفات ۱۸۹۸ء/۱۳۱۶ھ) کے ارشد تلامذہ میں مانے جاتے تھے۔ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ ۱۹۲۶ء/۱۳۴۴ھ میں انھوں نے والئی بھوپال کی مسند نشینی کے موقع پر اردو میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے ہر مصرع سے تاریخ نکالی تھی۔ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر ۱۹۱۱ء/۱۳۲۹ھ میں صدر نے ایک قصیدۂ تہنیت لکھ کر بھیجا تھا۔ اس کے صلہ میں انہیں ہندوستان میں رسم تاجپوشی CORONATION کے موقع پر دربارِ دہلی میں طلب کرکے تمغہ اور اعزازی سرٹیفکیٹ عطا ہوا تھا۔

صدر کو زبان پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ غیر منقوط الفاظ میں ایک پوری مثنوی "سراپا" کے نام سے لکھی تھی :-

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہر اسم اُس کا دل آرا و دل آرام ❊ ہر اک دم ورد رکھ، کر حاصل آرام
سدا اما اسم، اک مردِ دل آگاہ ❊ ہوا دورِ سوم کا کامل آگاہ

صاحبِ "بہارِ سخن" نے ان کی ایک اور غیر منقوط مثنوی "سلک گہر" کا بھی ذکر کیا ہے۔ "سلک گہر" کوئی دوسری مثنوی نہیں بلکہ دراصل یہی مثنوی "سدا اما" ہے جس کا دوسرا نام "سلک گہر" ہے۔ صدر نے "بھاگوت گیتا" کا بھی مثنوی کی شکل میں ترجمہ کیا تھا، جس کا ذکر حصہ دوم میں کیا گیا ہے۔ حضرت منور لکھنوی کی شادی صدر ہی کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ صدر کا انتقال ۱۹۳۲ء/۱۳۵۱ھ میں ہوا۔

صنوبر۔ منشی بجرنگ سہائے

صنوبر، عظیم آباد۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ باپ کا نام منشی بیشیشور پرشاد تھا۔ پٹنہ سیٹی کے مشہور محلہ خواجہ کلاں میں گھر تھا۔ ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔ انھوں نے "بھاگوت گیتا" کا ترجمہ مثنوی کی شکل میں کیا ہے جس کی تفصیل حصہ دوم میں ملے گی۔

طالب۔ منشی کنہیا لال

طالبِ، تعلقدار سیتاپور کے مختار عام اور بہت اعزاز کے مالک تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "بارہ ماسہ" لکھی تھی جس کا دوسرا نام "برہ باریں" تھا صاحبِ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے لکھا کہ مثنوی ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں لکھی گئی تھی اور ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں شائع ہو گئی تھی۔ نمونہ یہ ہے:-

برہ اتہاس میں اپنا سناؤں ❊ سجن کو نیت کی مارگ بتاؤں
کوی اس نہہ کے پڑیو نہ پالے ❊ کئے ہیں اس نے میرے دانت کالے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

طرّار۔ منشی چھوٹم لال

صاحب "بہارِ سخن" نے لکھا ہے کہ طرّار کے والد کا نام رائے جگول مل تھا۔ کھتری خاندان کے فرد تھے۔ حیدرآباد میں رہتے تھے اور عشرتی کے شاگرد تھے ۱۳۳۲ھ فصلی (۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء) میں انھوں نے انتقال کیا۔ موصوف نے "صبحِ وطن" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ نمونہ نہیں ملا۔

عابد۔ منشی دیبی پرشاد

منشی عابد، قنوج کے رئیس اور مشہور وکیل تھے۔ ان کے بزرگ اکبر کے عہد سے شاہی خدمات انجام دیتے چلے آئے تھے۔ عابد کے والد منشی رائے پتر چند بھی اچھے شاعر تھے۔ وہ فارسی زبان میں شعر کہتے اور دام تخلص کرتے تھے۔ عابد نے دو مثنویاں "مثنوی زیبا" اور "فریادِ مطلب" کے نام سے لکھی تھی۔ مگر کسی کا بھی نمونہ نہیں مل سکا۔

عاجز۔ منشی گردہاری لال

بدایوں، مردم خیز خطّہ ہے۔ یہاں سے مشہور شخصیتیں ظاہر ہوئی ہیں۔ عاجز اسی زرافشاں سرزمین کے گُل سرسبد تھے۔ انھوں نے "آبخورِ عشق" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جس کے بارے میں لوگوں کی رائے تھی کہ بہت اچھی ہے۔ مگر کہیں اس کا نمونہ نہ مل سکا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

عاجزؔ - منشی میوہ لال

عاجزؔ، پٹنہ (عظیم آباد) کے باشندہ اور کائستھ خاندان کے ایک صاحب علم فرد تھے - ان کے والد کا نام پرتاب نرائن تھا - محلہ گلزار باغ میں قیام تھا - انھوں نے بھاگوت گیتا کا ترجمہ مثنوی کی شکل میں کیا تھا جس کا ذکر اس کتاب کے حصہ دوم میں کیا گیا ہے -

عاجزؔ - بابو نول سنگھ

بابو نول سنگھ عاجزؔ، راجہ بھوانی پرشاد کے سررشتہ میں ملازم تھے - راجہ چندو لال شاداںؔ (وفات ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء) کے دربار میں بھی ان کی رسائی تھی - انھوں نے ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں ایک مثنوی "جگ روپ" لکھی تھی جو عشقیہ قصہ پر مشتمل ہے - ابتدا حسب دستور حمد و نعت سے ہوئی ہے - اس کے بعد انھوں نے اپنے مرشد مہاپرش کی منقبت لکھی ہے - پھر سکندر جاہ آصف جاہ ثالث (جن کا دور حکومت ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۱ء سے ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء تک ہے) کی مدح ہے - اس کے بعد راجہ چندو لال اور اپنے مربّی و افسر راجہ بھوانی پرشاد کی ستائش کی ہے - اس کے بعد قصہ کی ابتدا ہوتی ہے - نمونہ یہ ہے:

ترا نام گویندہ ہوں، کردگار ؛ جہاں آفریں ہے تو پروردگار
خداوند ہے تو، جہاں کردگار ؛ کرشمہ ترا آشکار، آشکار

عنایت سے اپنے خدا کے رسول ؛ نہ کر مجھ کو دنیا میں ہرگز ملول

رہے دونوں سوتے ہوئے نیم شب ؛ جگت روپ جاگا مگر تشنہ لب

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جگایا نہ اُس دوسرے یار کو ٭ کہا، دل سے، اب تو جو کچھ ہو سو ہو

فلک سے اُتر آئی وہ ایک بار ٭ کیا تخت پر اپنے اُس کو سوار

سوار اس کو کر کے اڑایا وہ تخت ٭ اسے کچھ نہ بولا وہ شوریدہ بخت

مثنوی کا قصہ بھی قدیم انداز کا، انسان و پری کے عشق کا ہے اور اندازِ بیان بھی کوئی خاص جاذبیت وانفرادیت کا حامل نہیں۔

عاشق۔ مہاراجہ کلیان سنگھ

عاشق کے دادا رائے ہمت سنگھ تو دلّی کے تھے مگر ان کے والد مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ، بہار کے گورنر تھے۔ اس لئے عاشق عظیم آبادی بھی کہلاتے ہیں۔ پھر خود بھی کچھ دنوں کے لئے اس معزز عہدہ پر فائز رہے تھے۔ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں دلّی میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں کلکتہ میں انتقال کیا۔ عاشق فاضل شخص تھے اور چونکہ ملکی انتظام برائے نام ہی ان کے ہاتھ میں تھا، اس لئے شعر و شاعری میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ اور اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ "مثنوی عاشق" کا نمونہ یہ ہے:-

ہوا تیرے جلوے سے بیخود کلیم ٭ کیا اُس نے اس شعلے سے خوف و بیم

دمِ وصل موسیٰ ہوا بے خبر ٭ تجلّی سے تیرے گرا کوہ پر

محمد سزا وارِ دیدار ہے ٭ کہ تیرا وہ یارِ وفادار ہے

دہاں کو کریں پاک کوثر سے ہم ٭ معطّر کریں مشک از فر سے ہم

کہ لکھتے ہیں نعتِ رسولِ خدا ٭ مغیث الوریٰ، خواجۂ دوسرا

محمد کہ ہے محبوبِ پروردگار ٭ محمد کہ ہے مطلوبِ پروردگار

کہا جاتا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر واقعی یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تو ہزاروں برس میں بھی شاید ہی کوئی مرتبہ حاصل کرتی۔ یہ تو اہلِ علم و فضل مشہور شعراء تھے جنھوں نے اردو زبان کو فرش سے اُٹھا کر عرش پہ پہنچا دیا۔ عاشق کی یہ زبان ڈیڑھ پونے دو سو برس پہلے کی ہے اور شاید موجودہ مروّجہ اردو سے مختلف نہیں۔

اُٹھے گُل کے، گلزار میں قہقہے ؛؛ کرے ہیں نپٹ بلبلیں چہچہے
عنایت مجھے کر تو رطلِ گراں ؛؛ کہ شادی برس گانٹھ کی ہے یہاں
ہوا ایک سال وہ رشکِ قمر ؛؛ ہوا منقضی سالِ بہجت اثر
پنہایا پسر کو لباسِ زری ؛؛ کہ دیکھ اُس کو بیخود ہوئی مشتری
بدن کے وہ کمخواب زر کی ازار ؛؛ گُلِ اشرفی کی دکھاتی بہار
مرصّع وہ ہیکل جواہر کی تھی ؛؛ عجب خوشنما اُس سمنبر کی تھی
خوش اسلوب تھے ہاتھ میں پوت کے ؛؛ کڑے زر کے، ہیرے کے، یاقوت کے
گلے کی وہ ہنسلی جواہر نگار ؛؛ دکھاتی تھی لالے کے گل کی بہار
وہ بدھی کتھی یاقوت کی خوشنما ؛؛ شفق ماہ کے گرد پھیلا تھا، آہ
مرصّع کڑے دونوں الماس کے ؛؛ پڑے پا میں اُس اشرف الناس کے

یہ پوری مثنوی، اسی طرح اردو زبان کے گلے میں ایک مرصّع ہار کی طرح پڑی جگمگاتی چلی گئی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے فرمایا ہے کہ یہ مثنوی سنہ ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء کی تصنیف ہے۔ درحقیقت یہ سنہ اس مثنوی کا میرے نزدیک "سنہ تصنیف" نہیں ہے بلکہ دستیاب شدہ قلمی نسخہ کا سالِ کتابت ہے، کیونکہ عاشق ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء میں ۷۴ برس کے بڈھے ہو کر آنکھ کی روشنی اور دل کا جوش کھو کر، انتقال کئے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ مرنے سے محض پانچ سال پہلے بحالتِ پیری و نابینائی اور مایوسی و کمزوری' ایسی شاندار طربیہ مثنوی عاشق کبھی لکھ سکتے تھے؟

میرا خیال ہے کہ ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء میں عاشق پٹنہ سے کلکتہ گئے تھے اور وہاں وہ ۲۷، ۲۸ برس تک رہے اور یہ دور اُن کی محزونی و غم زدگی کا تھا، لہٰذا یقیناً یہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شاندار مثنوی انھوں نے قیام پٹنہ ہی کے دوران، یعنی ۱۲۰۲ھ ۱۷۸۸ء سے پہلے لکھی تھی۔

عاشق - پنڈت کنہیا لال

عاشق، کے والد پنڈت ٹھاکر داس کشمیری، مدرسہ شاستری (دہلی) کے مدرس اوّل تھے، اس لیے عاشق دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد راجہ امیٹھی ضلع سلطان پور کے یہاں ملازم ہو گئے۔ عاشق نے ایک مثنوی "گل باصنوبر چہ کرد" کے نام سے لکھی تھی جو اسی نام کی فارسی کتاب کا ترجمہ تھی۔ نمونہ نہیں مل سکا، حالانکہ یہ مطبوعہ صورت میں خود میرے گھر میں موجود تھی اور میں نے بچپنے میں اس کو متعدد بار دیکھا اور پڑھا تھا۔

عاشق - منشی پربھو دیال مصر

عاشق، دراصل میرٹھ کے باشندہ تھے مگر ملازمت کی وجہ سے نیمچ چھاؤنی (مالوہ) میں برابر مقیم رہے۔ شعر و سخن کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ ہندو مسلم تعلقات کے بہترین نمونہ اور نمائندہ تھے۔ جس طرح انھوں نے ہندو عقائد کو قابلِ پذیرائی سمجھا، اسی طرح مسلم معتقدات کو بھی نوازا۔ صاحب "اردو کے ہندو ادیب،" نے کہا ہے کہ عاشق، نعتِ رسول خوب کہتے تھے۔ عاشق نے "گیتا" کا ترجمہ بھی "غذائے روح" کے نام سے لکھا تھا جس کا ذکر حصہ دوم میں کیا گیا ہے۔ اور گیتا کے صرف وہ دو شعر درج کئے جا سکے ہیں جو ازراہِ عنایت ڈاکٹر گیان چند جین سے مل سکے، صاحب موصوف کو بھی زیادہ اشعار شاید نہ مل سکے۔ کہا جاتا ہے کہ عاشق نے کالیداس کے متعدد ڈراموں کا بھی نظم میں ترجمہ کیا تھا مگر کسی کا بھی نمونہ مل نہ سکا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

عامل ۔ منشی رام پرشاد

عامل ۔ لاہور کے باشندہ تھے ۔ اُن کے والد کا نام شیو پرشاد تھا جو تلاشِ معاش میں لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو کے رہ گئے ۔ اسی لئے عامل لکھنوی کہے جاتے ہیں ۔ مہاراج سکھ رام داس برہمچاری لکھنوی جو صاحبِ دیوان شاعر تھے اور اخلاص تخلص کرتے تھے ، عامل کے استاد تھے ۔ اخلاص کا سالِ وفات ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ع ہے ۔

صاحبِ "اردو کے ہندو ادیب" نے اُن کی صرف ایک مثنوی "دریائے طلسم" کا ذکر کیا ہے ۔ مگر صاحبِ "ہندو شعرا" اور صاحبِ "بہارِ سخن" نے ان کی حسب ذیل تین مثنویاں بتائی ہیں :۔

(۱) ایکادشی مہاتم

(۲) بحر طلسم

(۳) دریائے طلسم

ان میں سے اوّل الذکر مذہبی اور آخر الذکر دونوں غیر مذہبی ہے ۔ صاحبِ "بہارِ سخن" اور صاحبِ "ہندو شعرا" دونوں نے عامل کی مثنوی کا نمونتاً وہ پانچ شعر پیش کیا ہے جو عامل نے اپنی نسبت سے کہا ہے ۔ مگر کسی نے یہ نہیں بتایا کہ یہ دونوں شعر عامل کی کس مثنوی کے ہیں ؟ وہ اشعار یہ ہیں : ؎

میں ہوں اک بندۂ ناچیز ناشاد ؛؛ مجھے کہتی ہے خلقت رام پرشاد

پدر تھے میرے شیو پرشاد نامی ؛؛ بقولِ کھتری استاد نامی

بزرگوں کا وطن ہے شہر لاہور ؛؛ عجب رنگیں چمن ہے شہر لاہور

چھڑایا وقت و اتروں نے وطن سے ؛؛ اڑایا صورتِ بلبل چمن سے

غرض مدت سے یاں دل شاد ہوں میں ؛؛ میانِ لکھنؤ آباد ہوں میں

صاحبِ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بتایا ہے کہ عامل کی مثنوی "ایکادشی مہاتم"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کا ایک قلمی نسخہ اسٹیٹ لائبریری رامپور میں ہے جو ۱۸۷۹ء ۱۲۹۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ تقریباً پانچ سو اشعار کی مثنوی ہے ساکنوں نے نمونتاً اُس مثنوی کے صرف دو شعر پیش کئے ہیں جو درج ذیل ہیں :-

مناسب ہے بشر کو با دلِ شاد ۔۔ کرے ہر دم جنابِ بشن کی یاد
جنابِ لچھمن ہیں قلزمِ جود ۔۔ کہ جن کے ذکر سے ہے مشکل بہبود

غالباً ڈاکٹر جینی کو رام پرشاد کا تخلص معلوم نہ ہو سکا اس لئے انھوں نے صرف اُن کا نام لکھا ہے۔ اسی طرح شاید صاحبِ "بہارِ سخن" کو عامل کی مثنویوں کو دیکھنے یا اُن کے بارے میں کوئی تفصیلی ذکر جاننے کا اتفاق نہ ہو سکا اس لئے انھوں نے "ایکادشی مہاتم" کو الگ الگ کرکے اسے بطور دو مثنوی کے ظاہر کیا ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ عامل کی آخر الذکر دونوں مثنویاں داستانِ امیر حمزہ کے کسی حصہ کی حامل ہوں گی۔

عبرت - منشی گورکھ پرشاد

گورکھپور (یو۔پی) کا نام محتاج تعارف نہیں۔ مہدی، عارف، فطرت، مجنوں اور فراق وغیرہ اردو زبان کے آسمان کے درخشندہ ستارے ہوئے اور ہیں۔ فراق گورکھپوری کے والد عبرت شرفائے گورکھپور اور وہاں کے نامی وکلا میں سے تھے۔ عبرت، حالی و آزاد کے معاصر اور علوم مشرقیہ کے ماہر تھے۔ خوش فکر شاعر اور اہلِ ذکر صوفی میں سے تھے۔ فارسی زبان کے نامور شعرا کے کلام کا بڑا حصہ اُن کو حفظ تھا۔ غنی اور حزیں کو وہ بہترین شاعر مانتے تھے۔ غالب سے ان کو نہایت گہری عقیدت تھی۔ اور انہیں وہ بے مثل شاعر تسلیم کرتے تھے۔

عبرت کی مثنوی "حسنِ فطرت" مشہور و متعارف ہے۔ ۱۸۹۰ء ۱۳۰۷ھ سے لکھنو میں لکھنا شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء ۱۳۳۷ھ میں گورکھپور ہی میں مرتب ہوئی۔ جس کتاب پر اپنے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

برسوں ریاض کیا گیا ہو، اُسے ممتاز و منفرد ہونا ہی چاہئے تھا۔ چنانچہ یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی۔ یہ ایک متصوفانہ مثنوی ہے اور حسن و عشق کی دنیا کی چیز نہیں۔

عبرت نے جسم انسانی کو ایک شہر قرار دے کر اُس کے اربعہ عناصر آب و آتش اور خاک و باد کو چار حصے قرار دیئے ہے۔ اس شہر کی ملکہ روح ہے۔ اس کا وزیر عقل ہے اور اس کا لاڈلا بیٹا دل ہے۔ ایک دن شہزادہ دل، سیر کے دوران قلعۂ نگار خانہ کی طرف نکل جاتا ہے۔ شہزادی حُسن سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ دل گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر اُسے سزائے موت دی جاتی ہے۔ فاضل شاعر نے ہر مقام پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ، شاعرانہ صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ زبان صاف ستھری اور اندازِ بیان عام فہم ہے۔ ابتدا حمد کے بجائے یوں ہوتی ہے: ؎

بگڑنا، بننا، حقیقت میں اتفاق پہ ہے :: خوشی بشر کی مگر منحصر مزاق پہ ہے
صلاحِ خلق طبیعت کے برخلاف نہیں :: مزاج اصل سے نیچر کو اختلاف نہیں
وہ نفس جس سے ہے قائم وجودِ انسانی :: وہ کیفیت جسے کہتے ہیں لوگ نفسانی
اُترنا ذہن میں وہ مختلف خیالوں کا :: وہ سونا خوابِ تصور میں ہوش والوں کا
بشر کی عمرِ طبیعی کا اک سہارا ہے :: اگر نہ سمجھو تمہیں ذہن ہی اشارہ ہے

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ عبرت خدا کے تصور کو لغو خیال کرتے تھے۔ انہوں نے اس مثنوی میں دکھایا ہے کہ دل: چاہے خدا کو نہ مانے مگر عقل خدا کو تسلیم کرتی ہے۔ نیز خواہ اور وقتوں میں خدا یاد نہ آئے مگر مصیبت اور پریشانی کے وقت، اللہ تعالےٰ اپنی ساری صفاتِ جلیلہ کے ساتھ یاد آتا ہے۔ چنانچہ جب شاہزادہ دل کی تلاش میں وزیر عقل چلا ہے، تو سفر سے پیشتر اُس کے منہ سے حمدِ الٰہی کا مینہ برسا دیا گیا ہے: ؎

تفکرات سے پچھلے پہر وہ گھبرایا :: سفر سے پیشتر، اندیشہ سفر آیا
علی الصباح اٹھا خواب گاہ شاہی :: خدا کا نام لیا سچی چاہ سے اپنی
جو نشے جاذب ہوئے سر میں حق گزاری کے :: تو اس کے منہ سے جھڑے پھول حمد باری کے

اور واقعی پھول جھڑے ہیں، میں بکھیرتا ہوں آپ چُنئے، اور اپنا دامن بھر لیجئے: ؎

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تو ہے خدا کس و ناکس کا پالنے والا ؛ سروں سے آئی بلاؤں کو ٹالنے والا

کھلا نہ حال ترا وہ بڑا سبب ہے تو ؛ گھٹا نہ وقت ترا ایسا روز و شب ہے تو

اگرچہ وہم و گماں نے کیا خیال بہت ؛ ترے لئے ہوئی ہر چند قیل و قال بہت

کوئی بھی تیری حقیقت بیان کر نہ سکا ؛ نہ کر سکا شرح داستان کر نہ سکا

مگر جنہوں نے ترا فیض کچھ اٹھایا ہے ؛ وہ مانتے ہیں کہ تو نے ہی سب بنایا ہے

تری ہی ذات سے ہے سب کا سب جہاں قائم ؛ تجھی سے ہیں یہ زمیں اور آسماں قائم

چمک سے تیری ہی سارا جہاں اجالا ہے ؛ دمک سے تیری ہی دنیا میں بول بالا ہے

ترے ہی جلوے کے تالے سب آسماں ہیں ؛ ترے ہی رنگ کی نیرنگیاں جہاں میں ہیں

ہوا کے دوش پہ اڑتے پرند جتنے ہیں ؛ زمیں کی گود میں ہر دم بشر جتنے ہیں

پڑے ہیں امن و اماں سے تری پناہ میں سب ؛ اچھلتے کودتے جاتے ہیں تیری راہ میں سب

یہ آسمان کہ خورشید و ماہ ہیں جس پر ؛ یہ سرزمین گدا اور شاہ ہیں جس پر

یہ آفتاب کہ دن میں ہے روشنی جس کی ؛ یہ ماہ رات کو چھٹکی ہے چاندنی جس کی

یہ آدمی جو بنا مشتِ خاک سے ہے ؛ مدام کھیلی جس کو امیدِ پاک سے ہے

جو پھاڑتا ہے گریباں کو ناامیدی سے ؛ نہیں سماتا جو جامے میں خوش نویدی سے

ہر اک چیز تجھی سے ہوئی وجود پذیر ؛ تری ہی ذات سے سب کچھ ہوئے نمود پذیر

تمام خلق کی رونق، بہار تو ہی ہے ؛ جو کچھ بھی ہے مرے پروردگار تو ہی ہے

رواں ہیں تیری ہی لہریں جہان فانی میں ؛ تو ہی ہے موجزن اس ایک بوند پانی میں

ہر ایک شے سے ہے اظہار تیری قدرت کا ؛ ہے آفتاب نمودار تیری قدرت کا

ہے تیرے نور سے خود روشنی گواہ تری ؛ وہ چشم کور ہے پاتی نہیں جو راہ تری

شاہزادی حسن کی کچھ تعریف سنئے ؛ ۵

وہ تاب جس سے بہت پیچ و تاب ہوتا ہے ؛ وہ بادہ جس سے بہت دل کباب ہوتا ہے

وہ من کہ جان گنوا بیٹھے منچلے جس پر ؛ وہ چیز ناز ہیں کرتے بڑے بھلے جس پر

وہ چاندنی کہ جہاں ماہ ایک پارہ ہے ؛ وہ دھوپ جس کا یہ خورشید اک شرارہ ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

وہ صبح، جس میں نسیم مراد چلتی ہے ⁖ وہ شام، آرزو کی شمع جس میں جلتی ہے
وہ، یعنی حسن پرطے عز و جاہ کی بیٹی ⁖ نگارخانے کے فیرنگ شاہ کی بیٹی

ملکہ اپنے وزیر (عقل) کی تعریف یوں کرتی ہے:۔

بہ نہجِ غیب ہے ہر وقت ہے مدد تجھ کو ⁖ دکھائی دیتا ہے دنیا کا نیک و بد تجھ کو
حواس و ہوش نہ ٹھہریں جو تو نہ ٹھہرائے ⁖ حواسِ خمسہ کا چہرہ ابھی بگڑ جائے
وفا شعار، نمک روح، باخبر ہے تو ⁖ عجائباتِ خدا میں عجب چیز ہے تو

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ذکر کرتے ہیں:۔

شعور و عقل سے جس کا دماغ روشن ہے ⁖ تمام خلق میں جس کا چراغ روشن ہے
ہے جس کے ہاتھ میں دنیا کا انتظام تمام ⁖ بشر نہ ہو تو ابھی ہو جہاں کا کام تمام
بشر کا کوئی جہاں میں نہیں مقابل ہے ⁖ اگرچہ تنگیٔ سینہ سے ضیق میں دل ہے
نصیب و بخت نہ اس کا اگر کمی کرتا ⁖ تو پھر جہان میں کیا کچھ نہ آدمی کرتا

اس شعر کو نگاہ میں رکھیے۔ قرآن حمید میں ہے کہ:۔

"انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے" (نساء - ۵ ۲۸/۴)

عبرت نے کہا ہے کہ نصیب و بخت کا گورکھ دھندا نہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ انسان کیا کچھ کر سکتا ہے۔ محمود الحسن وفا براہی کا شعر ہے:۔

کبھی بحرِ حوادث سے ابھرنے کا جو موقع دو ⁖ تو ہو معلوم تم کو پھر ہے زورِ ناتواں کیا؟

عنایت - کنور عنایت سنگھ

صاحب "اردو مثنویاں" نے پروفیسر مسعود حسن رضوی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ عنایت بریلی کے رہنے والے تھے اور وہاں کے رئیس و تعلقہ دار تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "غازۂ عشق" کے نام سے لکھی تھی جس میں شکنتلا کا قصہ نظم ہوا ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

باری کا ہے نام لب پر ہر بار ⁖ جس سے یہ قلم ہوا گہر بار

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے مالکِ ملکِ بود و نابود :: ہے جملہ جہانیوں کا معبود
تقریر، زباں نے اُس سے پائی :: تحریر، قلم کے ہاتھ آئی
حصّے میں بُتوں کے حُسن آیا :: رنگیں طبعوں نے عشق پایا
دریا نے صدف، صدف نے گوہر :: پائی گوہر نے آب یکسر

اچھی مثنوی ہے۔ قصّہ یوں شروع ہوتا ہے :—

بسوا منتر ایک تھے جو درویش :: مرتاض، خدا شناس، حق کیش
جنگل میں وہ گوشہ گیر رہتے :: دائم تکلیف و رنج سہتے
سردی سے جب اُن کو پالا پڑتا :: سردانے میں ہوتے جلوہ افزا
ہر آجاتی مزاج میں جب :: کرتے دریا میں طاعت رب
گرمی میں، جلا کے آگ چاردیر :: بیٹھے رہتے تھے پیشِ خورشید
تھے پارۂ برف، اُن کو اخگر :: جلتا اُس غم سے تھا سمندر
کچھ فکر نہ تھی یہاں وہاں کی :: چھوڑیں سب نعمتیں جہاں کی
جنگل میں جو برگ و بار پاتے :: رزاق کا شکر کر کے، کھاتے

مثنوی کے آخری اشعار یوں ہیں :—

خالق! ملے جس طرح یہ مہجور :: سب اپنی مراد سے ہوں مسرور
سب پائیں جہاں میں نعمتیں چار :: مے، چنگ، شباب، وصلِ دلدار
فرقت کا نہ پائے کوئی آزار :: چھوٹے نہ کبھی، کسی کا دلدار
کر سب کی اس طرح حمایت :: دائم ہو بشاشتِ عنایت

عجیب و غریب دعا ہے اور منفرد۔ قطعۂ تاریخ خود مصنف کا ہے :—

ہے یہ گلِ تازۂ تعشق :: نام اس کا ہے "غازۂ تعشق"
تاریخ بھی نام سے ہے پیدا :: سال اس میں ہے عیسوی ہویدا

یعنی "غازۂ تعشق" کے اعداد ۱۸۸۳ ہیں جو سالِ تصنیف ہے۔ عنایت، ایک
قادرالکلام اور لطیف طبع شاعر تھے اور اُن کی یہ مثنوی ان کی صلاحیت کی بہترین

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

آئینہ دار ہے۔

عنبر۔ منشی رہبر پرشاد

صاحب " بہارِ سخن " نے اُن کے والد کا نام منشی بہاری لال بتایا ہے۔ کائستھ خاندان کے فرد تھے۔ قصبہ رندپور۔ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ منشی پورن چند آشنا کے معاصر اور منشی کھنو لال تائب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے دو مثنوی لکھی تھیں۔ یہ مثنوی شگوفہ" اور دوسری " مثنوی غیر راستی "۔ نمونہ کسی کا نہیں مل سکا۔

غافل۔ منشی بختاور سنگھ

غافل، مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ آگرہ میں قیام تھا اس لئے کہ وہاں اُن کی ملازمت تھی۔ صاحب " بہارِ سخن " نے اُن کے ذکر میں صرف اتنا لکھا ہے کہ:۔

"ایک دیوان اور ایک مثنوی آپ سے یادگار ہے"۔

" مثنوی غافل " کا عنوان و موضوع کیا تھا؟ نہیں معلوم۔ نمونہ کسی جگہ نظر نہ آیا۔

غریب۔ لالہ خدا بخش

صاحب " ہندو شعرا " نے فرمایا ہے کہ غریب کا اصل نام تاج بہادر تھا۔ البتہ مشہور خدا بخش کے نام سے تھے۔ اس خاندان کے بعض لوگوں کا نام مسلمانوں کا سا تھا۔ صاحب " ہندو شعرا " نے ان کا ذکر یوں کیا ہے:۔

"تاج بہادر عرف لالہ خدا بخش صاحب، خلف منشی عالم چند صاحب

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

عرف لالہ حسین بخش، ابن لالہ اجودھیا پرشاد صاحب بن دیبی پرشاد صاحب دہلوی ۔ ساکن لکھنؤ، محلہ تمنا کو منڈی ۔ پہلے مطبع "ثمر ہند" میں مہتمم تھے ۔ مصلح سنگی، کاپی نویسی میں دخل رکھتے تھے ۔ پھر اپنا مطبع کیا اور محلہ چوپٹیاں میں سکونت اختیار کی ۔ ہمیشہ عشرۂ محرم میں تعزیہ رکھتے تھے ۔ مختلف شعبدات، لوگوں کی دلچسپی کے لیے دکھلاتے تھے، جیسے لالوں کا لڑنا، فوّارہ کا چھوٹنا اور سبیل بھی رکھتے تھے ۔ ۱۸۹۱ع ۱۳۰۹ھ میں تخمیناً ۷۰ برس کی عمر میں انتقال کیا ۔"

صاحب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بتایا ہے کہ غریب نے دو مثنویاں لکھی تھیں ۔ ایک "سوز پران"، یہ مثنوی چھپ گئی تھی ۔ دوسری مثنوی "فریب النساء" تھی جو ۱۸۶۸ع ۱۲۸۵ھ کی تصنیف تھی اور ۱۸۷۰ع ۱۲۸۷ھ میں شائع ہوئی تھی ۔ اس مثنوی میں غریب نے نہایت غریب مضمون پر طبع آزمائی کی ہے ۔ یعنی چھبیلا بھٹیاری کا قصہ نظم کیا ہے ۔ انھوں نے نمونہ میں صرف یہ شعر پیش کیا ہے : ؎

کروں کیا میں حمدِ خدائے جہاں :. دہانِ قلم ہے یہاں بے زباں

عورتوں کی فریب کاری اور ان کی مذمت کا بیان، مردوں کا ہمیشہ خاص عنوانِ گفتگو اور موضوعِ تحریر رہا ہے ۔ ہندوؤں نے عورت کی مذمت شاستروں میں دکھائی تھی اس لیے ان کا عورت کو برا بھلا کہنا تعجب خیز نہیں ۔ مگر کمال تو یہ ہے کہ اگرچہ قرآن حکیم نے عورتوں کے بالکل برابر اور قطعاً مساوی حقوق و حیثیت کا ذکر کیا ہے، مگر وہ بھی عورتوں کو قابلِ مذمت ہی گردانتے اور اس فعلِ بد کو اپنے "قابلِ ستائش بھی سمجھتے ہیں ۔ حد تو یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بیان میں، اللہ تعالے نے عزیز مصر کا جو ایک قول نقل کیا ہے، اس کو اپنا فیصلہ بنا اور بتا کے، اللہ تعالے پر بھی بہتان دھرا ہے کہ اللہ تعالے نے خود قرآن مجید میں عورت کی مکاری و چالبازی کا ذکر کیا ہے ۔ حالانکہ اللہ تعالے نے ہرگز ایسا نہیں کیا ہے، بلکہ اچھائی اور برائی دونوں میں عورت کو مرد کے برابر بتایا ہے ۔ امام الہند حضرت ابوالکلام آزاد نے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اپنی تفسیرِ قرآن میں، اس محل پر پہنچ کے فرمایا ہے :-

"حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکبازی و عصمت کے لحاظ سے دونوں جنسوں میں تفریق ہی کرنی ہو تو ہر طرح کی نفس پرستیوں اور مکّاریوں کی حیوانیت "مرد" کے حصہ میں آئے گی۔ اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی "عورت" کے لئے ثابت ہوگی۔ یہ "مرد" ہی ہے جس کی حیوانیت پر "عورت" کی فرشتگی شاق گذرتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُسے بھی اپنی ہی طرح کا حیوان بنا دے، اس لئے اپنے "کیدِ عظیم" کے سارے فتنے کام میں لاتا اور برائیوں کی ایک ایک راہ سے اُسے آشنا کر کے چھوڑتا ہے۔ پھر جب وہ اُس کے پیچھے قدم اٹھا دیتی ہے، تو یہ، اس سے گردن موڑ لیتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ اس کا کید تو سب سے بڑا کید اور اُس کی بُرائی سب سے بڑی برائی ہے۔ فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو "مرد" ہی کا کید ہے۔ جو پہلے اُسے اپنی کامجوئیوں کا آلہ بناتا ہے اور جب وہ بن جاتی ہے تو خود پاک بنتا اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ معصوم عورت کے سر ڈال دیتا ہے۔

دنیا کی کوئی "عورت" بُری نہ ہوتی اگر "مرد" اُسے بُرا بننے پر مجبور نہ کرتا۔ "عورت" کی بُرائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں کی جائے لیکن اگر جستجو کرو گے تو تہہ میں ہمیشہ "مرد" ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا۔ اور اگر اُس کا ہاتھ نظر نہ آئے تو اُن برائیوں کا ہاتھ تو ضرور ہی نظر آئے گا جو کسی نہ کسی شکل میں "مرد" ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔" (ترجمان القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۶۶)

مسلمانوں کے یہاں قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ اس میں بھی یہ کہلوا دیا گیا کہ پیغمبر صاحب نے معراج کے موقع پہ جہنّم میں بہت زیادہ "عورت" ہی کو دیکھا۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ "عورت" کی مذمت کے لئے اللہ تعالےٰ اور اُس کے نبی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دونوں کو شامل کر لیا جائے۔ حالانکہ بدیہی طور پر یہ بہتان ہے۔ نہ تو پیغمبر صاحب نے جہنّم میں کسی عورت یا مرد کو دیکھا نہ ایسا کہا۔ علامہ غلام جیلانی برق نے اس حدیث کو جھوٹی بتاتے ہوئے خوب سوال کیا ہے کہ :۔

"چوریاں کریں تو مرد، ڈاکے ڈالیں تو مرد، جیبیں کتریں تو مرد، قتل کریں تو مرد، بغاوت کی آگ بھڑکائیں تو مرد، جوا کھیلیں تو مرد، شراب پئیں تو مرد، امن عالم کو تہ و بالا کریں تو مرد، بستیوں کو آگ لگائیں تو مرد، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کریں تو مرد، عصمت دری کریں تو مرد، لیکن جہنّم میں بھری جائیں تو "عورتیں"۔ آخر کیوں ؟ کیا اللہ تعالےٰ کے عدل و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ساری برائیوں کا ارتکاب کریں "مرد" اور وہ جنت میں جائیں؟ اور "عورت"، جو اس طرح کے کوئی بھی گناہ نہ کرے وہ دوزخ میں سب جائے"؟

بالکل حقیقت ہے۔ میرے نزدیک "عورت" کی جنس کی حیثیت سے جو شخص مذمت کرتا ہے وہ اپنی "ماں" کا نہایت نافرمان و نافرجام اور احسان فراموش و بدنصیب بیٹا اور اپنی "بیٹی" کا نہایت بے رحم اور ظالم باپ ہے۔

فارغ - منشی بھولا ناتھ

صاحب "اردو مثنویاں" نے بلوم ہارٹ کے حوالہ سے فارغ کی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے جس کا نام "فسانۂ عجائب منظوم" ہے۔ اور جو رجب علی بیگ کے "فسانۂ عجائب" پر مبنی ہے۔ صاحبِ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے بھی اُن کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی مثنوی کا نمونہ یہ ہے :

سبحان اللہ! واہ! کیا باغ ٭ ہو جس سے دلِ بہشت پُر داغ

تھا عرصۂ زمردیں، زمیں پر ٭ پُر خندۂ چمن، نگارِ چینی پر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہر ایک روش کی پٹریاں صاف ۔۔ آئینہ مثال صاف شفّاف
بیٹھی بہ ادائے خوب و دل کش ۔۔ ہر ایک روش پہ ایک ماہوش

نمونہ سے مثنوی جاندار نہیں معلوم ہوتی ۔

فدوی ۔ منشی مکند لال

فدوی، لاہور کے رہنے والے اور ذات کے بنیاں تھے۔ مگر دلی آکر نواب ضابطہ خاں کے یہاں نوکر ہو گئے تھے ۔ ان ہی کی فرمائش پر فدوی نے "یوسف زلیخا" کے نام سے ایک مثنوی تحریر کی تھی، جو ناپید ہے ۔ اسی مثنوی کی سلسلہ میں وہ محاربۂ ہجو، وقوع پذیر ہوا تھا جو سودا کے ذکر میں اکثر جگہ مذکور ہوا ہے ۔ ضابطہ خاں کی امارت ختم ہونے پر وہ نجیب آباد، مراد آباد، فرخ آباد میں، مارے مارے پھرے اور آخر میں لکھنؤ آئے ۔ اور وہیں یہ معرکہ پیش آیا ۔ اس معرکہ کے بعد وہ بدنام ہو کر بریلی چلے گئے۔ فدوی نہایت تند مزاج اور لڑاکا قسم کے آدمی تھے اور ہر جگہ وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جایا کرتے تھے آخر بریلی میں بھی وہ کسی سے لڑ پڑے اور اسی کے نتیجہ میں قتل کر دیئے گئے۔ شاعر مشہور۔ مثنوی تاریخی، مگر نمونہ ناپید ہے ۔

فرحت ۔ منشی شنکر دیال

فرحت، دراصل قصبہ بھونگاؤں ضلع مین پوری کے رہنے والے تھے ۔ مگر ان کے دادا جہاں سنگھ نے فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ اور ان کے والد منشی پورن چند مہر لکھنوی تمام عمر لکھنؤ ہی میں رہے اس لئے فرحت خود کو لکھنوی لکھتے تھے ۔ فرحت کا اصل نام شنکر دیال تھا مگر ان کے اعزا ان کو بانکے لال بھی کہتے تھے ۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کیونکہ وہ نہ صرف خوبصورت آدمی تھے بلکہ نہایت پاکیزہ وضع قطع میں بھی رہتے تھے۔ اردو، فارسی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ شاعری میں منشی جواہر سنگھ جواہر کے شاگرد تھے۔ ۱۸۲۹ء / ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۰ء / ۱۳۰۷ھ میں انتقال کیا۔

فرحتؔ، نہایت پُرگو اور مذہبی خیالات کے شاعر تھے۔ اس لیے انھوں نے ادب و شعر کی خدمت، کو مذہب سے وابستہ کر رکھا تھا۔ ہمارے یہاں یہ مغربی اثر کارفرما ہے کہ ادب و شعر کو، مذہب کا دشمن قرار دے کر اُس سے الگ رکھتے ہیں، حالانکہ زندگی کا انحصار مثبت بنیادوں پر ہے جس میں اوّلیت مذہب کو حاصل ہے، اور اُس کو ہم اپنی زندگی سے علحدہ نہیں کر سکتے۔ اگلے زمانے کا قابلِ رشک امن و سکون صرف اس بنا پر تھا کہ زندگی سے مذہب کو الگ نہیں رکھا گیا تھا اور وہ ادب و شعر کے دوش بدوش چلتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تجربہ سے یہ راہ غلط ہو چکی اور اب پھر ضرورت ہے کہ فرحتؔ کی تقلید کی جائے۔

فرحتؔ نے اردو زبان اور صنفِ شعر کی بڑی خدمت کی ہے۔ انھوں نے دنیائے مثنوی میں ایک خاص اضافہ کیا ہے۔ اُنھوں نے گیارہ مثنویاں لکھی ہیں:۔

(۱) جانکی بجے	(۲) گنیش پران	(۳) اوبھت رامائن
(۴) شیو پران	(۵) گوری منگل	(۶) سکست چالیسی
(۷) پدم پران	(۸) وشنو سہسر نام	(۹) پریم ساگر
(۱۰) رامائن	(۱۱) فرحت افزا	

ان تمام مثنویوں میں سے "رامائن" کا نمونہ تو اس کتاب کے حصہ دوم میں ملے گا۔ بقیہ مثنویوں کے نمونے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جانکی بجے:۔

طوقِ حمائل میں ہو دل سبک سیر ہو کہ سیتا رام سے ہے جان کی خیر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(۲) گنیش پُران :-

ہر ہر مجھے یاد ہر سحر ہو ؛؛ شیو شیو، کا نقش فی الحجر ہو

(۳) ادبھت راماین :-

نثارِ بھگوتی باغِ سخن ہے ؛؛ ریاضِ شاعری بشن آرپن ہے

(۴) شیو پُران :-

ہر اک دم میں، دمِ آدم مہادیو ؛؛ کہیں ہم دست بستہ، ہر مہادیو

(۵) گوری منگل :-

رہ دراسے نہ سمائے دل میں ؛؛ ہو اننگ، شواسے دل میں

(۶) سنکٹ چالیسی :-

مچا جب غل کہ اے درگا، یہ ہنگامِ ترحّم ہے

مدد کی بر محل، سب دیوتا کہنے لگے، جے جے

(۷) پدم پُران :-

اننگ بشن، پشنلائے نہ کہہ ؛؛ اے دل! یادِ بھگوتی میں رہ

(۸) بشنو سہنسر :-

اننگ بشراش آتما دیو ؛؛ سربانگ مہاتما، مہادیو

(۹) پریم ساگر :-

یہ مثنوی بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں سری کرشن جی کے حالات نظم ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس میں اوّل الذکر مثنویوں کی سی بے کیفی نہیں ہے۔ مگر "راماین" اور "فرحت افزا" کی سی شیریں شعریت بھی نہیں ہے۔ تاہم یہ مثنوی بے مزہ نہیں بلکہ دلپذیر ہے :-

ہری، ہر روش سے ہو شاخِ قلم ؛؛ نئے گل کھلائے، پھلے دم بدم

قلم ایسا گلدستۂ گل بنے ؛؛ زباں اپنی منقارِ بلبل بنے

ہر اک مصرعۂ شعر ہو نخلِ نور ؛؛ روش کی روش پر ہو بین السطور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بہارِ مضامین برجستہ ہو :: عیاں مُو بمُو رازِ سربستہ ہو

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرحت کو ہر طرح کی زبان لکھنے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اس مثنوی میں لکھنویت نمایاں ہے۔ شری کرشن جی کی بانسری کی نغمہ ریزی کو جہاں پر مسطور کیا ہے، وہاں محاکاتی حُسن نمایاں ہے۔ لکھنویت وہاں یہ بھی ہے، رعایت لفظی وہاں بھی نہیں چھوڑی ہے، مگر حسن و لطافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ شعریت و جاذبیت کو لکھنویت پر قربان ہو جانے نہیں دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب کرشن جی نغمہ ریز ہوتے تھے تو :-

شجر پتّی پتّی سے دیتے تھے تال :: کلی کِھل کِھلاتی تھی ہو کر نہال

بشر سارے سُن ہو کے سننے لگے :: دُھنوں پر سَر و سینہ دُھننے لگے

سُنی جب صدا ہو گئے گوال سُم :: ہوئے سننے والوں کو ہر تال سم

مزے دار شعر ہے۔ پہلے مصرع میں "سم" ہندی ہے جس کے معنی تال اور سُر کے بھی ہیں اور مبہوت و ششدر ہو جانے کے بھی۔ اور دوسرے مصرع میں "سم" عربی ہے جس کے معنی زہر کے ہیں۔ اور سنئے :-

جو تھے اہلِ ہوش اُن کو سکتے ہوئے :: رہے مثلِ بسمل سسکتے ہوئے

یہ تھا عالمِ بے خودی دمبدم :: قدم پر گری جُھک کے شاخِ قدم

سُنی گوپیوں نے جو میٹھی صدا :: اُڑیں بن کے بیخود برنگِ صبا

خبر ساری بھولیں نہ تھا دل کو ہوش :: نہ چادر کی سُدھ تھی نہ ساری کا ہوش

اس مثنوی کا قطعۂ تاریخ خود مصنّف نے کہا ہے اور انداز ہے کہ واقعی انھوں نے یہ مثنوی خواص کے لئے نہیں، بلکہ عوام کے لئے بھی لکھی ہے :-

یہ پوتھی ہے اک تحفۂ بے نظیر :: نہ ہو کس طرح دل پسندِ عوام

دلِ شاد سے تم یہ فرحت کہو :: ہے پوتھی عجب چشمۂ فیضِ عام

آخری پورے مصرع سے $\frac{١٨٦٢\text{ء}}{١٢٧٨\text{ھ}}$ نکلتا ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

فرحت کی ادبی مثنوی "فرحت افزا" بھی دلچسپ ہے۔ غالباً یہ سحرالبیان اور گلزار نسیم دونوں سے بر تکلف مقابلہ کے لئے لکھی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ فرحت نے صفائی بیان میں، دونوں پر کامیابی حاصل بھی کی ہے۔ مثلاً سحرالبیان میں پری اور انسان کے ملاپ کے موقع پر کہا ہے: ؎

کہاں صورت جن، کہاں شکل انس :: غرض قہر ہے صحبت غیر جنس

فرحت نے کہا ہے: ؎

پری آتشی اور خاکی ہے انس :: غرض قہر ہے صحبت غیر جنس

یا گلزار نسیم میں بکاؤلی اور تاج الملوک کے مبادلۂ انگشتری کے موقع پر ہے: ؎

انگشتری اپنی اُس سے بدلی :: جز خط عاشقی سند لی

فرحت نے کہا ہے: ؎

پہنا اُس کو انگشتری زرنگار :: عوض میں لیا اُس کا چھلا آشکار

بہرکیف! شہزادہ، تصویر پری کے باغ میں چھپ جاتا ہے۔ کچھ عورتیں دیکھ لیتی ہیں۔ کہتی ہیں: ؎

درختوں میں دیکھو چمکتا ہے کیا :: ستارہ زمیں سے فلک پر گرا
نہ ٹھہری کسی کی نظر حسن پر :: کہا سب نے، یہ شمس ہے یا قمر؟
کسی نے کہا: ہے پری یا کہ جن :: شب تار میں یا قیامت کا دن؟

ایک سیانی نے کہا: ؎

نہ آسیب ہے، نہ پری اور نہ جن :: نہ جانو اسے تم قیامت کا دن
بشر ہی ہے، نہ یہ حور و غلماں سے ہے :: یہ رشکِ مہ و مہر انسان ہے

شاہزادہ کی مہمانداری کی گئی۔ شراب پیش کی گئی تو شاہزادہ نے اولاً انکار کیا مگر پھر: ؎

بہ منت جو پیش آئی وہ ماہرو :: پیا شاہزادے نے جام صبو
پیا، بھر دیا، جام تصویر کو :: کہا کہ تم تو بڑے تیز ہو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

چلا دور پر دور اک اور بھی ٭ بدل پھر گئے چشم کے طور بھی
نظر پھر گئی چشم مخمور کی ٭ لگی پاس سے پوچھنے دور کی
بہت عمدہ شعر ہے۔ کیف و مستی میں یہی ہوتا ہے۔

فرقت ۔ پنڈت دیبی پرشاد

فرقت، لکھنؤ کے رہنے والے اور اندر سبھا والے امانت لکھنوی (وفات ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء) کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے بیان کیا ہے کہ فرقت نے شہر لکھنؤ کے حالات پر "لطیفۂ فرقت" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جس کی تاریخ امانت نے نکالی تھی۔ یہ ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء کی تصنیف ہے۔ نمونہ یہ ہے:

غضب ہے جو یاں صاحبِ تاج ہو ٭ پے تختِ شاہی وہ محتاج ہو
جدھر جاؤ بازار سنسان ہیں ٭ محل شہر کے دیکھو تو ویران ہیں
نظر آئے ہر دل پہ کیونکر نہ داغ ٭ ہوا لکھنؤ یک بیک بے چراغ

فروغ ۔ کنور بدری کرشن

فروغ، سکندر آباد کے صاحبِ علم رئیس اعظم تھے۔ منشی ہر گوپال تفتہ کے شاگرد تھے۔ بڑوں کی ہر بات نرالی اور عجیب ہوتی ہے۔ فروغ نے اپنے نوجوان مرحوم بیٹے کنور کرتار کرشن کی یادگار، مجسمہ وغیرہ کی صورت میں نہیں قائم کی۔ کوئی مندر نہیں بنوایا۔ کوئی گؤشالہ نہیں قائم کیا۔ کوئی سبیل نہیں چلائی۔ کیونکہ یہ سب، چند دنوں کے بعد مٹ جانے والی چیزیں تھیں، بلکہ انھوں نے اس کی یادگار کے طور پر ۱۹۱۷ء / ۱۳۳۵ھ میں ایک مثنوی لکھ ڈالی جس کا پورا نام "مثنوی نورِ نظر عرف فروغِ طور" ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دنیا کا سب سے بڑا، سب سے مقبول اور زندہ جاوید سوانح نگار پلوٹارک (PLUTARCK) ہوا ہے جو پہلی صدی عیسوی کا نامور یونانی ہے اور اُس کی لافانی تصنیف "کتاب اکسیر" دنیا کی عظیم ترین کتابوں میں سے اوّل درجہ کی ایک کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ اس کتاب میں پلوٹارک کے وطن شیرونیہ پر جو بھاری مصیبت آئی تھی اور جو جنرل لوکلوس کی عنایت سے ٹل گئی تھی ورنہ شیرونیہ کا نام و نشان مٹا دیا جاتا، اُس کا اُس نے ذکر کیا ہے اور اُس کے بعد لکھا ہے کہ :۔

"محسن و منصف لوکلوس کی شکر گزاری میں شہر والوں نے اپنے چوک میں باکوس دیوتا کے قریب، لوکلوس کا مجسمہ نصب کیا۔ اگرچہ اس واقعہ کی کئی پشتیں گذر گئی ہیں لیکن راقم الحروف بھی اپنے وطن کے ساتھ اِس بھلائی کے سبب، جو لوکلوس نے کیا اور جس کی وجہ سے ہمارے شہر کی مصیبت دور ہوئی، اُس کا دل سے احسان مند ہے اور چاہتا ہے کہ لوکلوس کے سوانح کو اپنی متوازی "سیر مشاہیر" میں داخل کرے اور صداقت سے تجاوز کئے بغیر اُس کے حالات کو ضبط تحریر میں لاکر قلمبند کر جائے۔ کیونکہ ہماری دانست میں چہرے اور جسم کی شبیہہ بنا دینے سے کہیں زیادہ تکریم اس میں ہے کہ ہم اپنے محسن کی سیرت و کردار کا مرقع کاغذ پر بنائیں"

غور فرمائیے کہ دنیا کے اس عظیم اور زندہ جاوید انسان نے کیا کہا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ لوکلوس کی یاد کے لئے لوگوں نے مجسمہ بنایا، یا اور چند شکل اختیار کی، مگر وہ سب فانی یادگار ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے اِس محسن کی یاد ہمیشہ باقی رکھنے کے لئے کاغذی یادگار چھوڑیں کیونکہ وہی پائدار یادگار ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ لوکلوس کا مجسمہ کب کا ناپید و نابود ہو چکا۔ اُس کی یادگار کب کی فنا ہو چکی، لیکن پلوٹارک نے کتاب میں جو اُس کی یادگار قائم کی وہ آج تک موجود ہے۔ پلوٹارک کی یہ کتاب، دنیا کی ساری بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور جس شخص نے بھی اس کتاب کو پڑھا ہے لوکلوس کا نام جانتا ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اور یہ کاغذی یادگار ایسی ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔

فروغ نے اپنے بیٹے کی یادگار میں کوئی فانی چیز نہیں تیار کرائی بلکہ اُس کی یادگار میں ایک مثنوی لکھ ڈالی اور ہم آپ بھی اُن کے جواں مرگ عزیز بیٹے کرتار کرشن سے واقف ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے فرمایا ہے کہ یہ مثنوی فروری ۱۹۱۷ء میں شائع ہو گئی تھی۔ اِس کی ابتدا میں شہنشاہ جارج پنجم کی تعریف ہے۔ اس میں ایک طبیب کی یتیم لڑکی ہیرو ہے۔ اُس نے شاہی دربار میں رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ اتفاقاً بادشاہ کو ایک مہلک مرض نے پکڑا۔ اُس طبیب زادی نے بادشاہ کا علاج کیا اور اتفاق یا خوش قسمتی سے بادشاہ نے صحت حاصل کر لی۔ بادشاہ نے انعام دینا چاہا تو اُس نے اپنے محبوب کو مانگا جو بادشاہ نے دیدیا۔ یہ کوئی نثری قصہ تھا جسے اردو کا جامہ پہنایا گیا تھا۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ قصہ مشرق کا نہیں بلکہ مغرب کا تھا جسے انگریزی یا کسی دوسری یورپین زبان سے لے کر نظم کیا گیا تھا۔ کیونکہ فروغ نے لکھا ہے کہ:

یورپ کی زباں میں اک حکایت ۔:۔ ہے قصۂ جانگزا نہایت

وہ نثر ہے، نظم میں لکھوں گا ۔:۔ یورپ کو خطاب دو ہندوؤں کا

بلاشبہہ مثنوی صوری و معنوی حیثیت سے کوئی مرتبہ نہیں رکھتی، مگر یہ انفرادیت کیسے بھلائی جا سکتی ہے کہ فروغ نے اپنے بیٹے کی یادگار، یہ مثنوی لکھ کر، قائم کی ہے؟

اردو زبان میں، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے، ایک عجیب تاریخ دیکھنے میں آتی ہے۔ لکھنؤ میں جس طرح منور لکھنوی کے ہندو خاندان میں مسلسل پانچ پشتوں تک نامور شعرا پیدا ہوئے، جن کا ذکر منور نے یوں کیا ہے:

شاعری ہے نہ منور کو ہو کیونکر رغبت ۔:۔ پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

اسی طرح میر انیس کا مسلمان خاندان، پانچ پشتوں تک نامور شعرا سے مزین رہا ہے۔

میر انیس چوتھی پشت میں ہیں جو اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر اپنا جواب نہیں رکھتے اور انھوں نے مرثیہ نگاری کو وہاں پہنچا دیا جس سے آگے جانا ممکن نہیں ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میر انیس کے ایک بیٹے میر عسکری رئیس مفلوج تھے جس وجہ سے میر انیس کو ان سے بڑی محبت تھی۔ میر انیس کی خواہش نہ تھی کہ میر عسکری بے نام و نشان مر جائے، لہٰذا انھوں نے اس کو زندہ رکھنے کی ادبی صورت یہ نکالی کہ ایک مرثیہ خود اس کے نام سے لکھ دیا اور واقعی وہ میر عسکری کو زندہ بنا اور رکھ گئے۔ یہی وہ مرثیہ ہے جس میں میر عسکری رئیس نے دعویٰ کیا ہے :۔

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

اور آج میر عسکری اس مرثیہ کی وجہ سے زندہ ہیں۔ اگر ان کی یہ یادگار میر انیس قائم نہ کر جاتے تو میر عسکری رئیس کا نام مٹ گیا ہوتا۔ انیس اور فروغ کے یہ کارنامے مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

فضا۔ منشی گوبند پرشاد

فضا، منشی گورکھ پرشاد عنقا کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا منشی جیون پرشاد بھی مشہور شخص تھے۔ فضا ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء میں انتقال کر گئے۔ انھوں نے "بوستانِ اردو" کے نام سے ایک مثنوی لکھی مگر اس کا کوئی نمونہ مل نہ سکا۔

دوسری مثنوی "گلزارِ فضا" کے نام سے لکھی تھی جو "شیریں خسرو" کے نام سے بھی موسوم تھی۔ اسی نام کی فارسی میں کئی شاعروں نے مثنوی لکھی ہے۔ مثلاً امیر خسرو، نظامی گنجوی، عبداللہ ہاتفی اور جعفر بیگ قائم۔ مثنوی کی ابتدا یوں ہوتی ہے :۔

جھکا سر اے قلم! لکھ حمدِ باری ٭ کہ حاصل ہو سخن کو پائداری

نمونہ کے لئے واجد علی شاہ کی مدح کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے :۔

ہوا شاہِ اودھ، وہ شاہِ عادل ٭ نہیں جمشید بھی جس کے مقابل

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

زہے واجد علی، سلطانِ عالم ٭ تنِ جود و سخاوت، جانِ عالم
خدا سے یہ دیا روئے دل افروز ٭ خجل ہیں ماہ و خورجیں سے شب و روز
نسیم فیضِ شہ سے رنگ و بو ہے ٭ کہ رشکِ خلد، شہرِ لکھنؤ ہے

فقیر — منشی کیولا پرشاد

فقیرؔ، بہار کے ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے فاضل ادیب تھے۔ ان کے بھائی راجہ رام نرائن موزوںؔ بحیثیت اچھے شاعر، مشہور رہیں۔ فقیر نے ایک مثنوی اپنی سرگذشت میں لکھی ہے۔ "تذکرۂ ہندو شعرائے بہار" میں اُن کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مثنوی غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ ۱۹۶۰ء کی اردو نمائش میں پیش ہوا تھا۔ نمونہ یہ ہے :-

میں احوال اپنا لکھوں مختصر ٭ نہیں کذب کا اس میں کچھ ہے اثر
کہ تھے از بزرگانِ من رنگ لال ٭ دو فرزند اُن کو، لکھوں اُن کا حال
دوئم وارث ازروئے شہینگی ٭ ولے بخت سے مجھ کو شرمندگی
نہیں ہے معاش و نہیں ملکیت ٭ مگر اک وجہ رزق زیں کیفیت

فہیم — منشی پربھو دیال

فہیمؔ، قوم کا ئستھ سریواستو سے تعلق رکھتے تھے۔ منشی گجادھر پرشاد مختار جو محلہ نگریاں، ٹھاکر گنج، لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور ذی حیثیت مشہور آدمی تھے، وہ فہیم کے والد تھے۔ ان کے بزرگ دیوان کاشی رام، نواب آصف الدولہ کے جاگیردار تھے۔ علوم متداولہ کے ساتھ ساتھ، علم نجوم کے بھی ماہر تھے۔ خبیرؔ لکھنوی کے ذی وقار شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ فہیم صاحب نے "سری کرشن جنم" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی،

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ نمونہ نہیں مل سکا۔

کرامت ۔ منشی جواہر لال

منشی جواہر لال کرامت کے والدین صوبہ بہار کے مشہور علاقہ ٹکاری کے ایک خوشحال کائستھ خاندان کے افراد تھے۔ والدین کا گھر بے چراغ تھا اس لئے کہ کوئی اولاد نہ تھی۔ دستورِ زمانہ اور دلی عقیدہ کی بنا پر بزرگان سے رجوع کیا گیا۔ تا آنکہ کرامت کی پیدائش ہوئی۔ چونکہ کرامت کی پیدائش عین ۱۰ محرم یعنی عشرہ کے روز ہوئی اس لئے اس کو امام حسین کی کرامت سمجھا اور مانا گیا اور لوگ اُن کو کرامت حسین کہتے تھے حالانکہ ان کا اصل نام جواہر لال تھا۔ جب کرامت نے شاعری شروع کی تو اسی شہرت و رعایت کے لحاظ سے انھوں نے کرامت تخلص اختیار کیا۔ یہ مہاراج ٹکاری (ضلع گیا بہار اسٹیٹ) کے دوستوں میں سے تھے اور اُن کی پرورش پرداخت بھی ٹکاری ریاست کی طرف سے ہوئی تھی کیونکہ غریب ہوتے ہوئے بھی ان کے خاندان اور مہاراجہ کے خاندان سے نہایت گہرا دوستانہ تعلق قائم تھا۔

کرامت نے ایک مثنوی "بلب چرتر" کے نام سے لکھی تھی جو ۱۸۹۴ء ۱۳۱۲ھ میں شائع ہو گئی تھی۔ اس میں کوئی قصہ وغیرہ نہیں نظم ہوا ہے بلکہ والئی ٹکاری اور دوسرے اکابرِ ریاست کی مدح اور کمال شاعری کے اظہار کے لئے یہ لکھی گئی ہے۔ چنانچہ مہاراج کی تعریف یوں کی گئی ہے:۔

فلک رتبہ و بارگاہِ بلند ؛ ہیں راجہ ٹکاری کے بس ارجمند

ہیں عالی نسب اور والا تبار ؛ رہیں شاد و خرم وہ لیل و نہار

عدالت سے خوش ہیں رعیت تمام ؛ ثنا خواں ہیں اُن کے سبھی خاص و عام

سخاوت کا اُن کی کروں کیا بیاں ؛ گدا تک بھی ہیں اہلِ دولت یہاں

مسافر نواز و عدالت گرا ؛ رہِ معرفت کے ہیں وہ رہنما

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کیفی — پنڈت برج موہن دتاتریہ

کیفی کا نام برجموہن اور دتاتریہ خاندانی لقب ہے۔ اردو زبان کے یہ واحد شاعر و ادیب ہیں جنہیں "علّامہ" کہا جاتا تھا۔ اور سارے ہندو اور مسلمان اُن کی یکساں عزت کرتے تھے۔

کیفی نے دو مثنویاں لکھی تھیں ایک "پریم ترنگنی" جس میں تشبیہہ و تمثیل اور استعارات کے پیرایہ میں انھوں نے حُسنِ اخلاق، حُسنِ سلوک اور حُسنِ تزکیہ کے عالمگیر اصول بتلائے ہیں۔ کیفی کا خیال تھا کہ آج کل مذہب کے دلدادہ بننے والے عموماً محاسن سے خالی اور محامد سے عاری ہوتے ہیں، حالانکہ مذہب کی بنیاد ہی خدمتِ انسانیت اور حُسنِ اخلاق ہے۔ اگر کسی شخص میں یہ چیزیں موجود ہیں تو وہ چاہے جیسا بھی لامذہب اور گیا گزرا مشہور ہو، مگر درحقیقت وہ اُن سارے لوازم کو پورا کر رہا ہے جو مذہب کسی پر عائد کرتا ہے۔ اور اگر یہی دونوں چیزیں کسی میں نہ ہوں تو اگرچہ وہ زبان سے خدا اور بھگوان کا نام جپتا رہے اور عوام میں بھگت مشہور ہو، وہ قطعاً لامذہب ہے۔ کیفی کا یہ تصوّر سو فیصدی درست ہے۔ قرآن حکیم میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ سے کہا گیا ہے کہ:-

(۱) "اور بیشک تم اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہو۔" (قلم - ۱ - ۶۸/۴)

(۲) "خدا کی رحمت کی وجہ سے تم اُن کے ساتھ با اخلاق ہو۔ اگر تم بدخلق ہوتے تو تمہارے پاس سے یہ بھیڑ چھٹ جاتی۔" (آل عمران ۱۷ - ۳/۱۵۹)

حدیث میں ہے کہ ایک بار ایک یہودی نے آپ سے کہا تھا کہ اتنے ہزار پیغمبر تو آچکے تھے۔ اب آپ کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے فرمایا کہ:-

"میں اس لئے آیا ہوں کہ اخلاق کو، درجہ کمال کے آخری سرے پر پہنچا دوں۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مگر حقیقت یہی نظر آتی ہے کہ چاہے ہندو ہو یا مسلمان، بظاہر صورت اور زبان سے جتنا زیادہ مذہبی نظر آتا ہے بہ باطن اتنا ہی زیادہ وہ بداخلاق اور انسانیت سے خالی ملتا ہے۔

کیفی کی دوسری مثنوی کا نام "جگ بیتی" ہے۔ یہ ایک نئے طرز کی مثنوی ہے۔ اس میں پچیس ۲۵ فصلیں ہیں اور ہر فصل کی بحر جدا ہے۔ خود فرماتے ہیں: ؎

ہر فصل کی ہے بحر الگ، اس سے ہے مقصود
بے لطفی یک آہنگی کی، ہو نظم سے مفقود

سیماب اکبرآبادی نے اس مثنوی پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :۔

"اس جدت نے "جگ بیتی" کو تمام پرانی مثنویوں سے ممیز ضرور کر دیا ہے مگر میرے خیال میں مثنوی کی دل نشینی کا سبب صرف یک آہنگی ہی ہے۔ یک آہنگی سے جو تسلسل پیدا ہوتا ہے، وہی ایک چیز ہے جو باوجود طوالت، مثنوی کو سماعت و نظر کے لئے گوارا بنا دیتی ہے۔"

یہ مسئلہ بڑا زیر بحث رہا اور یہ مثنوی موضوعِ گفتگو بن گئی۔ سیماب صاحب نے اس مثنوی پر کچھ اعتراضات بھی کئے تھے۔ پروفیسر عبداللہ کامل نے اس کے خلاف ایک مضمون لکھا اور ان تمام اعتراضات کو غلط قرار دیا اور مثنوی کو سارے بیانیہ عیوب سے پاک ظاہر کرتے ہوئے اردو ادب میں منفرد بتایا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی نے لکھا کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں کہ اسے قابلِ اعتراض یا لائقِ داد سمجھا جائے۔ قرآن السعدین، نصاب الصبیان، خالق باری موجود ہے جس کی مختلف فصلیں، متفرق بحروں میں ہیں۔ اس کے جواب میں پھر کامل نے ایک مضمون لکھا کہ قران السعدین فارسی زبان میں ہے اور علامہ کیفی کا دعویٰ صرف اردو زبان کی مثنویوں سے متعلق ہے پھر ان دونوں میں پوری مشابہت بھی نہیں۔ قران السعدین کی غزلیں، مثنوی کے مضمون سے بالکل الگ ہیں اور غزلیات کے سوا ساری مثنوی ایک ہی بحر میں ہے۔ "جگ بیتی" میں باوجود

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اختلافِ بحر کے، مضمون کا تسلسل کہیں نہیں ٹوٹتا۔ نصاب الصبیان اور خالق باری بھی مثنویاں نہیں بلکہ ایک قسم کی منظوم ڈکشنریاں ہیں۔ نہ اُن میں کسی قسم کی ترتیب رکھی گئی ہے نہ تسلسل۔ لہٰذا اُن کو "جگ بیتی" سے ملانا درست نہیں ہے۔ کامل نے دعویٰ کیا کہ "جگ بیتی" اردو میں واحد مثنوی ہے جو مسلسل مضامین کی حامل ہوتے ہوئے بھی، مختلف بحور میں رواں ہے۔

میرا خیال ہے کہ کیفی نے "جگ بیتی" کی تمام فصلوں کی بحور مختلف اختیار کر کے دراصل اس عام اعتراض اور تصوّر کا سدّباب کیا ہے کہ مثنوی کے لئے فلاں فلاں بحر مخصوص ہے۔ کیفی نے یہ دکھایا ہے کہ مثنوی کے لئے ایک یا چند بحر کو مخصوص کرنا تو کجا، ایک ہی مثنوی کے اندر، اُن کی فصلوں یا اُن کے ابواب تک کو مختلف بحور میں لکھنا کوئی عیب نہیں۔ اور یہ صحیح ہے۔

نمونہ کے لئے، میں یہاں مختلف بحروں کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں: ~

تھا اک مقام، فضا جس کی دل لبھاتی تھی ؎ ادا سے حسن کی پھبن، جی بہ بیٹھی جاتی تھی
سہانی لغزشیں، مستانہ آبشاروں کی ؎ وہ والہانہ لٹک چال، جوئباروں کی
تھا کوہسار کا دلچسپ یوں نشیب و فراز ؎ کہ جیسے شیر و شکر ہو گئے ہوں ناز و نیاز
وہ راگ چشموں کے اور وہ ترانے نہروں کے ؎ کہ لائی ہاتی تھے نغمے ہزار لہروں کے
سحر سے کم نہ سجاوٹ کا ساز و سامان تھا ؎ دلہن بہار تھی اور اس کا یہ شبستاں تھا

گھر میں اک سمت آئی بیچاری ؎ پہلے ہر سمت اک نظر ڈالی
گھر کی بی بی کو کر کے تسلیمات ؎ پاؤں چھونے کو جب بڑھایا ہات
اُس نے "ہیں ہیں"، کیا تکلّف سے ؎ جانکی نے قدم پکڑ ہی لئے

رقم رکھ کے لوٹا جو وہ نیک مرد ؎ روپے کا نہ تھا نام کو دل میں درد
خوشی تھی یہ خدمت کو اُمید تھی ؎ کہ اب واپس آ جائے گی، جانکی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پولس نے دلائی تھی اتنی امید ؛ یقیں تھا کہ اب آئے وہ دن سعید
مگن اور خوش خوش وہ گھر کو گیا ؛ پولس نے ادھر جال پھیلا دیا

کیفی کو شاید پولس سے کچھ تلخ تجربہ ہوا تھا، لہذا وہ پولس کی زیادتی اور بدعہدی کو بھی ادب و شعر کی دنیا میں گھسیٹ لائے۔ اور واقعی جب وہ بھی ہماری معاشرت، ہمارے سماج اور ہماری زندگی میں شامل ہے تو ادب و شعر اس سے بے نیاز کیونکر رہ سکتا ہے؟ بہرکیف! کیفی کی یہ مثنوی اردو کے منظوم افسانوں کی تاریخ میں ایک نیا باب یا عجیب موڑ پیدا کرتی ہے۔ مصنف نے فرمایا ہے :؎

احباب اگر چاہیں تو کہہ دیں اسے جدّت
کیفی کو تو منظور ہے، اردو کی ہو خدمت

اور کون شک اس میں ہے کہ کیفی نے اپنی کبیر سنی کے سبب اردو زبان کی جتنی خدمت کی ہے وہ دوسروں کو کہاں نصیب؟ قطعہ تاریخ خود مصنف کا ہے :؎

ہوئی یہ مثنوی اب ختم، جگ بیتی ہے نام اس کا ؛ بھری اس میں سراسر واقعیت اور حقیقت ہے
جو سنہ تصنیف کا پوچھیں تو ان سے کہہ دو اے کیفی ؛ یہ "باغِ نظم" ہے شان اس کی شائستہ فصاحت ہے

"باغِ نظم" سے ۱۹۹۳ سمبت بکرم اور "شائستہ فصاحت" سے ۱۳۵۵ھ نکلتا ہے۔

گوہر ۔ منشی گیندن لال

گوہر، منشی رام دیال رسا کے بیٹے اور منشی تلوک چند کے پوتے تھے۔ اصل وطن فرخ آباد تھا، مگر یہ لوگ بدایوں آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ گوہر بدایوں ہی میں پیدا ہوئے۔ قوم کائستھ سے تھے اور بدایوں کے کلکٹر کے اوفس میں سررشتہ دار تھے۔ شاعری میں شیو نرائن ہوش مرادآبادی اور شیو پرشاد کشتہ کے شاگرد تھے۔ ابتدا میں اپنے والد رسا سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ مگر صاحبِ "بہارِ سخن" نے انہیں سعادت بدایونی کا شاگرد بتایا ہے۔ اور سالِ وفات ۱۹۰۱ع ۱۳۱۹ھ لکھا ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

گوہر، خاندانی شاعر تھے۔ مگر مصنف بھی تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں۔ قابل آدمی تھے۔ صاحبِ "شعرائے ہنود" اور صاحبِ "بہارِ سخن"، دونوں نے ذکر کیا ہے کہ گوہر نے ایک مثنوی "گوہرِ شب چراغ" کے نا ست لکھی تھی۔ مگر دونوں میں سے کسی نے بھی کچھ اشعار نقل نہیں کئے۔

گوہر۔ سری مت کاشی

صاحبِ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" ذاکر ہیں کہ گوہر، بنارس کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی بہت اچھی لکھی تھی جس کا نام بڑا لمبا تھا۔ یعنی "مثنوی درصفت کاشمیر موسوم بہ جنت نظیر"۔ یہ مثنوی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ع میں شائع ہو گئی تھی۔ اس کی ابتدا میں مہاراجہ رنجیت سنگھ (سکھ راجہ پنجاب ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ع تا ۱۳۰۶ھ/۱۸۲۷ع) کی تاریخ بھی تھی۔ نمونہ کے لئے، کشمیر کے ایک تالاب کا ذکر سنئے: ؎

کہ کشمیر میں ایک تالاب ہے ؞ چمک آب کی مثلِ سیماب ہے
نئے ہر طرف اس کے عمدہ ہیں گھاٹ ؞ جو ہو بار ڈھب، سوجھے ہرگز نہ باٹ
کنول بھی کھلے اس میں ہیں اس قدر ؞ کنول دل کا روشن ہو، پڑتے نظر

لوذعی۔ منشی بھگوان دیال

لوذعی، عجیب تخلص ہے۔ بھسنڈرہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "مہر دل نامہ" کے عنوان سے لکھی تھی جو نایاب ہے۔ صاحبِ "شعرائے ہنود" نے اُن کا ذکر کیا ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لیئق - منشی للتا پرشاد

لیئق، مشہور شاعر ہیں۔ ان کے والد کا نام مدنی لال تھا۔ اُن کی پرورش اُن کے نانا ایشری پرشاد نے کی تھی۔ وطن سندیلہ تھا، لیکن اپنے نانا کے ساتھ کانپور میں رہتے تھے۔ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ ایک قادر الکلام شاعر اور خدا بخش خاں فرد کے شاگرد تھے۔ محکمہ کمسریٹ آگرہ میں سررشتہ دار تھے۔ اپنے عہد کے قابلِ ذکر شعرا میں سے تھے۔ جس عہد میں شفاش تذکرہ لکھ رہے تھے، لیئق حیات تھے۔ بقول شفاش انھوں نے ایک مثنوی "تمثیلِ کہن" کے نام سے لکھی تھی۔

لیئق کے معاصر نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ بریلوی کے دیوان میں، ایک مثنوی کا جو قطعۂ تاریخ انھوں نے لکھا تھا، وہ درج ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس مثنوی کا تاریخی نام "گنج قصہ" تھا:-

لئیقِ سخندانِ عالی مقام ٭ زمانے میں ہے جس کا مشہور نام
جو کی نظم اردو میں اس نے رقم ٭ سری کشن کے رہس کی دھوم دھام
لکھا سالِ اتمام میں نے عزیزؔ ٭ ہوا شکر یہ "گنج قصہ" تمام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیئق کی دو مثنویاں تھیں۔

مائل - امراؤ سنگھ

صاحب "اردو مثنویاں شمالی ہند میں" نے ذکر کیا ہے کہ مائل نے ایک مثنوی "شعلۂ عشق" کے نام سے ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء میں لکھی جو لمبی مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ رامپور لائبریری میں موجود ہے جو ۲۰ رجنوری ۱۸۵۰ء / ۱۲۶۶ھ کا لکھا ہوا مصنف کا خاص نسخہ ہے۔ ابتدا میں راجہ بلوان سنگھ والیٔ کاشی کی مدح ہے، نمونہ یہ ہے:-

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تھا باغ نگار خانۂ عشق ٭ ہوتا تھا وہاں ترانۂ عشق
اک حسن و جمال کا ترانہ ٭ وہ باغ ہوا طلسم خانہ
مرغانِ چمن بھی نغمہ پرداز ٭ پیدا ہر ایک سمت تھی یہ آواز
ہر سمت رواں دواں گل اندام ٭ عشرت سے چمن میں تھا سبک گام
وہ آنکھ شراب کا پیالا ٭ بس نشۂ عشق ہو دوبالا

مثنوی میں قصہ کیا ہے؟ انجام کیا ہے؟ کسی چیز کا ذکر موجود نہیں۔

مبتدی ـ منشی دیوکی نندلال

عظیم آباد (پٹنہ) کے مشہور کایستھ محلہ، دیوان محلہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "بھاگوت گیتا" کے نام سے لکھی ہے، جس کا ذکر اس کتاب کے دوسرے حصہ میں کیا گیا ہے۔

محب ـ منشی برج بھوکن لال

محب کے والد کا نام منشی بھیروں پرشاد تھا۔ دریاباد ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، بھاشا اور انگریزی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ نہایت عمدہ کاتب اور خوشنویس تھے۔ کمسنی میں باپ مر گئے، ماں نے پرورش کی اور ہونہار بنا دیا۔ اُن کے یہ مشہور اشعار ہیں: ؎

جو عالی ظرف ہیں ان کو نہیں فکرِ تن آسانی ٭ کہ غیروں کے مزے کے واسطے ہے جام گردش میں

جہاں کے ساز و ساماں پر نہ ہونا چاہئے شاداں ٭ جب اپنی موت پر قابو نہیں دنیا میں انساں کا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ دونوں شعراں کا مسلک حیات تھے۔ وہ اُن ہی کا چلتا پھرتا مجسمہ تھے انھوں نے "رنگِ زمانہ" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جو شائع بھی ہو گئی تھی مگر نمونہ نہ مل سکا۔

محزوں — لالہ سری کرشن

محزوں، پنجاب کے ضلع امرتسر کے رہنے والے تھے۔ اردو، فارسی کے ماہر اور انگریزی سے واقف تھے۔ کلکٹر امرتسر کے اوفس میں کلرک تھے اور خوش خوراک، خوش لباس اور خوش مزاج تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "لطافتِ روح" کے نام سے لکھی تھی جس کا ذکر ملتا ہے۔ نمونہ کوئی نہیں ملا۔ قرینہ غالب یہ ہے کہ محزوں کے مزاج میں نفاست اعلیٰ درجہ کی تھی جو مزاج، لباس اور خوراک سب سے ظاہر تھی، اسی رعایت سے انھوں نے یہ مثنوی لکھی ہو گی۔

"روح" کیا چیز ہے؟ یہ اب تک سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔ قرآن حکیم میں پیغمبرِ اسلام سے مخاطب ہو کے کہا گیا ہے کہ:

"لوگ تم سے "روح" کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کیا ہے؟ تم کہہ دو کہ وہ ہمارے پروردگار کے "امر" میں سے ہے۔ اور تم کو اس کا بہت کم علم دیا گیا ہے" (بنی اسرائیل ۱۰ - ۱۷/۸۵)

ظاہر ہے کہ اندریں حالت "روح" کو سمجھنا مشکل ہی ہے۔

مدہوش — لالہ ابنی پرشاد

مدہوش، دہلی کے رہنے والے تھے، والد کا نام گردھاری لال تھا۔ نہایت قابل اور پُر گو شاعر تھے۔ انھوں نے کئی مثنویاں لکھی تھیں:۔

(۱) گوپی چند (۲) غمزۂ دلربا (۳) "طوطا و مینا"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پہلی مثنوی ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اس میں ہیا لال کے نثری قصہ کو نظم کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس میں زندگی کے مادی پہلو پر روحانی پہلو کی فوقیت ظاہر کی گئی ہے۔

قصہ یوں ہے کہ دھارا نگر کے راجہ گوپی چند کی رانی رتن کنور نے خواب میں اپنے شوہر کو جوگی کے لباس میں دیکھا اور بہت پریشان ہوئی۔ اور واقعتاً یہی ہوا بھی۔ راجہ کی ماں رانی مینا وتی نے بیٹے کو دنیا کی بے ثباتی کا سبق، اس انداز سے پڑھانا شروع کیا کہ وہ بہت متاثر ہونے لگا۔ اسی درمیان اس کا ماموں آیا۔ جو اپنے ساتھ راجہ بھرتھری گورو گورکھناتھ کو بھی ساتھ لایا۔ اُن کی صحبت نے پورا کام کیا اور گوپی چند "راجہ" سے "جوگی" بن گیا۔ مدہوش کی یہ باہوش مثنوی بہت مقبول ہوئی۔ کئی بار چھپی اور لندن تک پہنچی۔ نمونہ یہ ہے :-

کروں حمدِ معبود کیوں کر رقم ⁂ زباں میں نہ طاقت نہ تابِ قلم
عجب قدرتیں اُس کی ہیں بے شمار ⁂ وہی جانتا ہے جو ہے ہوشیار
گدا کو کرے شاہ، شہہ کو گدا ⁂ کسی کو نہ یارا ہے چون و چرا

قصہ کی ابتدا یوں ہوئی ہے :-

پلا ساقیا ارغوانی شراب ⁂ کہ دل سے مرے دور ہو پیچ و تاب
تھا اک شہر دھارا نگر دل پسند ⁂ کہ راجہ تھا واں کا سری گوپی چند
عدالت سخاوت میں مشہور تھا ⁂ پدر اس کے پایہ میں بھی اک نور تھا

یہ راجہ، جوگی بننے کے بعد، اپنی بہن کے یہاں اسی حال میں گیا۔ بہن نے فوراً پہچان لیا۔ اُس نے بہت روکا مگر گوپی چند نہ رکا :-

جو دیکھا کہ بھائی نہیں ٹھیرتا ⁂ ہوئی پھر تو ناچار اور یہ کہا
تمہیں کیا کسی کی محبت پڑی ⁂ یہی خاصیت ہے رہِ جوگ کی
منگائی وہ بھوجن کھلانے اُسے ⁂ مرخّص کیا بھائی کو، بہن نے

خاتمہ یوں ہوا ہے :-

ہوا قصۂ گوپی چند اب تمام ⁂ الٰہی ہو مقبول ہر خاص و عام

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مدہوش نے خود قطعہ تاریخ کہا ہے اور عبداللہ خاں رسا کی بھی کہی ہوئی ایک تاریخ درج ہے۔

دوسری مثنوی "غمزۂ دلربا" ہے جس میں جوگی ناسں کیتو کا مشہور عوام قصہ نظم ہوا ہے۔ یہ مثنوی بھی کئی بار چھپی تھی، حالانکہ لمبی مثنوی ہے۔ یہ قصہ ہندی سے لیا گیا ہے جسے چرن داس نے سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ اس مثنوی کا دوسرا نام کافی لمبا ہے۔ یعنی "سیر سری ناسکیت اردو منظوم"۔

تیسری مثنوی "طوطا و مینا" ہے، جس میں بھی ان دونوں پرندوں نے دنیا سے جی ہٹا کے آخرت کی طرف توجہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

مشتاق - گلاب سنگھ

صاحب "اردو مثنویاں" نے بلوم ہارٹ کے حوالے سے بتایا ہے کہ مشتاق نے ایک مثنوی "تحفۂ مشتاق" کے نام سے لکھی تھی جس میں بنگال کا مقبولِ عوام قصہ نظم ہوا تھا۔ چھوٹی سی مثنوی تھی جو ١٨٨١ء / ١٢٩٨ھ میں دلی سے شائع بھی ہو گئی تھی۔

معجز - پنڈت دینا ناتھ

معجز لکھنوی نے ایک مثنوی "تعلیماتِ کرشن" کے نام سے لکھی تھی جس کا نمونہ یہ ہے ؎

حسبِ نیت سب کو میں دیتا ہوں عملوں کا ثمر
ساری دنیا کر رہی ہے میری منزل کا سفر

منشی - لالہ جسونت رائے

لالہ جسونت رائے منشی، نواب کرناٹک (سنہ ١٧١١ء / ١١٢٢ھ تا ١٧٣٢ء / ١١٤٤ھ) کے دربار

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ منشی، فارسی زبان کے شاعر تھے مگر انھوں نے اردو میں ایک مثنوی "گلدستۂ عشق" کے نام سے لکھی تھی جس میں گوپی چند والے قصہ کو نظم کیا تھا، ہرچند کہ یہ دور، اردو کا ابتدائی دور تھا مگر اس مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بھی یہ زبان ہر طرح کے جذبات و خیالات کے اظہار کی متحمل ہوتی تھی۔ اگر رام راؤ کی مثنوی کا علم نہ ہو جاتا تو منشی کی یہ مثنوی ہندو شاعر کی پہلی مثنوی قرار پاتی۔ نمونہ یہ ہے:-

کتا ہوں، اتا وصف ممدوح کی۔ کہ ہے تس منی خاصیت نوح کی

جو تک اوس کی بخشش کا برسے اچھال۔ کرے دھرتے کوں! بحر و کاں کی مثال

نہیں کوئی شجاعت، منی اوس کا جوت۔ کرے فتح پل میں گراں ملک و کوت

سخاوت منی اے فروغِ زباں۔ چہ ہوا توں جو دیگر غنی زر فشاں

بلاغت میں ہیں اوس سری کا دگر۔ اچھی تو اگر تو وہی ہے مگر

کون جانے۔ منشی کے سے ابھی کتنے ہندو مثنوی نگار پردۂ خفا میں روپوش ہیں۔

منشی ۔ مول چند لال

منشی، دلّی کے ایک معزز کائستھ خاندان کے ممتاز، صاحبِ علم اور مشہور شخص تھے۔ شاہ نصیر (وفات ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء) کے شاگرد تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ منشی کا سالِ وفات بھی یہی ہے۔ یعنی استاد اور شاگرد، جو مسلمان اور ہندو تھے، ایک ہی سال اللہ کو پیارے ہوئے۔

منشی ایک قابل اور زبان آور شاعر تھے۔ زبان پر قدرت حاصل تھی۔ طبیعت میں جوش اور ولولہ رکھتے تھے۔ لہذا انھوں نے تین مثنویاں لکھ ڈالی تھیں جو یہ ہیں:-

(۱) قصۂ خسروانِ عجم۔ تصنیف ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء ۔ مطبوعہ

(۲) سام نامہ " ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء } غیر مطبوعہ

(۳) ہیر رانجھا " ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء } غیر مطبوعہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

آئیے! ہم لوگ الٹا چلیں۔

(۱)

مثنوی "ہیر و رانجھا" زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس مثنوی کے دو نسخوں کا ذکر، جو رامپور اور علی گڑھ میں ہے، ڈاکٹر نارنگ نے اپنی موقر کتاب "اردو مثنویاں" میں کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسٹیٹ لائبریری رامپور کا مخطوطہ ابتدا سے ناقص ہے۔ اور آزاد لائبریری علی گڑھ کا نسخہ اول و آخر دونوں سے نہ صرف ناقص، بلکہ نہایت بے ترتیب بھی ہے۔ اس مثنوی کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے ہی سنئے:۔

"مثنوی کا آغاز، مناجات بدرگاہ مجیب الدعوات" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند اشعار "نعت جناب رسالت پناہ محمدؐ رسول اللہ" میں ہیں۔ اس زمانے کے مخلوط تہذیبی اور ادبی ماحول کے پیشِ نظر، ایک ہندو مصنف کا، نعتِ رسول لکھنا باعثِ حیرت نہیں۔ نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

تمنائے دل ہے یہ صبح و مسا ۔۔ کہ اس آستانہ پہ ہوں جبہ سا
کہ ہے خاک کو جس کی، جوں مہر تاب ۔۔ نہیں اس سے روکش بلند آفتاب
سر سروراں، سید المرسلیں ۔۔ درخشندہ خورشیدِ ایمان و دیں
محمدؐ کہ ہے ختمِ پیغمبراں ۔۔ جناب اُس کی ہے قبلہ گاہِ جہاں
محمدؐ، نہیں کوئی جس کا عدیل ۔۔ جناب اُس کی ہے مہبطِ جبرئیل

یہاں پر میرا اپنی طرف سے اس اضافہ کا جی چاہتا ہے کہ ایک دور وہ تھا، جب نہ "قومی یکجہتی" کی کوئی تحریک چلائی گئی تھی اور نہ ہی "مذہبی ہم آہنگی" کی کوئی مہم جاری تھی، کہ ہندو حضرت پیغمبرِ اسلام کے مداح و مرتبہ شناس تھے اور ایک پیغمبر کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے اور ایک زمانہ یہ ہے کہ ساری تحریک و تبلیغ کے بعد بھی، سرپھروں کی جانب سے پیغمبرِ اسلام پر کیچڑ اچھالی جاتی ہے۔ بہرکیف! ڈاکٹر نارنگ نے لکھا ہے:۔

"اس کے بعد اکبر شاہ ثانی اور ممتاز محل بیگم کی مدح ہے جس میں غلو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نے صراحت کر دی ہے کہ اُس نے یہ قصہ خود ممتاز محل بیگم کی فرمائش پر نظم کیا ہے۔ قصّے کا آغاز ہندوستان کی تعریف سے ہوتا ہے: ؎

تماشا ہے اقلیم ہندوستان ٭ بہ خوبی و لطف، انتخابِ جہاں
سراپا لطافت، کسر اپا بہار ٭ بہارِ چمن جس پہ ہووے نثار
عجب سرزمیں ہے مسرت فزا ٭ نہایت ہے دلچسپ اور دل کشا
جسے دیکھیے سو، طرحدار ہے ٭ پری چہرہ ہے، ماہ رخسار ہے

منشی اور سندر لال آرام کے فارسی قصہ میں گہری مماثلت ہے۔ غالباً منشی کے پیش نظر آرام کا قصہ رہا ہوگا، گو اس سلسلے میں منشی نے کوئی صراحت نہیں کی، لیکن قصّے کے انجام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔"

(۲)

مثنوی "سام نامہ" کے بارے میں، ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تحقیقی کتاب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" میں لکھا ہے کہ اس مثنوی کے دو مخطوطے رامپور اور علیگڑھ میں موجود ہیں۔ یہ مثنوی تقریباً تین ہزار اشعار کی حامل ہے۔ پتہ نہیں منشی کس دل گردہ اور دماغ و قلم کے انسان تھے کہ ایسی ایسی طویل مثنویاں اور وہ بھی پوری صلاحیت شعری کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کا نمونہ یہ پیش کیا ہے: ؎

صفیرِ عنادل، گلِ بوستاں ٭ پری اک مکن گنہیں تھی وہاں
اتر اسپ سے، یہ جوانمرد سام ٭ گیا سوئے بستاں، بہ شوقِ تمام
یلِ نامور باغ میں جب گیا ٭ پری نے زمیں بوسی حاصل کیا

(۳)

فردوسی طوسی (وفات ۴۱۱ھ / ۱۰۲۱ء) کا "شاہنامہ" فارسی زبان، فارسی ادب، فارسی اشعار اور فارسی جذبات کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں اس کو منتقل کرنے کی نہ پہلے کسی نے کوشش کی تھی، اور نہ پھر منشی کے بعد کسی اور نے اب تک ہمت کی ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کہا جاتا ہے کہ شاہ عالم آفتاب نے، پنڈت جواہر ناتھ ساقی کو آمادہ کیا تھا کہ وہ فردوسی کے شاہنامہ کو اردو میں منتقل کریں۔ مگر یہ کام ان سے انجام نہ پاسکا۔ آخر منشی نے یہ خدمت انجام دی۔

منشی نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ "قصۂ خسروانِ عجم" میں اصل کی خوبیاں منتقل کی جائیں اور شاعرانہ حیثیت سے اُن کی کاوش کامل العیار ہو۔ چنانچہ بڑی حد تک اُن کی کوششیں مشکور ہوتی ہیں۔ تاہم فردوسی، فردوسی ہی ہے۔ اور شاہنامہ، شاہنامہ ہی ہے۔ دوسری خرابی یہ ہوتی کہ جیساکہ منشی نے "سببِ تالیف" میں خود بیان کیا ہے، انھوں نے اصل شاہنامۂ فردوسی کو اپنے سامنے نہیں رکھا بلکہ انھوں نے اُس نثری ترجمہ کو سامنے رکھا تھا جو ۱۱۶۲ھ/۱۷۵۲ء میں توکل منشی نے "شاہنامہ شمشیر خوانی" کے نام سے بطور خلاصہ لکھا تھا۔ اور جس کی ابتدا کیومرث اور دیوسار کی جنگ کی داستان سے ہوتی ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پتہ نہیں، ایسی مماثلت کہیں کہیں، کیسے نظر آتی ہے:؎

زدی بانگ بر من چو جنگ آوراں ✤ نہ ترسی تو از دادرِ داوراں (فردوسی)

دلیکن بروزِ جزا بے گماں ✤ کرے داوری، داورِ داوراں (منشی)

بہرکیف! نمونہ کے لئے رستم کی طفلی کا بیان ملاحظہ ہو:؎

وہ رستم، کہ تھا کودکِ بے نظیر ✤ اُسے ہفت دایہ کا ملتا تھا شیر

کبھی رہتی باقی جو کچھ اشتہا ✤ تو شیر اُس کو دیتے بزرگاؤ کا

طعام اُس کو آنے لگا دل پسند ✤ تو پھر پانچ آنے لگیں گوسفند

وہ کھاجاتا تھا گوشت اُن کا تمام ✤ تعجب میں تھے، مردم خاص و عام

سہ سالہ ہوا جبکہ وہ شیر خوار ✤ بخوبی ہوا اسپ پر وہ سوار

لیا ہاتھ میں اپنے گرزِ پدر ✤ رہے لوگ حیراں، اُسے دیکھ کر

کہ اس طرح کودک ہے یہ زورمند ✤ نہ دیکھا کہیں زیرِ چرخِ بلند

یورپ میں محققین میکنزی اور بے گی نے کہا ہے کہ "شاہنامۂ فردوسی" کا مواد، چینی زبان کی ایک مثنوی یا شاہنامہ "ننگ شین ان" سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ وہاں بھی ایک ایسے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہی عجب و غریب پہلوان کا ذکر ہے جیسا شاہنامۂ فردوسی میں رستم کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس بیان سے لوگ شبہہ کرتے ہیں کہ واقعی رستم نام کا کوئی پہلوان ایران میں کبھی تھا ہی نہیں اور یہ اک فرضی کردار ہے۔

در حقیقت یہ بات نہیں ہے کہ یہ رستم محض ایک فرضی کردار ہے۔ بلکہ رستم نام کا ایک فوجی جنرل ایران میں، واقعی تھا، جو مافوق الفطرت نہیں البتہ نامور ضرور تھا۔ خود فردوسی نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے:

منش کردہ ام رستم پہلواں ∴ وگرنہ یلے بود، در سیستاں[1]

یعنی حقیقتاً "رستم" سیستان کا ایک فوجی جنرل تھا مگر ہم نے اُس کو یہ مرتبہ دے دیا ہے کہ اسے قدیم ایران کا مافوق الفطرت ہیرو بنا دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ فردوسی نے ایسا کیوں کیا؟ سو اس کی وجہ وہ عصبیت ہے جو ہمیشہ سے ایرانیوں کو عربوں کے ساتھ رہی ہے۔

کیانی حکومت ایران میں ہزاروں برس سے قائم تھی۔ اور رومن امپائر کے مرتبے کی تھی۔ جب عرب میں "اسلام" آیا اور "قرآن" کی تعلیمات نے عربوں میں عملی جوش بھر دیا تو اُن کی فتوحات شروع ہوئیں۔ اور اُن کی ٹکر رومن امپائر اور کیانی حکومت دونوں سے ہوئی۔ رومن امپائر تو سمٹ سمٹا کے مغرب کے ایک حصہ میں محدود ہو گئی۔ اُس نے مشرق کا مقبوضہ وسیع علاقہ البتہ کھو دیا مگر فنا نہ ہوئی۔ البتہ کیانی حکومت کا نام و نشان تک مٹ گیا اور سارا ایران، عربوں کے قبضہ و تصرف میں آگیا۔

ایرانیوں کے نزدیک عرب، ایک وحشی اور گنوار، غیر مہذب و ذلیل قوم کی حیثیت میں تھے اور کوئی مرتبہ نہ رکھتے تھے۔ اب جو عرب، اُن کے سارے ملک پر قابض ہو گئے تو یہ حادثہ اُن کے لئے صدمۂ عظیم کا سبب بن گیا۔ اور اس احساسِ برتری و کمتری کے تعصب نے، ایرانیوں کی، عربوں کے ساتھ نفرت و عداوت کو بہت بڑھا دیا۔ اور

---

[1] (ترجمہ) "رستم کو ایسا عجوبہ پہلوان میں نے بنا دیا ہے، ورنہ وہ سیستان کا ایک معمولی فوجی افسر تھا۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہمیشہ اہلِ ایران مختلف انداز سے اس امر کی کوشش کرتے رہے کہ وہ عربوں کے پنجہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ عربوں اور ان کے اسلام، کے خلاف جتنی بھی سیاسی یا مذہبی تحریکوں نے جنم لیا، اُن کا مرکز ہمیشہ ایران رہا۔ تاہم اُن کی گلو خلاصی کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ تا آنکہ فردوسی کا دور آگیا۔ اُس وقت تک، ایرانیوں پر عربوں کے تسلّط کی تاریخ پرانی ہو چکی تھی اور ساڑھے تین سو برس گزر چکے تھے، مگر جذبہ نفرت و عداوت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ فردوسی چاہتا تھا کہ ایرانیوں کے گزشتہ دور کو اُن کے سامنے لاکر، اُن کے خون میں حرارت لائے اس لئے اُس نے "شاہنامہ" لکھ ڈالا۔ اُس نے ایرانیوں کو جتنا کچھ اُبھارا وہ تو اُبھارا ہی، خود ایسے جوش میں آگیا کہ غصّہ میں اس نے یہ کہہ کر آسمان پر تھوک دیا کہ: ؎

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار ؞ عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو ؞ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

بھلا آسمان کی کج رفتاری کی کوئی حد ہے کہ یہ گوہ کھانے والے اور اونٹنی کا دودھ پینے والے گنوار عرب، تختِ کیانی پر قابض ہو جائیں؟ اے آسمان تجھ پر تف ہے۔ پھر عجیب تر بات یہ ہوئی کہ اُس نے تاریخ کی یہ حقیقت جانی کہ ایران کا نامور پہلوان رستم، ایک معمولی عرب سپاہی کے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا تو اُس کا پارہ اور بھی بڑھ گیا۔

$\frac{14}{635}$ھ میں جو عظیم ایرانی لشکر، عربوں کے مقابلہ کے لئے آیا تھا اُس فوج کا سپہ سالار رستم تھا۔ اسفندیار جس کو فردوسی نے شہنشاہِ ایران ظاہر کیا ہے، دراصل رستم کا بھائی تھا۔ جو بعد میں معرکۂ آذربائجان کے موقع پر $\frac{22}{643}$ھ میں گرفتار ہوا تھا۔ رستم جس اسلامی لشکر کے مقابلہ کے لئے آیا تھا، اُس کے سپہ سالارِ اعظم حضرت سعد بن وقاص تھے۔ خود فردوسی نے ذکر کیا ہے کہ: ؎

بیامد خروشے بہ کردارِ رعد ؞ زیک سو رستم، زیک سوئے سعد

مگر ایرانیوں کا ستارہ گردش میں تھا۔ ان کی عظیم فوج، سعد کے مقابلہ میں شکست کھا گئی اور رستم، ایک معمولی سپاہی ہلال نامی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ فردوسی کو یہ تاریخ گوارا نہ تھی۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لہٰذا اس نے قدیم عہد میں ایک دوسرا رستم پیدا کرکے اُسے فاتحِ عالم بنا دیا تاکہ ایرانیوں کے دل سے شکست خوردہ مقتول رستم فراموش ہو جائے اور مافوق الفطرت قدیم رستم ایرانیوں کا حوصلہ بڑھائے۔

کہا جاتا ہے کہ فردوسی نے، سلطان محمود کے حکم سے اور فی شعر ایک اشرفی کے صلہ کی امید میں، یہ شاہنامہ لکھا تھا۔ میں اسے باور نہیں کرتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ خود فردوسی نے محمود کو ایسا کوئی شاہنامہ اس سے لکھوانے پر اشتعال دلایا ہو، تاکہ وہ اس فرض کو اُس کے سپرد کر دے اور اُسے شاہی عظیم لائبریری سے استفادہ کرنے کا موقع ملے۔ کیونکہ فردوسی کے شعروں میں جو زمزمہ و خروش اور ولولہ و جوش پایا جاتا ہے وہ "حکمی" نہیں "جبلی" معلوم ہوتا ہے۔ اتنے زور اور طنطنہ کے ساتھ محض انعام کا لالچ، فردوسی سے "شاہنامۂ ایران" نہیں لکھوا سکتا تھا۔

منشی غریب کو تو نہ تو کوئی محمود ملا تھا اور نہ کوئی لائبریری ملی تھی اور نہ کسی صلہ کی اُمید تھی، تاہم اُس نے اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔ شہنشاہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ، رستم کے بیٹے بیژن کی تلاش میں، رستم کے دربار میں آتی ہے۔ رستم سے گفتگو کے دوران وہ اپنے کو متعارف کراتی ہے۔ فردوسی نے کہا ہے: ؎

بہ رستم نگہ کرد و بگریست زار ٭ ز خواری بہ بارید خوں در کنار
بدو گفت کاے ہتر پُر خرد ٭ ز تو سر گفتن نہ اندر خورد
سخن گر نہ گوئی نہ دانم زبیش ٭ کہ من خود دلے دارم از درد ریش
چنیں باشد آئینِ ایراں مگر ٭ کہ درویش را کس نہ گیرد خبر
زدی بانگ بر من چو جنگ آوراں ٭ نہ ترسی تو از داورِ داوراں
منیژہ منم دختِ افراسیاب ٭ برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب
براے یکے بیژنِ شور بخت ٭ فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

منشی نے لکھا ہے: ؎

لگی کہنے یوں کھینچ کر ایک آہ ٭ کہ بیچارگی پر مری، کر نگاہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نہیں چاہیئے سرد مہری تجھے ٭ نہ کر دُور، ٹک رو بروسے مجھے
کہ بیچارہ ہوں اور ستم دیدہ ہوں ٭ پریشان و دل ریش و رنجیدہ ہوں
یہ آئینِ ایراں سے ہے دور تر ٭ کہ بیچارگاں کی نہ پوچھیں خبر
ولیکن بروزِ جزا بے گماں ٭ کرے داوری داورِ داوراں
منیژہ میں ہوں دخترِ افراسیاب ٭ کیا گردشِ آسماں نے خراب
محبت میں بیژن کی، اسے نامور ٭ پڑی تاج اور تخت سے دُور تر
پھروں ہوں میں ہر در، بحالِ تباہ ٭ لکھا تھا قضا نے یہی سر پہ آہ

فردوسی اور منشی کا مقابلہ کوئی معنی نہیں رکھتا، مگر اس میں بھی کلام نہیں ہے کہ منشی کا شاہنامہ اپنی جگہ پر قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ رستم و سہراب (باپ بیٹے) کی جنگ کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ میکنزی نے شاہنامہ چینی سے بجنسہٖ ایسا ایک قصہ نقل کرکے دکھایا ہے کہ فردوسی نے یہ چیز وہیں سے لی ہے۔ تاہم منشی سے بھی یہ روداد سنئے:۔

بہم خوب زور آزمائی ہوئی ٭ نہ سہراب کو پھر رہائی ہوئی
پکڑ کر کمر بند سہراب کا ٭ زمیں سے لیا، پیلتن نے اٹھا
پٹک کر زمیں پر اسے پھرتیں ٭ سرِ سینہ بیٹھا وہ از روے کیں
یہ سوچا کہ یہ گرد زور آزما ٭ جو پھر اٹھ کھڑا ہو، تعجب ہے کیا
غرض کھینچ کر خنجرِ آبدار ٭ کیا سینہ و دل کو اُس کے فگار
وہ خستہ جگر کھینچ کر ایک آہ ٭ یہ بولا کہ تھے بخت میرے سیاہ
یہاں جو میں آیا تو یہ تھی مراد ٭ کہ دیدار سے باپ کے ہوں میں شاد
تمنّائے دل کچھ نہ حاصل ہوئی ٭ بہ ملکِ عدم، جان واصل ہوئی
کہا نام کیا؟ اُس نے تب یوں کہا ٭ کہ ہے نام رستم مرے باپ کا
جو اُس خستہ تن سے سنا یہ سخن ٭ تو غمگیں ہوا رستمِ پیلتن
پڑا ہو کے بیہوش بس خاک پر ٭ جب آیا ذرا ہوش تب نالہ کر
لگا کہنے اُس سے کہ کر یہ بیاں ٭ مرے پاس رستم کا کیا ہے نشاں؟

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کہ میں ہی ہوں بخت رستم ہوں آہ ∴ جہاں جس کی آنکھوں میں ہووے سیاہ
یہ سہراب نے سن کے پاسخ دیا ∴ کہ صد حیف اسے گردش کشتا
بہت گرم الفت مرا دل ہوا ∴ وہے تو ادھر کچھ نہ مائل ہوا
نشانی تو دیکھ اب زرہ کھول ∴ کہ مہرہ ہے بازو پہ میرے بندھا
وہ مہرہ جو دیکھا زرہ کھول ∴ تو رستم نے پھر شور و نالہ کیا
یہ بولا کہ اے جانِ من بیگناہ ∴ تو کشتہ ہوا ہاتھ سے میرے آہ
پسر کو کسی نے بھی مارا نہیں ∴ نہیں یہ ہوا جور ہرگز کہیں

مادہٗ تاریخ خود شاعر نے نکالا ہے جس میں "قصہٗ خسروانِ عجم" سے ۱۲۲۵ھ برآمد ہوتا ہے:-

مرتب یہ شہنامہ جب ہو چکا ∴ کیا فکر تب سال و تاریخ کا
تو پھر ہاتفِ غیب نے صبحدم ∴ کہا "قصہٗ خسروانِ عجم"

منوّر۔ منشی بشیشور پرشاد

منوّر، لکھنؤ کے ایک مشہور و معروف صاحبِ علم و فضل اور شیدائے شعر و سخن خاندان کے نامور فرد ہیں۔ میں نے فرزند کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ میر انیس نے اپنے مفلوج اور دائم المرض چھوٹے بیٹے میر عسکری رئیس کی طرف سے ایک مرثیہ لکھ دیا تھا تاکہ اس کا نام زندہ رہے۔ اس مرثیہ میں انھوں نے اپنے اس بیٹے کی زبان سے کہلوایا تھا کہ

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں ∴ پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

چونکہ عام لوگوں کو یہی علم تھا کہ یہ مرثیہ خود میر انیس کا ہے، اس لئے لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے کیونکہ اُن تک صرف چار پشت ہوتی ہے۔ لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ بیشک یہ مرثیہ میر انیس ہی کا کہا ہوا ہے مگر اس کو انھوں نے اپنے بیٹے میر عسکری رئیس کی طرف سے کہا ہے۔ اور اُن کو پانچ پشت ہو جاتی ہے:۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میر غلام حسین، ضاحک
|
میر غلام حسن، حسن
|
میر مستحسن - خلیق
|
میر ببر علی - انیس
|
میر عسکری - رئیس

لیکن اسی لکھنؤ سے، منور نے خود اپنی زبان اور اپنے قلم سے دعویٰ کیا تھا کہ :-

شاعری سے نہ منور کو ہو کیونکر رغبت ۔۔ پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

اور اُن کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے :- منشی اودے راج - مطلع
|
منشی الیشری پرساد - شاعی
|
منشی پورن چند - ذرہ
|
منشی دوار کا پرشاد - افق
|
منشی بشیشور پرشاد - منور

منور کی پیدائش ۸ رجولائی ۱۸۹۷ء / ۱۳۱۴ھ کو ہوئی - ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۴ھ میں میٹرک پاس کیا ۱۹۱۵ء / ۱۳۳۳ھ میں نوبت رائے نظر لکھنوی کے شاگرد ہوئے ۔ پہلے آفاق تخلص اختیار کیا تھا کیونکہ ان کے والد کا تخلص افق تھا - اور افق کی جمع آفاق ہے - بعد میں منور کر دیا - منور کے چھوٹے بھائی بشی پرشاد مقدر تھے اس لئے انھوں نے منور پسند کیا - منور کے والد منشی افق لکھنوی مشہور و معروف شاعر ہوئے - ان کا انتقال ۱۹۱۳ء / ۱۳۳۱ھ میں ہوا - منور کے سسر منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی بھی مشہور شاعر تھے جو ۱۹۲۳ء / ۱۳۳۹ھ میں انتقال کر گئے - منور کے استاد منشی نوبت رائے نظر لکھنوی بھی مشہور اہلِ قلم تھے جن کا انتقال ۱۹۱۵ء / ۱۳۳۳ھ میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہوا تھا، چنانچہ منور نے اسی لحاظ سے اپنی شہرت و عظمت کو اپنے والد اور استاد دونوں کا فیض گردانا ہے :-

منور خوں رگوں میں ہے اُفق سے کاملِ فن کا

ہدایت میں ہوں میں نازاں، نظر سے کاملِ فن پر

منور نہایت ہونہار شاعر تھے اور جوانی ہی میں ۔۔۔ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

منور نہایت روشن خیال، بلند نظر اور وسیع مشرب انسان تھے۔ انھوں نے قرآن حکیم کی کئی سورتوں کو بھی نظم کیا تھا۔ کچھ حصے زبور و انجیل کے بھی نظم کئے گئے تھے۔ انگریزی اور بنگالی ادب کے بھی متعدد جواہر پاروں کو انھوں نے نظم کا خوبصورت جامہ پہنایا تھا جن میں سے بعض کی وقتاً فوقتاً اشاعت بھی ہوتی رہی ہے۔ بھلا جس نے تیرہ[۱۳] برس کی عمر سے شاعری کی ہو اور اُستاد، قدر اور نظر سب سے فیض حاصل کیا ہو، انگریزی، اردو، ہندی، فارسی، عربی اور بنگلہ زبانوں میں دستگاہ رکھتا ہو، وہ جتنا بھی جامع اور باکمال نہ ہو، کم ہے۔ ٹھیک کہا تھا انھوں نے کہ :-

کوئی کیا راز سمجھے اس طلسمی کارخانے کا، مری ہستی ہی مضمر ایک دنیائے معانی ہے

منور کے نزدیک ان کے عہد کے سب سے بڑے شاعر سر اقبال تھے۔ اور جوش ملیح آبادی کو تو وہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا اردو شاعر کہتے تھے۔

منور نے گیتا کا جو ترجمہ بہ شکل مثنوی کیا ہے، اس کا ذکر دوسرے حصۂ کتاب میں کیا گیا ہے۔ یہاں اُن کی دوسری مثنوی "کمار سنبھو" کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے جس نے پہلی مرتبہ منور کے ہاتھوں اردو کا جامہ پہنا ہے۔

قصّہ یہ ہے کہ دیوتاؤں کا راجہ اندر، تارکا سُر[۱] سے شکست کھا جاتا ہے۔ مگر وہ اس ہار پر مطمئن بیٹھ نہیں جاتا، بلکہ چاہتا ہے کہ اُس کی طاقت پھر دوبارہ بحال

---

[۱] "دیو" کے مقابل راکشش کو "اسُر" کہا جاتا ہے۔ "تارک" اُس راکشش کا نام تھا۔ "دیو" کا مطلب وہ غیر انسانی عظیم مخلوق نہیں جو قصہ کہانیوں میں بیان ہوتی ہے بلکہ اس کا مطلب "دیوتا" ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہو جائے۔ اس لئے وہ برہما سے رجوع کرتا ہے، وہ شیو جی سے رجوع کرنے کہتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اگر وہ شادی کرلیں تو اُن کی اولاد ہی تارکاسُر کو ہلاک کر سکتی ہے۔ چنانچہ اندر، کام دیو کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ شیو جی، پاربتی جی سے شادی کرتے ہیں جن سے سوامی کارتک، پیدا ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں تارکاسُر مارا جاتا ہے اور راجہ اندر کا اقتدار دوبارہ بحال ہو جاتا ہے۔

اصل کتاب "کمارسنبھو" اٹھارہ ابواب پر منقسم ہے، جن میں سے نو ابواب کے بارے میں، نقادوں کا کہنا ہے کہ وہ الحاقی ہیں۔ یعنی کالیداس کا نتیجۂ فکر نہیں۔ باقی نو ابواب میں سے دو باب میں "جنسی زندگی اس تفصیل سے بیان کی گئی ہے کہ خود سنسکرت زبان کے ماہر اور کالیداس کے مدّاح بھی، اس حصے کو فحاشی کا نمونہ قرار دیتے ہیں"۔ اس لئے منور نے صرف سات ابواب کا ترجمہ کیا ہے جو شیو جی اور پاربتی جی کی شادی کے قصہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ابتداء یوں ہوئی ہے :-

مایۂ ناز و سرفراز ہمالہ پربت ⁂ سب پہاڑوں سے ہے ممتاز ہمالہ پربت
اس کے دامن کا ہے یہ عرض کہ پھیلائے شمال ⁂ اک عجب شان سے ہے انجمن آرائے شمال
کسی پربت کا نہیں ہے جو وقار اس کا ہے ⁂ دیوتاؤں میں ہمیشہ سے شمار اس کا ہے
اُس کے مشرق میں بھی متواج ہے بحرِ ذخار ⁂ اُس کے مغرب میں بھی ہے اک یم دلکش کی بہار
اِن محیطوں کے لئے ایک ہی مرکز ہے ⁂ دونوں اطراف کے مابین زمیں کا گز ہے

آپ اس زمزمہ و طنطنہ اور شان و شکوہ سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ پوری مثنوی کس قدر رنگین اور زرنگار ہوگی۔ اختتام ان اشعار پر ہوا ہے :-

ابھی آئی تھیں اُماں، بیاہ کے تازہ تازہ ⁂ رونما پھول سے گالوں پہ تھا غازہ غازہ
شوہرِ خلوت میں بصد شوق جو اُلٹا گھونگھٹ ⁂ جھٹ سے منہ پھیرکے گوری نے سنبھالا گھونگھٹ
وارِ شوخی کا، بصد شرم و حیا سہہ نہ سکیں ⁂ ایسی گھبرائیں، خواصوں سے بھی کچھ کہہ نہ سکیں
آنکھوں آنکھوں ہی میں گُنوں کا جو اشارہ کرتے ⁂ وہ بھی تفریح کا سامان مہیّا کرتے
سب یہ حضرت کی شرارت ہے سمجھ لیتی تھیں ⁂ اور گُنی منہ جو بناتے تھے تو ہنس دیتی تھیں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

منورؔ نے کتاب کی ابتدا سے پہلے تاکید کی ہے کہ: ؎

ارباب ادب کو ہر دو عالم کی قسم ÷ سوگند موخر کی، مقدم کی قسم
سمجھیں پڑھ کر کمار سنبھو کا وقار ÷ شو پاربتی کے عشق باہم کی قسم

یہ کتاب شائع ہوگئی ہے۔ جان پہچان شاعر کی حضرت بالمکند پرساد عرشؔ ملسیانی نے کرائی ہے۔

مہجورؔ - لال سنگھ

صاحبِ "اردو مثنویاں" نے "سسّی پنوں" کے سلسلہ میں یہ حوالہ "مقدمہ سسّی پنوں ہاشم" (پنجابی) بتایا ہے کہ لال سنگھ نے، جو کسی زمانہ میں ریزیڈنٹ کشمیر کے میر منشی تھے، اس قصہ کو "نالۂ مہجور" کے نام سے مثنوی کی شکل میں نظم کیا تھا۔ کوئی نمونہ نہیں مل سکا۔

مہرؔ - درگا پرشاد

صاحب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" نے فرمایا ہے کہ مہرؔ نے، جو تعلقدار تھے، ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء میں "مہرِ تاباں" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی تھی جو ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں شائع ہوگئی تھی۔ کافی لمبی مثنوی ہے اور قصہ کا انداز قدیمی ہے۔ نمونہ یہ ہے: ؎

دن تو عیش و طرب میں کٹ جاتا ÷ رات کو جب پلنگ پر آتا
لوٹتا مثل ماہیِ بے آب ÷ تا درِ چشم بھی نہ آتا خواب
دل میں آتے تھے سیکڑوں وسواس ÷ گرد ہر دم حصار لشکرِ یاس
کبھی کہتا تھا بھر کے سرد اک آہ ÷ کیا کروں فکر اے مرے اللہ!

مہرؔ، فاضل شخص اور کہنہ مشق شاعر ہی نہیں بلکہ نہایت قادر الکلام ناظم بھی معلوم ہوتے ہیں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مہر - نرائن پرشاد ورما

مہر کے بارے میں صاحبِ "ہندو شعرا" نے لکھا ہے کہ مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ریاست گوالیار میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ نہایت خلیق و بامروت اور مذاق صحیح رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی لکھی تھی جو شائع ہو چکی ہے۔ اُن کا دیوان بھی چھپ چکا ہے۔ مگر "مثنوی مہر" کا کوئی نمونہ مل نہ سکا۔

میکش - جانکی پرشاد

میکش، قصبۂ جائس ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ چودھری رائے مل ناتھ صاحب، اکبر کے عہد میں قنوج سے جائس آئے۔ بادشاہ کی طرف سے ۸۴ مواضعات اور "رائے چودھری" کا خطاب عطا ہوئے۔ میکش کے والد منشی برج لال فارسی کے ادیب تھے۔ صاحبِ "ہندو شعرا" نے لکھا ہے کہ میکش نے "رامائن" کو نظم کیا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد بھی میکش کے اِس نتیجۂ فکر کا کوئی سراغ نہ مل سکا اس لئے حصہ دوم میں اس کا ذکر موجود نہیں۔ میکش نے ایک مثنوی "ایزد نامہ" بھی لکھی تھی مگر اُس کا بھی نمونہ دستیاب نہ ہو سکا۔

ناتواں - منشی منسارام

ناتواں کے والد کا نام لکھپت رائے اور دادا کا نام ہردے رام تھا۔ یہ کھتری سرہندی تھے۔ دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد بڑے غریب آدمی تھے۔ اور انھوں نے بمشکل ناتواں کو تعلیم دلائی۔ ناتواں، فارسی کے استاد کامل تھے۔ انگریزی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے بھی بخوبی واقف تھے اس لیے ڈاکخانہ میں ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ کے خلفشار سے متاثر و دل گرفتہ ہو کر گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ فارسی کی تمام کتابوں میں وہ سعدی کی بوستاں کو بے مثل کتاب ظاہر کرتے تھے۔ صاحبِ "آثار الشعرائے ہنود" نے لکھا ہے کہ انھوں نے "سنگھاسن بتیسی" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ صاحبِ "دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعرا" نے فرمایا ہے کہ انھوں نے ایک مثنوی "اسکندھ بھاگوت" کے نام سے بھی لکھی تھی۔

ناتواں کے لائق بیٹے، منشی درگا پرشاد نادر نے ناتواں کا اور کلام تو شائع کرایا مگر مثنویوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ صاحبِ "تذکرۂ شعرائے ہنود" نے "سنگھاسن بتیسی" کے یہ تین شعر نمونتاً نقل کئے ہیں:

غرض مادھوانل، اسی شہر میں :: بجاتے تھے بین آکے، اسی دہر میں
جسے سن کے بیہوش ہوتے تھے سب :: بہائم بھی مدہوش روتے تھے سب
جسے سن کے لہراتا دریا بہ خود :: بیابانِ سنسان رہتا، بہ خود

ناتھ — لالہ جگر ناتھ سنگھ

صاحبِ "اردو مثنویاں" نے "مثنویاتِ ناسخ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ناتھ نے "قصہ ست کنور" کو بطور مثنوی نظم کیا تھا جو ۱۲۱۱ فصلی کی تصنیف ہے۔ اس سے ظاہر یہ ہے کہ مثنوی ۱۸۰۱ء/۱۲۱۶ھ میں یا اس کے لگ بھگ لکھی گئی تھی۔ یہ مثنوی چار سو چالیس اشعار کی حامل تھی۔ نمونہ نہیں مل سکا۔

نادان — منشی کامتا پرشاد

نادان، لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ فارسی کا نہایت عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ انھ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نے ملا اکرم غنیمت کی مثنوی "نیرنگِ عشق" کو "بہارستانِ ناداں" کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب میں نے اپنے کرم فرما لالہ چرونجی لال سے مشورہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ :-

ہماری رائے میں آتا ہے فی الحال ۔۔ غنیمت مثنوی، اردو میں کر ڈالی
دے مضمون اردو فارسی ہو ۔۔ مذاقِ شیریں میں شکر ملی ہو

ایک وہ دور تھا کہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے رکھنے کو "شیر و شکر" یعنی "دودھ چینی" کی آمیزش تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور ایک یہ دور ہے جب اردو کو ہندی کے ساتھ رکھنے کو "دودھ اور زہر" کا ملاپ سمجھا جاتا ہے۔

لالہ چرونجی لال، جن کا ذکر ہوا ہے، ایک لنگڑے رئیس تھے لہذا اُن کے نام اور اُن کی صفت کی رعایت سے، اس مثنوی میں اُن کی بھی تعریف کی گئی ہے :-

دبیر و عاقل و داتا خبر دور ۔۔ کریم النفس یعنی نیک محضر
نثارش پستہ و خرما و بادام ۔۔ چرونجی لال نامش شکر و کام
جہاں میں گرچہ بس مشہور ہے وہ ۔۔ ہمارے وقت کا تیمور ہے وہ

"چرونجی" خود ایک میوہ ہے جو ان کا نام تھا اس لئے اُن پر پستہ، خرما اور بادام نچھاور کیا گیا ہے۔ اور چونکہ وہ لنگڑے تھے اس لئے اُن کو شہنشاہ تیمور کہا گیا ہے جو لنگڑا تھا۔ مثنوی حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے اور حسب ہدایت چرونجی لال، شیر و شکر ملی زبان میں پوری مثنوی لکھی گئی ہے۔ مہاراجہ گوالیار کی تعریف میں فرماتے ہیں :-

مقامِ ذکر والیِ زماں است ۔۔ زبانِ مدحتِ نوشیرواں است
یہ وہ در گہ ہے اے خاطر شکستہ ۔۔ ادب رہتا ہے ہر دم دست بستہ
مؤدب ہو کے یکدل یک زباں ہو ۔۔ ثنا خوانِ شہِ خسرو زماں ہو

مثنوی میں شاہد و عزیز کا قصہ نظم ہوا ہے۔ عزیز کی تعریف سنئے :-

نگینِ خاتمِ الفت تھا انجام ۔۔ عزیز اُس کا ہوا نقشِ جگر نام
شباہت نورِ عینِ دلفروزی ۔۔ بلاغت آفتابِ نیم روزی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جبین روشن مہرِ چرخ بلندی ∴ سعادت حسن روئے ارجمندی

شاہد کے بارے میں فرماتے ہیں :-

وہ بیٹھا بزم میں گیا، فتنہ اُٹھا ∴ زمیں پر چرخ سے خورشید اُترا

وہ مہۂ اختر سا کیا گردش میں آیا ∴ کہ چرخِ نیلگوں نے چرخ کھایا

لٹیں چھوٹی ہوتی، بر روئے روشن ∴ یہ کہتی تھیں کہ کانوں میں چھپا من

گرے اُس مانگ سے موتی جو بارے ∴ فلک سے نیم شب اُترے ستارے

جوں شاخِ گل لگا جس دم جھکانے ∴ کمر خود تھام لی بادِ صبا نے

ایران کی لغویت ہندوستان میں آئی تو اس طرح آئی کہ فارسی کی مثنویاں اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ اور غزلوں نے اس سے بھی زیادہ پذیرائی حاصل کی نتیجتاً امرد پرستی کا ایرانی ذوق، ہندوستان میں بھی رائج ہو گیا۔ حالانکہ ہندوستان صرف عورت کا پرستار رہا کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ہندوستان کی شاعری میں محبت کے جذبات عورت کی طرف سے ظاہر کیے جاتے تھے جو نہایت لطیف پیرایۂ بیان رکھتے تھے۔ بہر کیف! چند اشعار پنجاب کی تعریف کے بھی ملاحظہ فرمائیے :-

ہر اک جا خیلِ خوبانِ ملک دم ∴ نہیں ہر کوچہ سنگلدیپ سے کم

سحر ارشکِ بیاضِ عارضِ حور ∴ شب اُس کی توتیائے چشم مخمور

خزاں نادیدہ ہر باغ و خیاباں ∴ طرب بخشِ بہارِ باغِ رضواں

حسیناں گرم جوشِ سرد مہری ∴ ہمہ دم خوش جمالوں سے دو بہری

پنجاب کا حسن تو مشہور ہی ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہاں کے صاحب جمالوں کو "سرد مہر" بھی لوگ ظاہر کرتے ہیں، شاید خشک آب و ہوا کا اثر ہو، حالانکہ پانچ پانچ دریا کا وہ مخزن ہے۔ بہر کیف! ناداں کی یہ مثنوی علمی حیثیت سے بہت گراں مایہ ہے۔ زبان ثقیل ہے۔ ثقیل زبان استعمال کرنے سے علمیت اور دبدبہ تو ضرور آجاتا ہے مگر ثقالت اتنی بھی اچھی نہیں کہ زبان ہی بدل جائے۔ پنجاب کی تعریف میں جو اشعار ہیں وہ اردو کے تو ضرور معلوم ہوتے ہیں مگر ہر شعر کا ایک دو لفظ بدل دیا جائے تو وہ اردو زبان

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کا شعر نہیں رہے گا۔ بہرکیف! اس مثنوی کا قطعہ تاریخ خود ناداں نے کہا ہے:۔

تلاشِ نام میں تھا اس کے حیراں ٭ کہا دل نے "بہارستانِ ناداں"

دلِ رنجور شد تاریخ خواں ٭ "مسیحِ اعجازِ عشقے داستانے"

پورے آخری مصرع سے ۱۲۹۶ھ کے اعداد نکلتے ہیں جو انگریزی عیسوی ۱۸۷۹ء کے مطابق ہے۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔

نسیم - پنڈت دیا شنکر کول

نسیم، کا نام دیا شنکر تھا، کشمیری پنڈت تھے۔ ان کے والد کا نام گنگا پرشاد تھا۔ لکھنؤ کے کشمیری محلہ میں رہتے تھے۔ خواجہ آتش لکھنوی کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں انتقال کیا۔ اُن کی شہرت، اُن کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کی بنیاد پر عالمگیر ہے جو لکھنوی تکلف و تصنع اور صنائع و بدائع میں اپنی مثال آپ ہے۔

دلی کے اُجڑنے کے بعد، حکومتِ اودھ کی سرپرستی نے، دلی کے سارے باکمالوں کو، لکھنؤ پہنچا دیا۔ اور دلی کی جولانیوں کا میدان لکھنؤ بن گیا۔ اردو زبان کی وہ تمام مشہور چیزیں، جن کا تعلق دلی اسکول سے ہے، بالعموم لکھنؤ کی سرزمین پر وجود میں آئیں۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ "دلی اسکول" کے مقابلے میں ایک خالص "لکھنؤ اسکول" کا تصور پیدا ہوا اور بالآخر اس تخیل نے عملی شکل اختیار کرلی اور پھر ہر دہلوی انداز کے جواب میں ایک خاص لکھنوی ادا پیدا ہوئی۔ چنانچہ ہر مشہور و محمود دہلوی نتیجۂ فکر کے مقابلے میں ایک لکھنوی حاصلِ ادب پیش ہوا۔

میر امن دہلوی نے سنہ ۱۱۹[illegible]ھ/۱۷۸[illegible]ء میں ایک نثری کتاب "باغ و بہار" المعروف بہ "چہار درویش" کے نام سے لکھی تھی۔ یہ ایک سلیس، رواں اور بے تکلف قصہ ہے اور اردو زبان کا قابلِ قدر سرمایہ تصور ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں سنہ ۱۲۴[illegible]ھ/۱۸۲[illegible]ء میں منشی درگا پرشاد سرور جہان آبادی نے ایک قصہ "فسانۂ عجائب" کے عنوان سے خاص

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لکھنوی انداز میں ترتیب دیا۔ سرور کا اصلی وطن تو اکبر آباد تھا، جہاں میر، غالب اور سیماب کا وطن تھا۔ مگر چونکہ اُن کے والد منشی پیارے لال سکسینہ، لکھنؤ آ کر رہ گئے تھے۔ اسی لئے سرور کا بھی قیام یہیں رہا۔ لہٰذا لکھنویت اُن پر بھی طاری ہو گئی اور وہ بجا طور پر اپنے کو "لکھنؤ اسکول" کا آدمی سمجھنے لگے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سرور کی تحریر ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے یہ کتاب میر امن کے جواب میں ہی لکھی تھی، فرماتے ہیں:۔

"اگر شاہجہاں آباد، کہ مسکن اہلِ زبان کبھی بیت السلطنتِ ہندوستان کا تھا، وہاں چندے، بودو باش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا۔ جیسا میر امن صاحب نے چہار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن دحصے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلّی کے روڑے ہیں۔ محاورات کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں اس سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے مفت میں نیک، بدنام ہوتا ہے۔"

چنانچہ جس طرح "باغ و بہار" سلاست و روانی اور فصاحت و بے تکلفی میں مثالی ہے، اسی طرح جواباً "فسانۂ عجائب" رعایت و تصنّع اور بناوٹ و تکلّف میں بے نظیر ہے۔ جگہ جگہ ضلع جگت کی وادیاں اور قدم قدم پہ رعایتِ لفظی کی گھاٹیاں ملیں گی۔ دونوں کو سامنے رکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ دو اسلوب، بیان یا طرزِ ادا میں کتنا عظیم فرق ہوتا ہے، حالانکہ دونوں اہلِ قلم ایک ہی ملک اور ایک ہی زبان کے ہیں۔

بالکل اسی طرح میر حسن کی "سحر البیان" اپنی فصاحت و سلاست اور روانی و شگفتگی میں بے بدل تسلیم کی جاتی ہے، لہٰذا اُس کا جواب "گلزارِ نسیم" کی صورت میں پیش کیا گیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ "لکھنؤ اسکول" کے پُر تکلف انداز کی بہترین آئینہ دار بلکہ شاہکار ہے۔ "سحر البیان" ۱۷۸۵ء / ۱۱۹۹ھ میں لکھی گئی تھی اور "گلزارِ نسیم" اس کے ۵۴ سال بعد ۱۸۳۸ء / ۱۲۵۴ھ میں وجود میں آئی۔ جس طرح "باغ و بہار" کے ۲۴ سال بعد "فسانۂ عجائب" وجود پذیر ہوا تھا۔

شاعری کو جذبات کے اظہار کا فطری ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ فطرت سیدھی سادی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے اس لئے شاعری میں تکلف و تصنّع کا حامل کلام، شعری مرتبہ تو نہیں رہتا البتہ صنعتی ماڈل بن جاتا ہے اور اسی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ انداز و اسلوب اپنا مرتبہ و مقام لوگوں کو فراموش کرا دیتا ہے۔ مگر لکھنؤ اور دلّی میں ایک طرح کے مقابلہ کی ٹھہر گئی یا ٹھہرا دی گئی، اس لئے لکھنؤ نے ایک غیر فطری اسلوب اختیار کیا جو زیادہ دن نہ چل سکا۔ جو غیر رقابت کی حالت تو یہ ہے کہ "شاعری" کا معیار تک دونوں جگہ دو ہو گیا۔ "دلّی اسکول" کے نامور شاعر غالب دہلوی نے فرمایا کہ :-

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالب، صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

تو حضرت آتش لکھنوی نے "لکھنؤ اسکول" کی نمائندگی یہ کہہ کر فرمائی کہ :-

آتش، برا نہ مانیو، سچ سچ جو پوچھیو

شاعر ہیں ہم، دروغ ہمارا کلام ہے

اب بھلا جس اسکول میں شاعری، جھوٹ کا استعارہ قرار پائے وہاں صحیح جذبات اور ان کے اسلوب ادا کا کیا سوال پیدا ہو سکتا ہے؟

نسیم کی مثنوی میں گُل بکاؤلی کا مشہور قصہ نظم ہوا ہے۔ اس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ ہندی الاصل ہے۔ کچھ لوگ اسے ایرانی النسل بتاتے ہیں۔ صاحب "اردو مثنویاں" نے خوب سمجھوتہ کیا ہے :-

"دراصل یہ ایک مخلوط قصہ ہے، جس کی تشکیل قصّے کہانیوں کی ملی جلی ہندی ایرانی روایتوں سے ہوئی ہے۔ ہندو مسلمان کے اختلاط سے ہندوستان کی لوک کتھاؤں، قصوں یا داستانوں پر جو اثرات پڑے، یہ قصہ ان کی ایک دلچسپ مثال ہے۔"

"گلزار نسیم" کے ماخذ کا مسئلہ بھی متنازعہ ہے۔ نسیم نے مثنوی میں کہا ہے کہ انھوں نے نثر سے یہ قصہ نظم کیا ہے۔ مگر ظہور احسن رامپوری نے اپنے مضمون "مثنوی گلزار نسیم کا ماخذ" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نسیم نے رفعت و ریحان کی مثنویوں کو سامنے رکھ کر اپنی مثنوی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لکھی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُن تینوں مثنویوں میں نہ صرف قصہ، بحر، نام اور مقام کی یکسانیت پائی جاتی ہے، بلکہ ان دونوں مثنویوں کے اکثر مصرعے اور اشعار لفظ بہ لفظ "گلزار نسیم" میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اگر ریحان و رفعت کی مثنویوں کے بعض اشعار "گلزار نسیم" سے مطابقت رکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ جس نسخے سے دیا شنکر نسیم نے استفادہ کیا ہو، وہی روایت ریحان اور رفعت کے بھی پیش نظر رہی ہو۔ یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایک ہی نثر کئی شاعروں کے سامنے رہے تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ ناظم کے اشعار متقدمین کے اشعار سے لڑ جائیں۔ نثری ماخذ ایک ہونے سے مختلف شعراء کے اشعار میں ویسی یگانگت نہیں پیدا ہو سکتی جیسی ظہور صاحب نے دکھائی ہے۔ مولوی عبدالحق نے محض دو شعروں کے ملتے جلتے ہونے سے شوق لکھنوی کی "بہار عشق" کو میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" سے ماخوذ کہہ دیا تھا، چہ جائیکہ ظہور صاحب نے تو متعدد قسم کی مماثلت کا اظہار کیا ہے۔

صحیح جواب یہ ہے کہ اگر "گلزار نسیم" کا ماخذ رفعت و ریحان کی مثنویاں ہیں بھی تو محض اس وجہ سے "گلزار نسیم" کا مرتبہ کم کس طرح ہو سکتا ہے؟ یا گلزار نسیم پر کیا حرف آ سکتا ہے؟ میر کی مثنوی "دریائے عشق" کو سامنے رکھ کر مصحفی نے "بحر المحبت" لکھی تھی۔ مومن کی مثنویوں کو سامنے رکھ کر شوق لکھنوی نے مثنویاں لکھی تھیں۔ شوق لکھنوی کی "بہار عشق" کو سامنے رکھ کر رعنا لکھنوی نے "ضبط عشق" اور صفیر لکھنوی نے "فتنۂ عشق" لکھی تھی۔ "سحر البیان" کو سامنے رکھ کر نظم لکھنوی نے "لذت عشق" لکھی تھی۔ اب اگر نسیم نے رفعت و ریحان کی مثنویاں سامنے رکھ کر "گلزار نسیم" لکھی تھی تو کیا عیب کی بات ہے؟ اور اس سے اس کی عظمت و انفرادیت پر کیا آنچ آ سکتی ہے؟ شاعری میں چراغ سے چراغ جلتا ہی ہے۔ کون سا انسانی تخیّل ہے، جس کو منفرد کہا جا سکتا ہے؟ عبدالباری آسی کے ایک شاگرد زماں خاں زماں نے کسی جگہ اپنا یہ شعر پڑھا:-

انقلابات کا ہر وقت ستم ہوتا ہے ہر لحظہ جو عمر میں بڑھتا ہے وہ کم ہوتا ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اُن کے ایک دوست نے کہا کہ تمہارا یہ شعر ماخوذ ہے تمہارے ہی استاد آسی کے اس شعر سے :ـ

رفتہ رفتہ یہ زمانے کا ستم ہوتا ہے :: ایک دن روز مری عمر میں کم ہوتا ہے

اُن کے دوسرے دوست نے کہا کہ یہ بھی سن لو کہ تمہارے استاد آسی کا بھی یہ خیال ماخوذ ہے، میر درد کے اس شعر سے :ـ

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

زماں بچارے ہکّا بکّا رہ گئے۔ جب اپنے استاد سے ملے تو انھوں نے اُن کو یہ روایت سنائی۔ آسی نے مسکرا کے کہا کہ تم گھبراتے کیوں ہو؟ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ کیا میر درد کا یہ خیال اپنا ہے؟ اُن کا بھی متاثرہ شعر ماخوذ ہے شاکر ناجی کے اس شعر سے :ـ

بلند آواز سے گھڑیال کہتی ہے کہ اے غافل
گھٹی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے، اب تک نہیں چیتا

مگر تم اس کو بھی اوریجنل خیال نہ سمجھنا۔ شاکر ناجی کا بھی یہ شعر ماخوذ ہے فارسی کی اس رباعی سے :ـ

گریاں کہ نوحہ می کند گاہ گری :: دانی غرضش چیست ازیں نوحہ گری؟
یعنی کہ گری گری شود عمر تو کم :: پیمانۂ عمر پر شود تا نگری!

انھوں نے کہا کہ شاعری تو ایک گورکھ دھندا ہے، جس شعر کو دیکھئے ویسا ہی ایک شعر اور بھی نظر آئے گا۔

بلاشبہ یہ صحیح ہے۔ ایسا ہمیشہ، ہر زبان میں، ہر جگہ اور بڑی بڑی جگہ ہوتا ہے۔ سر اقبال (وفات ۱۹۳۸ء / ۱۳۵۷ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب "جاوید نامہ" ایک بلند پایہ فارسی کتاب ہے۔ خود شاعر موصوف کو بھی اس پر ناز تھا۔ فرمایا ہے کہ :ـ

ایں کتاب از آسمانے دیگر ست

مگر در حقیقت وہ اٹلی کے مایۂ ناز شاعر دانتے (وفات ۱۳۲۱ء / ۷۲۰ھ) کی "DIVINE

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"COMEDY" سے ماخوذ ہے۔ مگر کیا اس سے "جاوید نامہ" کا وقار کم ہو جائے گا؟
اگر ڈانٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" کو بھی اوریجنل سمجھا جائے تو یہ بھی غلط ہوگا۔ میڈرڈ
یونیورسٹی کے پروفیسر آسن نے اپنی معرکہ آرا کتاب ISLAM AND DIVINE
COMEDY میں ثابت کر دکھایا ہے کہ "ڈیوائن کامیڈی" دراصل شیخ محی الدین ابن عربی
(وفات ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) کی کتاب "فتوحاتِ مکیہ" سے ماخوذ ہے۔ تو کیا اس سے "ڈیوائن کامیڈی"
کی اہمیت کم ہو جائے گی؟ اگر کوئی سمجھے کہ ابن عربی کا بھی یہ خیال منفرد ہے، تو یہ بھی غلط
ہوگا، کیونکہ اُن کا یہ تصوّر محمد اسمٰعیل بخاری (وفات ۲۵۶ھ/۸۷۰ء) کی "جامع الصحیح" سے
ماخوذ ہے۔ لہٰذا اگر "گلزارِ نسیم" بھی رفعت و ریحان کی مثنویوں کے مطالعہ کے بعد
لکھی گئی ہو تو اس سے "گلزارِ نسیم" پر خزاں کا کوئی اثر مترتب نہ ہوگا۔

بعض لوگوں نے سحر البیان اور گلزارِ نسیم کا مقابلہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔
میرے نزدیک یہ ایک بے معنی محنت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "گلزارِ نسیم" لکھنؤ اسکول
کی طرف سے، دلّی اسکول کے مقابلہ میں ہی لکھی گئی ہے اور جوابًا ہی تصنیف ہوئی ہے،
مگر اس کی وجہ سے ان دونوں مثنویوں کا مقابلہ مناسب نہیں۔ کیونکہ دونوں فکریں، ایک
دوسرے سے بالکل جدا اور الگ ہیں۔ سحر البیان دہلویت کی آئینہ دار ہے۔ اور گلزارِ نسیم
لکھنویت کا مرقع۔ اور یہ دو اسکول کے دو الگ الگ اسلوب اور طرز ہیں۔ جن کا مقابلہ
بے معنی ہے۔ ایک فطری نمونہ ہے اور دوسرا صنعتی ماڈل۔ پھر ان دونوں کا مقابلہ کیا؟
دیکھنے کی چیز صرف یہ تھی یا یہ ہے یا یہ ہو سکتی ہے کہ جس اسلوب و انداز کی مثنوی
"گلزارِ نسیم" داعی یا مظہر یا نمونہ ہے۔ اس میں وہ کامیاب ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو
پھر وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے، چاہے وہ اسلوب بجائے خود جس قدر بھی مصنوعی یا
ناپسندیدہ ہو۔ اس میں "سحر البیان" والی سلاست و روانی، سوز و گداز اور لطافت
و نظافت تلاش کرنا بے معنی ہوگا۔ وہ شاعرانہ صنعتوں کا منبع اور مخزن ہے اور
اسی لحاظ سے اس کا مطالعہ ہونا چاہیے۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ اپنے
انداز میں سو فیصدی کامیاب مثنوی ہے اور جو لوچ، ملائمیت اور رعایت اس میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کارفرما ہے، اس کی کامیاب مثال اور کوئی موجود نہیں۔ اور نسیم کو اس محنت کی داد ملنی چاہیئے۔

بعض لوگوں نے اس امر پر بھی بڑا زورِ قلم صرف کیا ہے کہ جب یہ مثنوی لکھی گئی تو اس کا حجم بہت زیادہ تھا۔ جب نسیم، اس کو اپنے استاد آتش لکھنوی کے پاس مطالعہ و اصلاح کیلئے لے گئے تو انھوں نے کہا کہ ارے بھائی! اتنی بڑی مثنوی کون پڑھے گا؟ یا تو تم خود پڑھوگے اس لئے کہ تم نے لکھا ہے۔ یا اصلاح کے خیال سے ایک بار میں پڑھوں گا کیونکہ اسے تم نے لکھا ہے۔ لہٰذا اس کو کم کرو چنانچہ انھوں نے اس کو مختصر کیا اور اس کے بعد آتش نے اس کی اصلاح کی۔

اس رنگین قصے کو میں نے متعدد بار منقول دیکھا اور پڑھا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ یہ سب فسانہ طرازی نہیں تو شاعری ضرور ہے۔ آخر یہ مثنوی کتنی ضخیم تھی کہ آتش نے اسے کم کرنے کی ہدایت کی؟ دو دو تین ہزار اشعار کی مثنویاں تو پڑھی جاتی ہیں، پھر اس کی طوالت لوگوں کو کیا گراں بار ہوتی؟ آتش کے اصلاح دینے کی بھی روایت کو میں گپ ہی سمجھتا ہوں۔ جس رنگ کی یہ مثنوی تھی وہ رنگ آتش کا نہ تھا۔ پھر وہ اس کی اصلاح کیا کر سکتے تھے؟ دوسرے آتش ہی کے شاگرد مرزا شوق لکھنوی بھی تھے اور انھوں نے بلا استاد کے دکھائے، اپنی مثنویاں شائع کرائی تھیں۔ کیونکہ وہ مثنویاں جس زبان میں تھیں وہ آتش یا کسی لکھنوی شاعر کی زبان نہ تھی۔ پھر جب آتش ہی کے شاگرد شوق ایسا کر چکے تھے تو نسیم کو کیا مجبوری تھی کہ وہ بغیر استاد کو دکھلائے یہ مثنوی شائع کرا ہی نہیں سکتے تھے؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ فسانہ طرازی اُن لوگوں نے کی تھی جو نسیم کے مخالفین تھے۔ اور زبانی در زبانی کے بعد اسے تحریری شکل میں بھی لے آیا گیا۔

آتش کا مرتبہ مسلّم۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ شاگردوں کی ساری چیزیں اُن کی اصلاح کے بعد ہی کوئی مرتبہ حاصل کر سکتی تھیں۔ کچھ لوگوں نے دلیل یہ پیش کی ہے کہ نسیم کا دوسرا کلام اس مثنوی کے رنگ سے مختلف ہے۔ یہ دلیل بھی وزنی نہیں۔ شوق لکھنوی کی غزلوں کے جتنے شعر ملے ہیں، اُن میں اسکول لکھنویت موجود ہے۔ مگر ان کی مثنویاں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دہلوی سلسبیل میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اور کئی دوسرے شعرا ہیں جن کی غزلیں دوسرے رنگ میں ہیں اور مثنویاں دوسرے رنگ میں۔ لہٰذا یہ دلیل معقول نہیں۔

گُل بکاؤلی کا قصّہ عام طور سے مشہور ہے جس کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات تفصیل سے اس قصہ کو جاننا چاہیں وہ کتاب خرید کر پڑھ لیں یا ڈاکٹر نارنگ کی کتاب "اردو مثنویات" سے مختصراً جان لیں۔ قصہ کا لبّ لباب یہ ہے کہ بکاؤلی اندر لوک کی پری تھی، جو رات کو اندر لوک میں اور دن کو زمین پر رہا کرتی تھی۔ اس کے باغ میں ایک پھول تھا جس کی خاصیّت یہ تھی کہ اندھے کی آنکھ سے لگا دیا جائے تو بینائی لوٹ آتی تھی۔ تاج الملوک نے باپ کی بینائی لوٹانے کے لئے اس پھول کو حاصل کیا اور آخر میں وہ پری بھی اس کو مل گئی۔

بہت سے لوگ اس قصہ کو حقیقی بتاتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ، عبداللہ قریشی کے مضمون اور رحمان علی کی کتاب "تحفۂ خان بہادر" میں اس کے بارہ میں جو کچھ کہا گیا ہے، ڈاکٹر نارنگ نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حال میں سعدی سنگروری کا ایک تحقیقی مضمون دیکھا جس میں کہا گیا ہے کہ ریاست ریواں کے پہاڑی علاقہ میں ایک جھیل ہے جس سے تین دریا زبدا، بھدرا اور چنبیلی نکلتے ہیں۔ راجہ ہیکل جوگ کے وزیر کنڈا کھڑک سنگھ نے اس جھیل میں ایک قلعہ بنوایا تھا جسے فیض آباد کے لوگ اب بھی "بکاؤلی کا قلعہ" کہتے ہیں اور تھوڑے فاصلہ پر ہالہ گڑھی ہے جو دلدل سے گھری ہوئی ہے لہٰذا یہ قصہ فرضی نہیں اصلی ہے۔ بہر حال! یہ قصہ حقیقی ہو یا مصنوعی مگر ہے بہت مشہور اور اسی لحاظ سے اس کی اہمیت بھی ہے۔

مثنوی "گلزارِ نسیم" کا نمونہ پیش کرنا تو بیکار ہے۔ البتہ چند اشعار ضرور سنئے جن میں بڑے بڑے واقعات، مرحلات اور جذبات کو چند لفظوں کے اندر، ایک شعر میں، پوری کامیابی کے ساتھ قلمبند کر دیا گیا ہے۔ علّامہ شبلی نے فردوسی کی تعریف یہ کی ہے کہ بعض دفعہ وہ بہت سے واقعات کو چند لفظ میں ادا کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر، مجلس مشاورت منعقد ہوئی اور اس میں زیرِ غور مسئلہ پیش ہوا۔ بحثیں ہوئیں۔ اختلاف و

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اتفاق ہوا - رلسئے لی گئی - آخر ایک بات سطے ہوگئی اور مجلس برخاست ہوگئی - اس پوری روئداد کو فردوسی نے صرف ایک شعر میں بیان کر دیا ہے :-

بپے مشورہ مجلس آراستند :. نشستند و گفتند و برخاستند

بیشک یہ ایک قابلِ داد بات ہے - نسیم کے یہاں بھی اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں :-

تیوراکے، وہیں وہ بارِ بردوش :. بیٹھا تو گرا، گرا تو بیہوش
گھوڑا، جوڑا، نفیر، حویلی :. جو جو شئے چاہیئے تھی، لی
اقرار یہیں تھی، جو بے حیائی :. شرمائی، لجائی، مسکرائی
تنہا اسے دیکھ کر کہا، "ہیں :. محمود وہ کیا ہوئیں؟" کہا "ہیں"
جب صبح ہوئی تو منہ میں ڈالا :. کالے نے من، اژدہے نے کالا
نکلا جو پھر شب کو آکے اژدر :. گلخن سے دھواں، دھواں سے اخگر

تاج الملوک واپس آکر باپ سے ملتا ہے اور باپ کو یہ پوری روئداد سناتا ہے :-

وہ جنگل، وہ بار، وہ غلامی :. وہ گھات وہ جیتنا، تمامی
گذرا تھا جو کچھ، بیان کیا سب :. پنہاں تھا جو کچھ، عیاں کیا سب

بکاؤلی کی گرفتاری کے بعد، تاج الملوک مارا مارا پھرتا ہے - اتفاقاً چند پریاں ننگی نہاتی نظر آتی ہیں، تاج الملوک اُن کے کپڑے اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے :-

چشمہ اک آفتاب کا تھا :. عاشق کی طرح بھرا ہوا تھا
پریاں، کچھ ادھر نہانے آئیں :. دیکھا جو بشر، تو کھلکھلائیں
بولیں، یہ وہی بکھاوجی ہے :. عاشق جس پر بکاؤلی ہے
وہ یہ جو ملکے لول اٹھا کر للہ :. بتلاؤ کہاں ہے وہ؟ کہا "آہ"
اندر کے غضب سے بن کے پتھر :. ہے بُت سی وہ اک مٹھو کے اندر
یہ کہہ کے اُتاری سب نے پوشاک :. باہر ہوئیں جامے سے وہ بیباک
پردے کا جو کچھ خیال آیا :. تن چادرِ آب سے چھپایا
بے ننگ پری سب نہارہی تھیں :. موجیں باہم اُڑا رہی تھیں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سوچا وہ، کہ ان کو دیجئے جُل ۔ خس پوش کئے وہ جامۂ گل
جب خوب وہ شعلہ رُو نہائیں ۔ بصد آب بے تاب باہر آئیں
پوشاک دھری ہوئی نہ پائی ۔ جانا کہ حریف نے اڑائی
جھک جھک کے بدن چرائی آئیں ۔ رک رک کے قدم بڑھاتی آئیں
دکھلائی کسی نے چشمِ جادو ۔ چمکائی کسی نے تیغِ ابرو
جھنجھلا کے کہا کہ لاؤ مانو ۔ ہم کو بھی بکاؤلی نہ جانو
بولا وہ، یہ خوش، تم ایسی کیا ہو ۔ ڈرنے کا نہیں ہیں، کیا بلا ہو
پوشاک جو لینی ہو تو پہنچاؤ ۔ بولیں وہ، چلو کہا، قسم کھاؤ
عریانی کے ننگ سے لجائیں ۔ ستّار کی قسمیں سب نے کھائیں
شہزادے نے کرکے پاس اُن کا ۔ خلعت سا دیا لباس اُن کا
پریاں ہوئیں، رخصت، کے خورسند ۔ ہو جیسے ہوا حباب میں بند

بارہویں شعر میں عریانی و برہنگی کے موقع پر، فطری شرم اور نسوانی حیا۔ جو کیفیت پیدا کرتی ہے، اُس کی نہایت عمدگی سے مصوری کی گئی ہے۔ اسی طرح چودھویں شعر میں، تحلیلِ نفسی کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ صنفِ لطیف کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اگرچہ وہ خود عشق و محبت کی حسین بلا اور لطیف مرض میں مبتلا ہو مگر کسی دوسری ہم جنس کی اس کمزوری کا حال سنتی ہے تو اُس پر طعن و طنز کرنے سے نہیں چوکتی۔ اسی طرح سترہویں شعر میں پریوں کا "ستّار" کی قسم کھانا، بیان کرنا بہت خوب ہے۔ "ستّار" اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ہے، کیونکہ وہ عیبوں کو چھپانے والا اور "ستر" کا پردہ پوش ہے۔ "ستر" اُس حصۂ جسم کو کہتے ہیں جسے کھلا نہ رہنا چاہئے۔ ننگی پریوں کا، اپنی پوشاک واپس لے کر ستر چھپانے کے وقت، ستّار کی قسم کھانا نہایت بلیغ ہے۔

عورتوں کے عریاں ہو کر چشموں اور دریاؤں میں نہانے، اور اُن کے کپڑے اٹھا لے جانے کی روایت، قریب قریب ہر قوم میں پائی جاتی ہے۔ کرشن جی کے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے گوپیوں کی ساریاں، جو دریا میں ننگی ہو کر نہا رہی تھیں، اٹھا کر کدم کے گاچھ پر جا چڑھ گئے تھے۔ اور اس وقت تک نہ دیا تھا جب تک کہ انھوں نے شرمائی، لجائی، ننگ دھڑنگ ہی سامنے آ کر کرشن جی سے کپڑے دینے کی درخواست نہ کی تھی۔ فرحت نے لکھا ہے کہ کپڑے دیتے وقت کرشن جی نے، گوپیوں کو اس کی تاکید کر دی تھی کہ وہ آئندہ سے پانی میں ننگی ہو کر نہ نہائیں:

دیا جامہ اور یوں ہوئے ہمکلام ؛؛ کہ ہے آبِ دریا، برن کا مقام
نہائے اگر آدمی بے حجاب ؛؛ سراسر وہ ہو غرق، بہرِ عذاب
تمہیں اِس نہانے سے کر دیں خبر ؛؛ نہاؤ نہ بے پردہ، بارِ دگر

جہاں تک کہ اس روایت اور کرشن جی کے کردار کا تعلق ہے، میں نے اس کتاب کے دوسرے حصہ میں بحث کیا ہے اور میں اس کو سراسر غلط سمجھتا ہوں مگر یہاں محض یہ دکھانے کے لئے پیش کیا ہے کہ ننگی نہاتی ہوئی عورتوں کے کپڑے اٹھا لئے جانے کی روایت سنسکرت ادب میں بھی موجود ہے۔

جہاں تک کہ عربی ادب کا تعلق ہے "سبعہ معلقہ" عربی زبان میں، جاہلیت کے اعلیٰ ترین شعری ادب کا بہترین مجموعہ بیان کیا جاتا ہے۔ گرچہ مصر کے نامور اور شہرۂ آفاق ادیب و محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی موقر کتاب "ادب جاہلی" میں نہایت دیدہ دری کے ساتھ اس ادب کا جائزہ لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ جس ادب کو، دورِ جاہلیت یعنی قبل از اسلام کا ادب سمجھا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ دراصل بعد کے لوگوں نے وہ اشعار کہہ کہہ کر قدیم شعرا کے نام سے موسوم اور نامزد کیا ہے۔ تاہم یہاں دکھانا یہ مقصود ہے کہ عربی ادب میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ "سبعہ معلقہ" میں وہ سات عربی قصائد ہیں، جنہیں آمدِ اسلام اور بعثتِ نبیؐ آخر محمد رسول اللہؐ سے پہلے عرب کے نامور ترین شعرا کا کہا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ اور روایت ہے کہ عربوں کو ان قصائد پر ایسا ناز تھا کہ انھوں نے انہیں لکھ کر خانہ کعبہ میں بطور چیلنج آویزاں کر دیا تھا اور جن کا جواب نہ پیش ہونے پر عربوں نے غیر عربوں کو "عجمی" یعنی گونگا کہنا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شروع کر دیا تھا۔

"سبعۂ معلقہ" میں ایک قصیدہ الشعر العرب امراء القیس کا ایسا ہے جس میں وہ بیان کرتا ہے کہ جب اُس کو معلوم ہوا کہ اُس کی محبوبہ عنیزہ، نامور دوشیزگانِ عرب کے ساتھ پکنک منانے "دارۂ جلجل" کو جا رہی ہے تو اس نے اپنی ذہانت سے یہ سوچ کر کہ راہ میں جو حسین نہر واقع ہے، اُس میں یہ لڑکیاں غسل ضرور کریں گی، وہ پہلے سے آکر نہر کے قریب ایک درخت پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔ تا آنکہ حقیقت یوں ہی ظاہر ہوئی۔ جب یہ جماعتِ حسینانِ عرب اُس نہر پر پہنچی تو نہانے کی تجویز پاس ہوئی اور تمام لڑکیاں کپڑے اتار اتار کے پانی میں کود گئیں۔ امراء القیس نے چپکے سے آکر اُن کے تمامی لباس اٹھا لئے اور اُس وقت تک نہ دیا جب تک کہ انھوں نے نہانے کے بعد پانی سے باہر آکر عریاں حالت میں لباس کی واپسی کی درخواست نہ کی اور اُس نے سب کو جی بھر کے ننگی نہ دیکھ لیا۔

لوگوں نے "گل بکاؤلی کے قصہ کو" ہند ایرانی" روایتوں کی مخلوط صورت ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس مماثلت سے ظاہر ہوتا ہے کہ در اصل یہ قصہ "ہندی عربی" روایتوں کی مخلوط صورت ہے۔ ہیرو تاج الملوک بھی عربی ہی کردار ہے۔

"گلزار نسیم" کی بعض شاعرانہ صنعتوں کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:۔

(۱) صنعتِ تحلیل۔ یعنی ایک ہی طرح کا لفظ یا نقرہ جو دو جگہ استعمال کیا جائے اور دونوں جگہ سیاقِ کلام میں آ جاتا ہو، مگر معنی مختلف ہو۔ مثلاً

اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد :: صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

(۲) صنعتِ تجنیس محرف۔ یعنی دو متجانس الفاظ، اعداد و ترتیب حروف و الفاظ کی حیثیت سے یکساں ہوں، البتہ ان کی حرکات میں اختلاف ہو، جیسے :۔

مُشکیں زلفوں سے مَشکیں کسواؤ :: کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

(۳) صنعتِ تجنیس مضارع۔ یعنی متجانس الفاظ کے ایک حرف میں اختلاف ہو اور یہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

حروف مختلف، متحد المخرج یا قریب المخرج بھی ہوں۔ مثلاً :۔

ہار گہر طلسم اغلاق ٭ بحر سخن میں خامہ غوّاص

(۷) صنعتِ حسنِ تعلیل ۔ یعنی کسی ایسی بات یا کسی ایسے وصف کے لئے ایک چیز یا ایک بات کو علّت قرار دینا، جو درحقیقت اُس کی علّت نہیں ہو۔ جیسے :۔

گوشہ بیں کوئی لگا نہ ہووے ٭ غوشہ کوئی تا کتا نہ ہووے

غرض اسی طرح اردو شاعری کی وہ تمام صنعتیں، جو آورد کے تحت رائج ہوئیں، یا مختلف جگہ پائی جاتی رہیں اور جو "لکھنؤ اسکول" کی خصوصیت کے ساتھ سرمایۂ ناز تھیں، گلزار نسیم میں کار فرما اور یکجا موجود ہیں۔ درحقیقت شاعرانہ صنائع و بدائع کے ہی مجموعے کا نام "گلزارِ نسیم" ہے۔ صاحبِ "اردو مثنویاں" نے فرمایا ہے کہ :۔

"میر حسن کا سا سوز و گداز ان کے پاس نہیں۔ نہ ہی وہ روزمرہ اور محاورے کے بادشاہ ہیں۔ لیکن شوکتِ الفاظ، اختصار، تناسبِ لفظی، بلند پروازی، باریک بینی، استعاروں کی نزاکت اور تشبیہوں کی پختگی میں اُن کا ایک خاص رنگ ہے۔ وہ لکھنؤ کی رنگین، لوچدار اور مرصّع زبان کے نمائندہ شاعر ہیں۔"

نسیم نہایت باکمال و ذی استعداد شاعر تھے اور "لکھنؤ اسکول" کے نمائندہ کی حیثیت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اُسی رنگ میں کہتے تھے۔ دیکھئے اُن ہی کا یہ کیسا لطیف و سادہ شعر ہے :۔

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو اور اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بارِ شکم تھے، مرے وبالِ دوش ہوئے

نہالؔ ۔ منشی نہال چند

نہالؔ کے بارے میں صاحب "تذکرۂ شعرائے ہنود" نے بتایا ہے کہ نہالؔ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نے ایک مثنوی "گل بکاؤلی" کے قصہ پر مشتمل لکھی تھی۔ صاحبِ "اردو کے ہندو ادیب" نے اس کا نام "مذہبِ عشق" ظاہر کیا ہے۔ صاحبِ "اردو مثنویاں" نے بھی بلوم ہارٹ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس مثنوی کا نام "مذہبِ عشق" ہے اور انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ۱۸۰۴ء / ۱۲۱۹ھ سے ۱۸۸۹ء / ۱۳۰۶ھ تک کے بیس مختلف ایڈیشن محفوظ ہیں۔ کمال ہے کہ لندن میں اس کے بیس مختلف ایڈیشن موجود ہیں مگر خود ہندوستان میں نایاب ہے۔ کثرتِ اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی بہت مقبولِ انام تھی۔ اس کے باوجود یہاں مجھے کوئی مثنوی نہیں ملی۔ نہال سے یہ یہ مثنوی عزت اللہ بنگالی کے فارسی نسخے کو سامنے رکھ کر لکھا تھا۔ نمونہ یہ ہے:

سینے میں سرنگ تو لگا کر ۔۔ دل مفت میں لے گیا چرا کر

دیکھا نہیں گو نگاہ بھر کر ۔۔ پر آنکھ پڑی ضرور لب پر

گو سیر ہوا نہ تو یہ مانا ۔۔ اس شہد کا پر مزہ تو جانا

جو نقد تھا اس کو لے گیا ہے ۔۔ صندوق فقط یہاں پڑا ہے

اس مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۸۰۲ء / ۱۲۱۷ھ ہے۔

نیساں - منشی ماتا پرشاد

حضرت تمنا لکھنوی کے ذکر میں بیان ہو چکا ہے کہ حضرت نیساں لکھنوی، نور لکھنوی کے حقیقی چچا، تمنا لکھنوی کے حقیقی بھائی اور حضرت ذرّہ لکھنوی کے منجھلے لڑکے ہیں۔ سالِ ولادت ۱۸۶۱ء / ۱۲۷۸ھ اور سالِ وفات ۱۹۳۸ء / ۱۳۵۷ھ ہے۔ تمنا لکھنوی کی طرح یہ بھی فنِ شاعری میں اپنے ماموں فرحت لکھنوی کے شاگرد تھے۔ یہ حضرت داڑھی بھی رکھتے تھے۔

صاحبِ "تذکرۂ شعرائے ہنود" نے لکھا ہے کہ نیساں نے "فسانۂ عجائب" کو نظم کیا تھا۔ اس کا کوئی نمونہ نہیں مل سکا۔ البتہ ان کی دوسری مثنوی "مثنوی بابا ہزلا"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کا نمونہ ملاحظہ ہے جس میں انھوں نے لکھنؤ کے مشہور بزرگ بابا ہزارہ کی عقیدت میں اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا:۔

الٰہی دے قلم کو وہ روانی ٭ کہ دنیا شرم سے ہو پانی پانی
جو مضموں چاہوں وہ پیدا ہو جائے ٭ سمندر میرے کوزہ میں سما جائے
قلم سے میرے جو مضموں نکل جائے ٭ سراپا نور کے سانچے میں ڈھل جائے
رسا تیرے کرم سے نارسا ہو ٭ یہ قطرہ وہ ہو جو بحر آشنا ہو
زمین شعر میں ہو وہ بلندی ٭ فلک بھولے خیال دل پسندی
لکھوں بابا ہزارا کا کچھ احوال ٭ کروں تحریر اس دربار کا حال

زبان و بیان دونوں لحاظ سے مثنوی ایک قادر الکلام شاعر کا نتیجہ فکر معلوم ہوتی ہے۔

واقف - لالہ حسین بخش

واقف صاحب، لکھنؤ کے رہنے والے اور ایک قدیم کائستھ خاندان کے فرد تھے۔ اردو اور فارسی زبانوں کے جید عالم اور ہندی و انگریزی کے واقف کار تھے۔ انھوں نے کنور دھنپت رائے کی شادی کے حالات پر مشتمل ایک مثنوی لکھی تھی جس کا نام "بہارستان شادی" تھا۔

ہوئی یہ مثنوی جس وقت اتمام ٭ "بہارستان شادی" رکھ دیا نام

ہندوؤں یا راجاؤں کی شادی میں کیا کیا رسومات رائج ہیں سب کو وضاحت سے مدون و منظم کر دیا تھا۔

ہرچند - منشی ہرچند رائے

ہرچند، قوم اگروالے تھے۔ باپ کا نام رائے سنگھ تھا۔ قصبہ سرونعہ،

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ صاحبِ "اردو مثنویاں" نے بتایا ہے کہ ہر چند نے حسبِ ذیل پانچ مثنویاں لکھی تھیں:۔

(۱) گلزارِ بہار ۔ ۱۸۴۶ء / ۱۲۶۲ھ (۲) افسانۂ غم ۱۸۵۴ء / ۱۲۷۰ھ

(۳) ستم نامہ ۱۸۵۵ء / ۱۲۷۱ھ (۴) نامۂ عشق ۱۸۵۶ء / ۱۲۷۳ھ

(۵) کشف الدقائق ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ

"افسانۂ غم" میں قصہ روپ بسنت نظم ہوا تھا جو مجلس رائے بقال کی ہندی روایت سے لیا گیا تھا۔ مثنوی "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے شروع ہوتی ہے۔ حمد و مناجات کے بعد سببِ تالیف ہے۔ شاعر نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قصہ کبت اور دوہرہ کی شکل میں موجود تھا۔ بعض لوگ اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے اس لئے اسے اردو میں مفصل لکھا گیا:۔

کبت اور دوہرہ میں تھا وہ مرقوم ؎ نہ ہوتا تھا مفصل حال معلوم

قصہ یہ بیان ہوا ہے کہ رتن سین کے ہاں بڑھاپے میں بڑی منتوں سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ روپ اور بسنت۔ اُن کی ماں مر گئی تو باپ نے دوسری شادی کی۔ نئی رانی بڑے لڑکے روپ پر مائل ہو گئی۔ ڈاکٹر نارنگ نے اپنی کتاب میں پورا قصہ لکھا ہے جس کو دوہرانا بے معنی ہے۔ میں نے محض "روپ بسنت" کو جان لینے کے لئے اس قدر لکھ دیا ہے۔ نارنگ نے صرف اسی مثنوی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کے سوا اور کسی مثنوی کا نمونہ نہیں دیا۔ البتہ کہا ہے کہ تسلسل اور اختصار مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مگر اندازِ بیان دلکش نہیں۔ بسنت کے سانپ سے ڈسے جانے کی کیفیت یوں بیان کی ہے:۔

جگا جب روپ رشکِ ماہ پارہ ؎ بسنت کو پیار سے اُس نے پکارا

کہ ہو بیدار تو زہرہ جبیں اب ؎ گئی نورِ سحر سے ظلمتِ شب

نلاہٹ تن پہ جو دیکھی نمودار ؎ تو جانا ڈس گیا ہے مارِ خونخوار

خاتمہ یوں ہے:۔

یقیں ہے جو پڑھے ہو چشم پُرنم ؎ تو رکھا نام میں "افسانۂ غم"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

رنگینی میں نے جو کہہ کر شوق کے ساتھ ؎ ہوئیں چودہ ۱۴۰۰ سو پوری چلہ ابیات

ہردیو ۔ منشی ہردیو سہائے

صاحب "اردو مثنوی" نے فرمایا ہے کہ ہردیو نے "مثنوی راجہ رگھوبیر" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جس میں ایک جوگی کا قصہ ہے جس نے راجہ رگھوبیر کا سوانگ بھرا تھا ۔ یہ کتاب میرٹھ سے سنہ ۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ میں شائع بھی ہو گئی تھی ۔ نمونہ موجود نہیں ۔

ہمّت ۔ منشی بنسی دھر

ہمّت ، قوم کائستھ سے تعلق رکھتے تھے ۔ رائے دیبی دین کے بیٹے تھے ۔ ان کے دادا کا نام منولال تھا ۔ منشی رام دیال نادم کے شاگرد تھے ۔ محلہ نوبستہ لکھنؤ میں رہتے تھے ۔ تحقیقِ الفاظ کے رسیا تھے ۔ کہنہ مشق اور صاحبِ دیوان شاعر تھے اور ان کے اشعار اکثر زبان زد خاص و عام ہو جاتے تھے ۔ مثلاً : ؎

اسیرِ دام ہو کر بلبلِ شیدا نہ کر شیون
شریکِ حال ہوتا کون ہے کس کی مصیبت میں؟
دو روزہ دولتِ دنیا پہ نازاں ہو نہ اے منعم
زمانے کا دگرگوں حال ہو جاتا ہے ساعت میں

نادم کا سنہ ۱۸۶۰ء ۱۲۷۶ھ میں انتقال ہوا ۔ بیس ۲۰ سال کے بعد ہمّت سنہ ۱۸۸۰ء ۱۲۹۷ھ میں مرے ۔

صاحبِ "ہندو شعرا" نے ہمّت کی مثنوی "قصہ ہنس جواہر" کا ذکر کیا ہے ۔ ڈاکٹر نارنگ نے بھی بلوم ہارٹ کے حوالہ سے اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ قاسم شاہ دریابادی نے بھاشا میں یہ قصہ سنہ ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۵ء میں لکھا تھا جس کو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہمّت نے اردو مثنوی کی شکل میں منتقل کیا تھا - اس مثنوی کے جس نسخہ کا بلوم ہارٹ نے ذکر کیا ہے وہ سنہ ۱۹۰۰ء کا چھپا ہوا ہے - مگر کہیں سے بھی اس کا نمونہ دستیاب نہ ہو سکا۔

ہندی - منشی کنہیا لال

ہندی، لاہور کے رہنے والے تھے - ان کے والد کا نام منشی بنسی لال تھا - اردو، فارسی کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے - انگریزی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور لاہور میں "Executive Engineer" تھے - شاعری کا شوق رکھتے تھے "مناجاتِ ہندی" کے نام سے ایک مثنوی انھوں نے لکھی تھی - نمونہ یہ ہے :

حضرتِ خالق نے ہندی پر بڑا احسان کیا ؛ بخش کر تاجِ شرافت، اشرف الحیوان کیا

ماہر - منشی کرشن سہائے

ہنر، رسول پور کے رہنے والے تھے - ان کے والد منشی چندر سہائے شوق تھے - اردو فارسی کے اچھے اور مانے ہوئے استاد تھے - انھوں نے ایک مثنوی "رام کتھا" کے نام سے لکھی تھی - مگر اس کا کوئی نمونہ نہیں مل سکا۔

ہنر - منشی جدونندن سہائے

ہنر، گورداس پور (پنجاب) کے ایک شاعر تھے جن کی مثنوی "نگارستان" کا ذکر کہیں کہیں ملا - لیکن اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں چلا - نمونہ بھی دستیاب نہ ہو سکا -

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیرا ـ منشی ہیرا لال

ہیرا، میرٹھ کے رہنے والے تھے اور سرکاری ملازمت میں تھے۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ ایک مثنوی انھوں نے "مشاطۂ سخن" کے نام سے لکھی تھی ۔ نمونہ یہ ہے : ؎

شکر پروردگار ہر دم ہو :: گو مہیا فزوں ہو یا کم ہو
زندگی کا تو اعتبار نہیں :: ہاں زمانہ کو کچھ قرار نہیں
چھا گیا کچھ خمار سا مجھ کو :: آگیا انتشار سا مجھ کو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundatioh, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اُردو شاعری کی ابتدا "مثنوی" سے ہوئی ہے، مگر جس عہد میں ابتدا ہوئی وہ فارسی زبان کا عہد تھا جو ہندوستانی نہیں بلکہ ایرانی زبان تھی۔ چنانچہ "اردو مثنویوں" پر ایرانی اثرات حاوی رہے۔ جذبات و تصورات اور تشبیہات و تمثیلات ہی تک نہیں، عشق و محبت تک بھی۔ چنانچہ بالعموم اردو مثنویاں، فارسی مثنویوں کا ترجمہ یا چربہ یا نقل ہیں۔ نتیجتاً اگرچہ اردو زبان میں مثنویاں کافی لکھی گئیں مگر اُن کی فضا عام طور سے ایرانی رہی اور ان میں عشق و محبت کی روایت ہو یا مذہب و عقیدہ کی داستان، سب میں زیادہ تر ایرانی تصورات اور ماحول کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ خالص ہندوستانیت مشکل ہی سے کہیں دکھائی دیتی ہے۔ اگر کہیں نظر بھی آتی ہے تو بالعموم ہندو شعرا کی اُن مثنویوں میں، جن میں ہندو دیو مالا کو پیش کیا گیا ہے یا ہندوستانی روایات کو اردو مثنوی کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اردو مثنوی کا دامن، کسی عہد میں مقامی موضوعات سے مطلقاً خالی نہیں رہا اور بہت سے مسلمان شعرا نے "غزل" میں تو خالص ایرانیت کو جائز رکھا، مگر مثنوی میں اپنے وطنی قصّوں کو بھی جگہ دے کر اپنی ہندوستانیت کا اظہار کیا۔ مگر حقیقتاً یہ ہندو شعرا ہی تھے جن کے ذریعہ اردو مثنویوں کو ہندوستانی آب و رنگ ملا اور شاعری کے ایوان میں، شیریں فرہاد کے بدلے ہیر رانجھا کے نغمے گونجے اور یوسف زلیخا کے عوض رام اور سیتا کی دے رنی گئی۔ جس وجہ سے اردو شاعری میں مقامی رنگ اور ہندی روایت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ورنہ "غزلیں" تو ہندو شعرا کی بھی تمام تر عجمیت میں شرابور اور ایرانیت میں غرق رہیں۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہندوؤں کی مقدس مذہبی کتابوں کے ترجموں کی حامل مثنویوں کی تحریر و تنظیم سے اردو ادب میں ایک نئی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ دنیا کی ساری زبانوں کے ادب نے اپنی اپنی میتھولوجی (MYTHOLOGY) سے فن و ادب میں نئے نئے نقش و نگار پیدا کیے ہیں۔ یونانیوں کے پاس اُن کی میتھولوجی کا بہت بڑا سرمایہ تھا اس لیے یونانی ادب، دنیا کے عظیم ادبی سرمایہ کا مخزن بنا۔ انگریزی ادب کو بھی عظیم تر بنانے میں یونانی میتھولوجی ہی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ رومن ادب بھی یونانیوں ہی کے ادب کا مرہون منت ہے۔ یونانیوں کے بعد ہندوستانی ہی تھے جن کے پاس یہ مقدّس سرمایہ تھا۔ سنسکرت اور پھر ہندی ادب اپنی میتھولوجی کے ذریعہ ہی کلاسکل (CLASSICAL) ادب میں بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔

اردو ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ ایک عرصہ تک اس عظیم ہندوستانی ادبی سرمایے کو عام طور سے نظر انداز کیا جاتا رہا۔ لوگ ایرانی زُنّار کو گلے لگائے رہے مگر ہندوستانی جنیو کو انھوں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ ایرانی رستم کی دُہائی دی جاتی رہی مگر بھیم ناقابلِ اعتنا رہے، حالانکہ زنّار ہو یا رستم کسی کو ہندوستان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بہر حال! اُس دورِ ایران پرستی میں اردو زبان کے ہندو شعرا کا ہی یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی عظیم مذہبی مقدّس کتابوں کے ادب کو مثنویوں کی شکل میں پیش کر کے اردو زبان کی شاعری کو ہندوستانی بنایا اور ہندی دیومالا کی روایتیں اردو زبان و ادب میں داخل ہوئیں۔ ان روایتوں میں نہ صرف عشق و محبت کی رنگینیاں اور تزکیہ و تصوّف کی چاشنیاں ہی تھیں، بلکہ ان میں فکر و ادب کی گہرائیاں اور شعر و ادب کی بلندیاں بھی کارفرما تھیں۔ ثقافتی، تہذیبی اور ادبی، غرض ہر اعتبار سے ان مثنویوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان ہی مثنویوں نے ایرانیت نوازی کے بے پناہ سیلاب پر بند باندھا اور پارسی جذبات کے دھارے کا رخ ہندوستان کی طرف موڑا۔ ان ہی مثنویوں نے قومی یکجہتی اور وطنی ہم آہنگی کی فضا سازگار کی۔ ان ہی مثنویوں نے مسلمانوں کو یہ موقع دیا کہ وہ مردہ ادب کو زندہ زبان میں بہ آسانی ملاحظہ کریں اور ان ہی مثنویوں نے اس اخلاقی ذمہ داری اور انسانی برادری کا راستہ ہموار کیا کہ غیر ہندو، ہندو مذہب سے واقف ہو کر ہندو مذہب اور ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا حال معلوم

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کر کے ان کے احترام کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں۔

چونکہ اس حصۂ کتاب میں صرف ان ہی مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جو ہندو مذاہب کی اہم ترین کتابوں کے مثنوی کی صورت میں منظوم ترجموں کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ چند الفاظ "مذہب" کے سلسلہ میں لکھے جائیں۔

"مذہب" کا مطلب ہے راستہ، طریقہ، مت اور دھرم، میرے نزدیک "کمیونزم" بھی ایک مذہب ہے، مگر کمیونسٹوں کو "لامذہب" اور "دہریہ" کہا جاتا ہے۔ شاید صرف اس لئے کہ اس فلسفہ یا مشرب میں "خدا" کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ تمام اہلِ مذاہب، اس عہد کے بہت سے آئین و کیش کو مسلمہ طور پر مذہب کہتے ہیں، حالانکہ ان مذاہب میں بھی خدا کا تصور موجود نہیں ہے۔ مثلاً "جین مذہب" یا "بدھ مذہب"۔ ان مذاہب کے اصول و ضوابط کو دیکھ جائیے، کہیں بھی ان میں خدا کا تصور موجود نہیں ملے گا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اس کے باوجود "مذہب" کہلاتا ہے اور اس کے پیرو "ہندو" ہی سمجھے اور کہے جاتے ہیں۔ اور انہیں ہندوؤں نے اپنی جماعت سے خارج کرنے کا کبھی کوئی تصور بھی نہیں کیا۔ حد یہ ہے کہ جو ہندو کمیونسٹ ہو گیا ہے اسے بھی ہندو اپنے مذہب کے اندر ہی سمجھتے اور ہندو ہی کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کے یہاں، بات بات پر ذرہ ذرہ سے جزوی اور فروعی اختلاف پر مسلمانوں کو بزعم خود اسلام ہی سے خارج کر دینے کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ کاش مسلمانوں کے فرقے، قرآن نہ سہی، ہندوؤں ہی کی آپس کی اس عظیم فراخدلی و رواداری سے ہی کچھ سبق سیکھتے۔

اوپر کی تصریح سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں میں ایسے فرقے بھی ہیں جو خدا اور وید کو نہیں مانتے اور جو "ناستک" کہلاتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو خدا اور وید کو مانتے ہیں اور جو "آستک" کہلاتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو خدا اور وید تو کجا، سرے سے "مذہب" ہی کو لعنت سمجھتے اور کہتے ہیں۔ مگر وہ ہندو، اس بنیادی اختلاف کے باوجود ہمیشہ ہندو ہی رہتا ہے۔ وہ خود بھی ایسا ہی سمجھتا اور کہتا ہے اور دوسرے بھی اسے ہندو ہی کہتے اور سمجھتے ہیں اور یہ کہنا یا سمجھنا اس لئے نہیں ہوتا کہ "ہندوستان" کا ہونے کی وجہ سے وہ "ہندو"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے، بلکہ وہ خود اپنے کو اور دوسرے بھی اس کو "ہندو" اس لئے کہتے اور مانتے ہیں کہ وہ "ہندو مذہب" کا پیرو ہے۔ ایسی صورت میں لامحالہ یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ آخر "ہندو مذہب" کی صحیح تعریف کیا ہے؟ آخر اس مذہب کی بنیاد کس چیز پر قائم ہے؟

انگریز مورخ الفنسٹن (ELEPHINSTON) نے، جو کسی زمانہ میں بمبئی کے گورنر بھی رہ چکے تھے، اپنی کتاب "تاریخ ہند" میں لکھا ہے کہ:۔

"کمال تعجب ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے پاس، باوجودیکہ ان کی قوم، نہایت عمدہ شائستگی اور تربیت کے درجہ پر پہنچ گئی تھی، کوئی کتاب "تاریخ" تو کیا "تاریخ" سے ملتی جلتی ہونا بھی نہیں ہے، جس سے "ہندو مذہب" کو سمجھا جا سکے۔ جو کچھ موجود ہے وہ جھوٹی کہانیوں اور مبالغہ آمیز جھوٹے تاریخی واقعات سے اس طرح خلط ملط ہے کہ ان میں سے کوئی سچی بات نکلنے کی توقع نہیں ہو سکتی۔" (۱۰۵)

فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر لیبان (جو مستند سمجھے جاتے ہیں) اپنی کتاب "تمدن ہند" میں لکھتے ہیں:۔

"ان ہزارہا جلدوں میں، جو ہندوؤں نے اپنے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں، ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں ہے، چہ جائیکہ ان کے "مذہب" کو جاننے کے لئے کوئی مستند کتاب موجود ہو...... ان کی کتابوں کی خاصیت ہی عجیب ہے۔ یعنی ہر چیز کو غلط اور غیر فطری صورت میں دیکھنے کی خاصیت۔ اور یہ چیز انسان کو یہ خیال قائم کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان کا دماغ ہی ٹیڑھا ہے۔" (صفحہ ۱۴۴)

یہ غیر ملکی مصنفین ہیں، جن کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے ازراہِ تعصب ایسا لکھا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ خود ہندو اکابرین کی تحریریں بھی کچھ اسی نوعیت کی ہیں۔ بھائی پرمانند جی نے رسالہ "زمانہ" (کانپور) کے ستمبر اکتوبر نمبر ۱۹۱۴ء میں ایک مضمون "ہندو مذہب" پر لکھا تھا، اس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:۔

"جو کچھ حالات لکھے ہوئے ملتے ہیں وہ شاعرانہ مبالغہ سے بھرے ہوئے ہیں،

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جن کے اندر سے صحیح واقعات پر پہنچنا محال ہے۔"

ہندو مذہب کی سب سے اہم، سب سے قدیم، سب سے مستند اور سب سے مقدس کتاب "وید" کو سمجھا اور نہ صرف کہا جاتا ہے بلکہ ہندو مذہب کی بنیاد اُسی پر قائم ظاہر کی جاتی ہے۔ یہ "وید" چار ہیں۔ "رگوید"۔ "سام وید"۔ "یجروید" اور "اتھروید"۔ ان "ویدوں" کا زمانہ تصنیف متعین نہیں ہو سکا ہے۔ مسٹر بال گنگا دھر تلک نے اس کا زمانہ تصنیف سنہ ۴۰۰۰ قبل مسیح بتایا ہے۔ مسٹر ہاگ (HAUG) کی تحقیق سنہ ۲۴۰۰ قبل مسیح کی ہے۔ اور پروفیسر میکس مولر (MAX MULLER) نے سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح کہا ہے۔ ان "ویدوں" میں "رگ وید" سب سے اہم اور بنیادی کتاب مانی جاتی ہے۔ مسٹر داس گپتا کی تحقیق یہ ہے کہ:۔

"رگ وید کے منتر نہ تو کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں نہ کسی ایک زمانہ کی۔ یہ منتر مختلف زمانوں میں مختلف رشیوں نے تصنیف کئے ہیں۔ اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان میں سے بعض منتر آریوں نے ہندوستان میں آنے سے پیشتر تصنیف کئے ہوں۔ یہ منتر تمام سینہ بہ سینہ چلے آتے تھے اور ہر زمانہ کے شاعر، اُن میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔ غالباً یہ مجموعہ بہت ہو گیا تو اسے موجودہ شکل میں مدوّن کیا گیا۔"

مسٹر سریندر گپتا نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ فلسفۂ ہندوستان" میں صفحہ ۱۲ پر فرمایا ہے۔

"وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں بلکہ یہ نام ہے تقریباً دو ہزار سال کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا۔ چونکہ یہ لٹریچر مُظہر ہے اُس علمی تگ و تاز کے ماحصل کا جو ہندوستان کے رہنے والوں نے مختلف اطراف و جوانب میں اس قدر طویل عرصہ میں جمع کیا تھا، اس لئے لازماً اسے متضاد عناصر کا مجموعہ ہونا ہی چاہیے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "تلاشِ ہند" (THE DISCOVERY OF INDIA) کے صفحہ ۸۷ پر لکھا ہے:۔

"بہت سے ہندو "ویدوں" کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ میرے نزدیک

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہماری بدقسمتی ہے کیونکہ اس طرح اُن کی حقیقت ہم سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ ویدیں صرف اُس زمانہ کی معلومات کا مجموعہ ہیں۔ وہ بہت سی چیزوں کا غیر مرتب شدہ ذخیرہ ہیں۔ دعائیں، قربانی کی رسومات۔ جادو۔ نیچرل شاعری وغیرہ وغیرہ۔"

مسٹر گووند داس نے "ہندوازم" (صفحہ ۶۵) میں لکھا ہے:-

"ویدوں پر ایمان رکھنا ضروری بھی نہیں ہے۔ "گیتا" خود بڑی سختی سے ویدوں کی تکذیب کرتی ہے۔ "چارواک" بڑے شد و مد سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں مسخروں اور رنگین طبع لوگوں کی تصانیف قرار دیتے ہیں۔"

مسٹر گووند داس نے اپنی کتاب "ہندوازم" میں کافی بحث کی ہے۔ اس کے صفحہ نمبر ۱۸۶ پر لکھا ہے:—

"اُن تمام لوگوں کو جو آج یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا "ہندو مذہب" وہی ہے جو ویدوں کے زمانے میں تھا اور جو ناقابلِ تغیر و تبدّل ہے، ان حقائق پر غور کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو تاریخ کا اس طرح بطلان کرتے ہیں اور اُن مسلسل تغیرات سے چشم پوشی کرتے ہیں، سخت غلطی میں ہیں۔ اور اپنے آپ کو اور خود ہندوستان کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ویدوں کی ازلیت اور تقدّس کا عقیدہ، کسی ایسے شخص کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جس کی نگاہ تاریخ پر ہو۔ یہ بالکل باطل عقاید ہیں، ہر اُس شخص کے نزدیک جس نے ویدوں کا مطالعہ کیا ہو۔ اُن کے بیشمار باہمی تضادات، اُن کے اکثر و بیشتر مہملات، اُن کے مضحکہ خیز بیانات اور فحش نگارشات، بجا طور پر سخت تنقید کا موجب بنا ہوئی ہیں۔ جینی، سکھ اور کئی فرقے اُن کی تردید کرتے ہیں۔ "ہندوازم" ویدوں کی تصانیف سے بھی پہلے سے موجود تھا۔ اُس کی نشو و نما بھی ویدوں سے منسلک نہیں ہے۔"

"ویدوں کے بعد "رامائن" کا نمبر آتا ہے جس میں رام جی کے حالات بیان ہوئے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیں۔ اس کے بارے میں پنڈت لیکھ رام نے لکھا ہے کہ وہ آٹھ لاکھ برس پرانی کتاب ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر (HUNTER) کی تحقیق ہے کہ اس کا زمانہ تصنیف سنہ قبل مسیح ہے۔ مسٹر گووند داس نے اپنی کتاب میں اس کو ۳ سنہ قبل مسیح کی لکھی ہوئی ظاہر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ :۔

"اس میں پہلا اور ساتواں باب والمیکی کا نہیں بلکہ بہت بعد کا اضافہ ہے اور باقی متن کی بھی حالت یہ ہے کہ اس میں بہت ردو بدل ہو چکا ہے۔"

صاحب موصوف نے یہ بھی فرمایا ہے کہ :۔

"یہ بھی یاد رہے کہ یہ محض شاعری ہے، تاریخ نہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا ہے کہ :۔

"یہ کتاب سیکڑوں برس کے عرصہ میں جاکر موجودہ شکل میں متشکل ہوئی ہے اور اس کے بعد بھی اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔"

یعنی رام جی کی خود ذات ہی مشکوک ہے۔ ابھی حال میں مشہور مورخ و محقق ڈاکٹر ایچ۔ ڈی سنکلیا کی، جو ماہر آثار قدیمہ کی حیثیت سے بھی اپنا ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں، ایک کتاب "رامائن ایک خرافات یا حقیقت" (Ramaya a Myth or Reality) کے نام سے شائع ہوئی ہے جو بہت مشہور اور غور طلب ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ رامائن کا سارا مواد مفروضات پر مبنی ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک بذاتہ رام جی کا وجود ہی مشکوک ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں ایک اور مورخ شری اربندو کا بھی حوالہ دیا ہے، جنھوں نے کہا ہے کہ تاریخی حیثیت سے ایسا یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ واقعی رام جی کی کوئی شخصیت بھی تھی۔ سنکلیا صاحب نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی فرمایا ہے کہ رام کی ذات یوں بھی مشکوک ہے کہ وہ کسی طرح بھی اور کبھی بھی دنڈکا جنگل کو عبور نہیں کر سکتے تھے۔

فروری ۱۹۷۶ء کے پہلے ہفتہ میں بھوپال میں، رامائن اور مہابھارت کی تاریخی حیثیت پر ایک سمپوزیم اور سیمینار منعقد ہوا، جس کا افتتاح ڈاکٹر ایچ۔ ڈی سنکلیا نے کیا۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں قدیم اور مشہور روایت کی سختی سے تردید کی اور لکھا کہ رامائن اور مہابھارت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کو صرف ایک رزمیہ شاعری سمجھنا چاہیئے - یہ تاریخی واقعہ ہرگز نہیں ہے - ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ راون کی جس لنکا کا ذکر رامائن میں ہوا ہے، وہ ہرگز جنوبی ہند میں نہ تھا اور موجودہ لنکا سے اس کا کوئی تعلق نہیں - یہ لنکا، جس کا نام اس کتاب میں آیا ہے، یہیں اڑیسہ، مدھیہ پردیش یا آندھرا پردیش میں کہیں تھا - انھوں نے فرمایا کہ میں اس لنکا کی تلاش و جستجو میں ہمہ تن مصروف ہوں اور جن صاحب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو، وہ محنت کے ساتھ تلاش و تحقیق کریں - ڈاکٹر سنکلیا نے جنگ رامائن اور مہابھارت کو بالکل بے بنیاد بتایا ہے اور کہا ہے کہ نہ تو ہرگز ارجن نے گانڈیو کا استعمال کیا - نہ راجہ رام چندر جی نے کوئی دھنش توڑا اور نہ راون نے کسی سیتا جی کو بھگایا اور اپنی رتھ پر بٹھا کے لنکا لے گیا - یہ سب شاعروں کی بلند پروازئ تخیل کے سوا کچھ بھی نہیں ہے - ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی فرمانا ہے کہ رامائن اور مہابھارت کی جنگوں میں جن اسلحہ جات کا ذکر ہے، وہ ہرگز اس عہد میں رواج نہیں پائے اور موجود نہیں تھے - اُن کا کہنا ہے کہ مغربی ایشیا اور افریقہ میں، انسانی تہذیب ترقی کی جس منزل پر تھی اور انھوں نے جو اسلحے ایجاد کیے تھے، اُس اعتبار سے ہندوستان بہت پچھڑا ہوا تھا - بقول ڈاکٹر سنکلیا، ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا متفقہ تحقیقی فیصلہ ہے کہ رامائن اور مہابھارت کی جنگوں میں استعمال کیے گئے جن اسلحوں کا ذکر ملتا ہے وہ قطعاً فرضی اور خیالی ہیں -

شاید یہی وجہ ہے کہ مسلمان، ہندوستان میں پیغمبروں کی آمد کو تو مانتے ہیں، مگر نام کی تخصیص کے ساتھ رام جی کی تخصیص نہیں کرتے -

"مہابھارت" ویاس جی کی تصنیف بتائی جاتی ہے - اس کتاب کے بارے میں مسٹر گوونددا س نے لکھا ہے کہ:-

"اس میں بیشمار اختلافات ہیں - تین مختلف مرتّب شدہ کتابوں کا ذکر تو خود مہابھارت کے اندر موجود ہے" (صفحہ ۱۴۱)

پنڈت جواہر لال نے لکھا ہے کہ:-

"رامائن اور مہابھارت کا زمانۂ تصنیف متعین کرنا مشکل ہے - ....

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بہت سے مصنّفوں نے لکھا اور بعد میں
بہت سے زمانوں میں اضافے ہوتے رہے "

گاندھی جی نے مہابھارت کی جنگ ہی سے انکار کیا ہے - انھوں نے اپنے اخبار "ہریجن"
مورخہ ۱۴ / ۱۹۴۶ ء میں لکھا ہے کہ :-

" میرے خیال میں مہابھارت "حقیقت" نہیں بلکہ ایک "تمثیل" ہے -
یہ "تاریخ" نہیں ہے - دروپدی کے پانچ خاوندوں سے مراد روح کا
حواسِ خمسہ کے ساتھ تمسک ہے "

مہابھارت کے بعض نسخوں میں دس ہزار شعر ملتے ہیں - بعض میں ۳۵ ہزار، بعض میں ۶۵ ہزار
اور بعض میں اس سے بھی زیادہ اشعار پائے جاتے ہیں - غرض اس کے متعلق بھی مورخین اور
محققین حد درجہ مشکوک ہیں اور کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے -

"گیتا" مہابھارت کتاب کے چھٹے باب کا ایک حصہ ہے - اور مجموعہ ہے اُن نصائح
کا جو شری کرشن جی کی زبان سے ادا ہوئے ہیں یا اُن سے منسوب کئے جاتے ہیں - ڈاکٹر داس
گیتا کی تحقیق کے مطابق اس کا شری کرشن جی کی طرف انتساب بالکل غلط ہے - وہ کہتے ہیں کہ :-

" اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان تربیتِ نفس کرنے کے بعد بالآخر
ذاتِ الٰہی میں واصل ہو جائے "

پنڈت جواہر لال نہرو کا کہنا ہے کہ :-

" یہ عجیب و غریب اور مجموعہ اضداد کتاب ہے - آج ہر فلسفہ اور ہر فکر
کے مختلف مدعی گیتا ہی کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور ہر
ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق اس کی تفسیر کر رہا ہے - اگر گاندھی جی
اپنے عقیدہ "اہنسا" کی بنیاد گیتا پر رکھتے ہیں تو ایسے لوگ بھی موجود
ہیں "ہنسا" اور "جنگ" کا جواز بھی گیتا ہی سے ثابت کرتے ہیں "

بہر حال ! ان تمام تصریحات سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ "ہندو مذہب" کی کوئی بھی تعریف
کرنا مشکل ہے اور ہندو مذہب کی جو مشہور کتابیں موجود ہیں ان سے اس حقیقت کا پتہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ :-

"اہلِ چین، اہلِ یونان اور اہلِ عرب کے خلاف، قدیم ہندوستان کے لوگ مورّخ نہیں تھے، یہ ہماری بدقسمتی ہے اور اسی نے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ ہم گذشتہ عہد کے واقعات کا زمانہ یا تاریخ متعیّن کر سکیں۔ یہ واقعات کچھ اس طرح باہم گتھم گتھا ہو رہے ہیں کہ ان سے عجب خلفشار پیدا ہو جاتا ہے۔"

مسٹر گوبند داس نے اپنی کتاب "ہندوازم" میں فرمایا ہے کہ :-

"ہندو دھرم کی کوئی تعریف (DEFINATION) ممکن ہی نہیں ہے اس لیے کہ اس کی حدود ہی متعیّن نہیں ہیں۔ یہ باب دراصل تو علم الانسان سے متعلق تھا جسے بدقسمتی سے "مذہب" کا نام دے دیا گیا۔ ویدوں سے شروع ہو کر اور چند ایک قبائل کے رسم و رواج کو اپنے آغوش میں لے کر یہ آگے بڑھا اور ایک برف کے گولے کی طرح مختلف زمانوں میں لڑھکتے لڑھکتے اپنے حجم میں بڑھتا چلا گیا اور جس جس قوم اور قبیلہ سے یہ متمسک ہوا اس کے رسوم اور تخیلات کو اپنے اندر جذب کرتا گیا۔ حتیٰ کہ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری ہے۔" (صفحہ ۲۵)

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری (میری کہانی جلد ۲ صفحہ ۳۰۲) میں لکھا ہے :-

"ہندو مت پر صحیح معنوں میں "مذہب" کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت بڑی سخت ہے ..... ایک شخص کھلّم کھلا خدا کا منکر ہو، جیسے قدیم ہندو فلسفی چارواک تھے، لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص "ہندو" نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہو گئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندو مت اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن کے گھر میں پیدا ہوا اس لئے "برہمن" ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پنڈت جی نے اپنی دوسری کتاب "تلاشِ ہند" میں لکھا ہے :۔

" ہندوازم " بحیثیت ایک عقیدہ کے بالکل مبہم، غیر متعین، بہت سے گوشوں والا واقع ہوا ہے ...... اس کی تعریف کرنا یا (DEFINATION) بتانا ناممکن ہی نہیں ہے - حتیٰ کہ حتمی اور یقینی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی " مذہب " ہے بھی یا نہیں ؟ " (صفحہ ۵۳)

پنڈت سندر لال نے " گیتا اور قرآن " کے نام سے ایک عمدہ کتاب لکھی ہے جس کا سب سے پہلا عنوان ہے کہ :۔

" دنیا کے سب مذہب " ایک ہیں "

اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں انھوں نے فرمایا ہے کہ :۔

" مذہب " لفظ کے معنی راستہ ہے - جو راستہ سب کی بھلائی کا راستہ ہے وہی " مذہب " ہے - قرآن میں لکھا ہے کہ " سچ مچ تم سب انسانوں کی ایک ہی قوم ہو اور ایک ہی اللہ تم سب کا رب ہے - اس لئے اسی ایک کی پوجا کرو ۔ ۔ ۔ " (انبیاء - ۹۲)

اس کے بعد ایک جگہ پنڈت جی نے فرمایا ہے کہ :۔

" اس وقت ساری دنیا میں سیکڑوں چھوٹے بڑے فرقے، دھرم، مذہب پنتھ اور مت موجود ہیں - ان سب میں سات خاص مانے جاتے ہیں -
ہندو دھرم[۱]، یہودی دھرم[۲]، زرتشتی یعنی پارسی دھرم[۳]، بودھ دھرم[۴]، [۵]
عیسائی دھرم[۶] اور اسلام - ان میں جہاں تک پتہ چلتا ہے، " ہندو دھرم "
سب سے پرانا اور " اسلام " سب سے حال کا ہے "

یعنی پنڈت جی نے دنیا کے تمام بڑے " مذاہب " میں سے ایک مذہب " ہندو دھرم " اور دوسرا مذہب " اسلام " کو ظاہر کیا ہے - سطور ما قبل میں آپ بڑے بڑے ہندو مصنفین اور ماہرین کا خیال پڑھ اور جان چکے ہیں کہ " ہندو دھرم " کو لوگوں نے " مذہب " مانا ہی نہیں ہے - لطف یہ ہے کہ اسلام بھی " مذہب " نہیں ہے - اگرچہ لفظ " مذہب " عربی زبان کا لفظ ہے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مگر قرآن مجید میں کسی جگہ بھی "اسلام" کے لئے "مذہب" کا لفظ نہیں آیا ہے، بلکہ اسلام کو "دین" کہا گیا ہے۔ "مذہب" کا مطلب ہوتا ہے "RELIGION" اور "دین" کا مطلب ہے قانون (LAW) یا فیصلہ (JUDGEMENT)۔ قرآن حکیم نے "اسلام" کو "مذہب" نہیں بلکہ "دین" کہا ہے:۔

(۱) "بلاشبہ اللہ کے نزدیک اسلام "دین" ہے" (آل عمران ۲ ۳/۱۹)

(۲) "جو شخص "دین" اسلام کے سوا، کسی اور کو طلب کرے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا" (ال عمران ۹ ۳/۸۲)

"دین" اور "مذہب" ایک چیز نہیں۔ دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ "دین" چوبیس گھنٹہ کی پوری زندگی پر احتساب کرتا ہے وہ پیدائش سے موت تک ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ روز مرہ کا کوئی کام اور زندگی کا کوئی لمحہ "دین" کے اختیار اور حدود سے باہر نہیں۔ مگر "مذہب" چند رسوم و وظائف کی ادائیگی کے بعد حیاتِ بشری کو آزادی دیتا ہے اور اس پر کوئی کنٹرول نہیں رکھتا۔ لہذا "اسلام" کو "مذہب" سمجھنا اور کہنا صحیح نہیں ہوگا۔

خود مسلمانوں کے یہاں فقہا کی اصطلاح میں "مذہب" سے مراد "دین اسلام" نہیں بلکہ وہ چاروں فقہی مسلک اور فرقے یا طریقے ہیں جو "حنبلی مذہب"، "شافعی مذہب"، "مالکی مذہب" اور "حنفی مذہب" کے نام سے موسوم و مشہور ہیں اور جن کے ماننے والوں کو "مقلد" (FOLLOWER) کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام مقلد مسلمان، اُن لوگوں کو "لامذہب" کہتے ہیں جو ان چاروں مذاہب میں سے کسی ایک کو بھی نہیں مانتے۔ اور ان چاروں اماموں میں سے کسی کی تقلید کے پابند نہیں ہوتے۔ جیسے فرقۂ اہلِ حدیث یا وہابی۔

قرآن حمید میں سورۂ انبیاء کے اندر جو سب انسانوں کو ایک ظاہر کیا گیا ہے اور جس کو پنڈت سندر لال نے بطور ثبوت پیش کیا ہے وہ ایکائی، بر بنائے "مذہب" یا "قومیت" نہیں، بلکہ بر بنائے "انسانیت" برابر گردانی گئی ہے۔ اسی لئے وہاں "اُمّت" کا لفظ لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت سے سارے انسان برابر ہیں۔ اسی مفہوم کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے:۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"اے بنی نوعِ انسان! ہم نے تم سب کو ایک ہی طرح مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہارے مختلف قبیلے اور گروہ جو بنائے ہیں وہ اس لیے ہیں کہ تم لوگ آپس میں اس طرح ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اور اللہ کے نزدیک تو وہی اچھا اور قابلِ عزت سمجھا جائے گا جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوگا۔" (حجرات ۲ - ۴۹/۱۳)

پنڈت سندر لال نے یہ بھی صحیح نہیں لکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سب انسانوں کو ایک ہی "قوم" فرمایا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے نہ تو ایسا کہا ہے اور نہ وہ ایسا کہہ سکتا تھا جبکہ ساری دنیا کے انسان مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ قرآن شریف میں "قوم" کا لفظ ایک مسلک اور طریقہ رکھنے والوں کے لیے آیا ہے۔ مثلاً "قَوْمَ الْفَاسِقِیْن (۵/۲۶) قَوْمَ الظّٰلِمِیْن (۶/۶۸) قَوْمٌ الْخٰسِرُوْنَ (۷/۹۹) قَوْمًا کٰفِرِیْنَ (۹/۶۶) قَوْمًا عَمِیْنَ (۷/۶۴) قَوْمٌ مُسْرِفُوْنَ (۷/۸۱) قَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۳۰/۲۱) قَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ (۳۰/۲۳) قَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۳۰/۲۴) وغیرہ — یا پھر اُن پیغمبروں کے نام کے ساتھ لفظ "قوم" استعمال ہوا ہے جن میں وہ مبعوث ہوئے تھے۔ مثلاً نوح علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ:۔

"ہم نے نوح کو بھیجا اس کی قوم کی طرف۔" (اعراف ۸ - ۷/۵۹)

یا حضرت ہود علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ:۔

"اے میری قوم! میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔" (ہود ۵ - ۱۱/۵۱)

یا حضرت صالح علیہ السلام کے بیان میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ:۔

"اے میری قوم! اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے رحمت عطا کی ہو اور اس کا کہنا نہ مانوں تو اس سے کون مجھے بچائے گا؟" (ہود ۶ - ۱۱/۶۳)

یا حضرت لوط علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ:۔

"اور اُن کی قوم اُن کے پاس دوڑتی ہوئی آئی۔" (ہود ۷ - ۱۱/۷۸)

بہرکیف! دنیا کے سارے انسان ایک "قوم" نہیں ہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے سارے انسان

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مختلف قوموں کی صورت میں، بقول قرآن عظیم، اس لئے تقسیم کئے گئے ہیں کہ ان کی شناخت ہو سکے :-

"اے بنی نوع انسان! ہم نے تم سب کو، ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف قومیں اس لئے بنایا ہے کہ تم لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک وہی معزز قرار پائے گا جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو گا" (الحجرات ۲ - ۴۹/۱۳)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اسلام اور ہندو مذہب میں پیغمبر کا تصور

انسان کی فطرت ہو یا کائنات کی دوسری تمام اشیاء کی، بظاہر وہ "خیر" اور "شر" دو کیفیتوں کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ مگر حقیقتاً فطرت، چاہے وہ انسان کی ہو یا دوسری کسی اور شے کی، بجائے خود نہ "خیر" ہے نہ "شر"۔ بلکہ جب تک وہ شے اعتدال و توازن کے اندر رہتی ہے، "خیر" رہتی ہے اور جب اعتدال و توازن کھو بیٹھتی ہے تو "شر" بن جاتی ہے۔ مثلاً پانی کو لیجئے۔ وہ فطرتاً نہ خیر ہے نہ شر۔ جب تک وہ اعتدال و توازن کے اندر رہتا ہے تو وہ خیر ہے، ورنہ شر بن جاتا ہے۔ ایک گلاس پانی پیجئے تو وہ خیر ہے، حیات افزا ہے۔ اور ایک بالٹی پیجئے تو وہ شر بن جائے گا۔ جان لیوا مرض ثابت ہوگا۔ دریا کا پانی جب تک اعتدال و توازن کے اندر رہتا ہے، خیر رہتا ہے۔ اس سے آب پاشی ہوتی ہے۔ جہاز اور کشتی کے ذریعہ رسل و رسائل کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جب وہی پانی اعتدال و توازن کھو بیٹھتا ہے تو شر ہو جاتا ہے۔ سیلاب کے ذریعہ ہلاکت و بربادی لاتا ہے۔ کشتیاں اور جہاز ڈبو دیتا ہے۔ یہی حال فطرت کا ہے۔ وہ جب تک معتدل اور متوازن رہتی ہے "خیر" ہوتی ہے اور جب اعتدال و توازن کھو بیٹھتی ہے تو "شر" بن جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس اعتدال و توازن کو بتانے اور قائم کرنے والا بھی کوئی ہونا ضروری ہے۔

قدرت کی جانب سے، یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے، کائنات کی ساری ذی حیات مخلوق، اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک راہِ عمل بھی لے کر آئی ہے۔ آپ آفاقی کائنات (OUTER UNIVERSE) میں غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ "انسان" کے سوا ساری مخلوقِ خداوندی کے لئے۔ قدرت کی طرف سے ایک اُصول (PRINCIPLE) مقرر ہے۔ اور وہ اُصول اُس کی فطرت (NATURE) کے اندر ودیعت کر دیا گیا ہے جس کی پابندی، بلا کسی رہنمائی کے از خود ہوتی ہے۔ زمین کی گردش کا جو اُصول

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بنا دیا گیا ہے اُس اصول پر وہ از خود گردش کر رہی ہے، اُس کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کب اور کیسے چلے؟ چاند مقررّہ اصول پر از خود چمکتا ہے۔ جانور بلا کہے کے بتائے بچے پیدا کرتے اور اُن کی پرورش کرتے ہیں۔ پرندے، خود اپنے آپ اپنے فرائضِ حیات ادا کر رہے ہیں۔ کوئی انہیں بتاتا نہیں کہ وہ یوں کریں اور یوں نہیں؟

"انسان"، چونکہ حیوانِ ناطق اور اشرف المخلوقات ہے، اس لیے دیگر تمام مخلوقات کی طرح، اُس کی فطرت کے اندر کوئی اُصولِ حیات ودیعت کر کے اُسے پابند اور مجبور نہیں بنایا گیا کہ وہ مقررّہ آئین سے بال برابر ادھر یا اُدھر نہ ہو۔ جس حد تک انسان کی زندگی کی حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) کا تعلق ہے، وہاں وہی طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) جبلّی طور پر (BY INSTINCT) کارفرما ہیں جو دوسرے حیوانات میں کارفرما ہیں۔ مثلاً بھوک لگے تو کھانا کھانا۔ پیاس لگے تو پانی پینا، کیونکہ وہ بھی مخلوق کے اندر ہے۔ لیکن جہاں تک اُس کی زندگی کی انسانی سطح (HUMAN LEVEL) کا سروکار ہے، اُس کی فطرت میں کوئی اُصولِ حیات اور قوانینِ زندگی منجانب اللہ ودیعت نہیں کئے گئے جن کی پابندی از خود فطرتاً (BY NATURE) ہوتی جائے، بلکہ اُس کو زندگی کے غیر متبدّل اُصول (UNCHANGEABLE PRINCIPLES) دینے کا ذریعہ دوسرا اختیار کیا گیا۔ وہ ذریعہ یہ تھا کہ جہاں، جس سرزمین پر اور جس قوم کو وہ غیر متبدّل اصول دینا اللہ تعالےٰ کو منظور ہوتا تھا وہاں انسانوں ہی میں سے بعض کو چُن لیا جاتا تھا اور اُسے اُن محکم اصولوں کا علم دے دیا جاتا تھا۔ ایسے انسانوں کو "نبی" اور اُس ذریعۂ علم کو "وحی" کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ علم، جو بصورت "وحی" اُس برگزیدہ انسان کو ملتا تھا، صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کے دوسرے بندوں تک پہنچانے کے لئے ملتا تھا، اس لئے اُس کو "رسول" یعنی "پیغمبر" اور "پہنچانے والا" بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ وحی ایسی چیز نہیں جو اُس برگزیدہ انسان کے علاوہ دوسروں کی نگاہ کے سامنے ہو، اس لئے جس برگزیدہ انسان کو یہ علم بذریعہ وحی عطا ہوتا تھا، وہ اسے قلمبند کر لیتا تھا۔ اُسی کو "کتاب" کہتے ہیں۔ یہ طریقۂ ہدایت و رہنمائی اُس وقت تک قائم اور باقی رکھا گیا، جب تک "انسانیت" عہدِ طفولیت یا دورِ PREMATURE

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

رہی ۔ بچے کو اُسی وقت تک ہاتھ پکڑ کے چلایا جاتا ہے جب تک وہ اپنے کمزور پاؤں پر از خود کھڑا نہیں ہو پاتا ہے۔ انسانیت بھی جب تک عہدِ طفولیت میں تھی، ہر جگہ کی آبادی کوئیں کے مینڈک کی طرح ساری دنیا سے بے خبر ایک مخصوص خطۂ ارض میں محدود تھی، اُس وقت تک ہر جگہ ایسے رہنما، پیغمبر اور نبی آیا کئے، اور یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔ جب انسانیت اس اسٹیج سے گذر گئی تو یہ ہاتھ پکڑ کے چلانے والا طریقہ بند کر دیا گیا اور سلسلۂ "نبوت" محمد عربی یعنی پیغمبرِ اسلام پر ختم ہو گیا۔ اسی لئے اُن کو "آخری پیغمبر" اور اُن کے لائے ہوئے احکامات کے مجموعہ قرآن مجید کو "آخری کتاب" مانا اور کہا جاتا ہے۔

ہر چند کہ دوسرے مذہب والوں کے یہاں "ختم نبوت" کا تصور موجود نہیں ہے، لہٰذا اسلام کے ختم نبوت کے تصور کو ماننے پر وہ مجبور نہیں ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آنحضرت کی بعثت کے بعد سے، اب تک کسی مذہب والے نے اپنے یہاں کسی "پیغمبر" کے مبعوث ہونے کا نہ تو کبھی اعلان کیا ہے اور نہ وہ اس کا تصور رکھتے ہیں۔ اور اگر کوئی اپنے کو منوانے کے لئے، پیغمبری پر تلنے پر نظر آتا ہے، تو لوگ اُس کی تکذیب و تردید کرتے اور اُسے بر سرِ عام جھٹلا دیتے ہیں۔

غرض، انسان کو، زندگی کے جو اُصول اور حیات کے جو قوانین پہلے ملا کرتے تھے، اُس کا دستور اسلامی عقیدہ کے مطابق یہ تھا کہ ہر حلقۂ زمین اور ہر ملک و قوم میں سے بعض برگزیدہ انسان کو منتخب کر کے وہ اُصول اُس کو بذریعہ وحی عطا کر دیئے جاتے تھے جسے وہ کتابی صورت میں منضبط اور مدوّن کر کے لوگوں تک پہنچا دیتا تھا اور ان قوانین پر عمل کر کے اپنے پیروؤں کو دکھلا دیتا تھا کہ یہ قوانین و ضوابط "عملی" ہیں، محض "تصوراتی" نہیں۔ ایسا اُس وقت ہر جگہ ہوتا تھا جب انسان اعتدال و توازن کھو کر "خیر" کے بجائے "شر" بن جاتا تھا۔ ان برگزیدہ انسانوں کو مسلمان ہادی، رہنما اور پیغمبر کہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کو "نبی" اور "رسول" کے نام سے یاد کیا ہے۔ "نبی" اس لئے کہ وہ اللہ تعالےٰ کا پیغام وصول (RECEIVE) کرتا تھا۔ اور "رسول" اس لئے کہ وہ اس پیغام کو تمام پھیلاتا اور خدا کے بندوں تک پہنچایا (DISBURSE) کرتا تھا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"ہندو مذہب" کے تین اسکول ہیں - ایک "یوگ" یا "سادھنا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - اس اسکول میں "اللہ" کا تصور تقریباً وہی ہے جو مسلمانوں کا ہے - یعنی خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں - وہ نہ تو دیکھا جاسکتا ہے اور نہ اس کی صفات کا احاطہ کیا جاسکتا ہے - وہی اس عظیم کائنات کا خالق، مالک، نگراں اور پالنہار ہے - وہ سب سے بڑی طاقت ہے - اسی کی حکم روح اور آتما کے نام سے ہمارے جسموں میں کارفرما ہے - وہ ہر انسان کے ایمان و عمل سے باخبر ہے - وغیرہ وغیرہ - دوسرا اسکول وہ ہے جو "درشن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - یہ دراصل فلسفیوں اور صاحب علموں کا مذہب ہے - یہاں ہر چیز علم اور عقل سے طے کی جاتی ہے اُن کی دانست میں الہامی کتابیں، انسانی تصانیف ہیں -

تیسرا اسکول شاعروں اور قصہ گویوں وغیرہ کا ہے - یہ اسکول نادیدہ خدائے واحد کا قائل نہیں بلکہ وہ خدا کے محسوس مظاہر کا ماننے والا ہے - اس تیسرے اسکول کا تصور یہ ہے کہ جب دنیا برائیوں اور خرابیوں سے بھر جاتی ہے رعقل انسانی اعتدال و توازن کے اصول کو فراموش کر دیتی ہے، تو خدا ایک اعلیٰ پیکر انسانی میں، اس طرح زمین پر نمودار ہوتا ہے کہ اُس کی اعلیٰ صورت بھی مفقود نہیں ہوتی اور مجسم صورت بھی ظاہر ہوتی ہے - وہ جسم بشری میں اُترا ہوا خدا یا انسانی روپ دھارا ہوا بھگوان ہوتا ہے -

اس طور پر مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کو کسی سرزمین کے لوگوں کی اصلاح و درستگی منظور ہوتی تھی تو وہ وہاں کے انسانوں میں سے سب سے بہتر انسان کو چن کر اپنا "پیغامبر" بناتا تھا اور اپنے احکام اُس پر نازل کرتا تھا اور وہ اُن ہی احکام پر خود چلتا تھا اور لوگوں کو چلانے کی کوشش کرتا تھا - تاآنکہ یہ سلسلہ پیغمبر اسلام پر ختم ہوگیا - اب کوئی نبی نہیں آئے گا اور قرآن حکیم قیامت تک لوگوں کی رہنمائی کرتا رہے گا - ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب انسانوں کی اصلاح اللہ تعالے کو منظور ہوتی تھی تو وہ اُس علاقہ کے سب سے اچھے انسان کے پیکر میں خود ظاہر ہوتا تھا اور وہ لوگوں کی رہنمائی کرتا تھا - اس طرح ہندوستان کے جو بھی ہادی و رہنما بنے وہ انسان ہوتے ہوئے بھگوان تھے -

---

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شری رام چندر جی

قرآن حمید میں متعدد جگہ، بار بار اور اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے کہ ہر قوم اور ہر خطۂ زمین پر پیغمبر آتے رہے اور کوئی جگہ یا کوئی جماعت ایسی نہیں جہاں، جس میں، کوئی ہادی اور پیغمبر نہ آیا ہو :-

(۱) " اور ہر اُمّت کے لئے پیغام الٰہی دینے والا ضرور آیا ہے " (یونس ۵ ۱۰/۴۷)

(۲) " اور ہر قوم میں ایک راستہ بتلانے والا آیا ہے " (رعد ۱۳/۷)

(۳) " اور کوئی جماعت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانیوالا نہ آیا ہو " (فاطر ۳۵/۲۴)

(۴) " ہم ہر قوم میں کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور بھیجتے رہے ہیں " (نحل ۵ - ۱۶/۳۶)

(۵) " اللہ کی قسم، ہم نے تم سے پہلے جتنی اُمّتیں ہوئی ہیں اُن سب کے پاس رسولوں کو بھیجا ہے " (نحل ۱۶ - ۱۶/۶۳)

لہٰذا ہندوستان میں بھی ضرور پیغمبر آئے۔ قرآن حکیم میں جتنے پیغمبروں کا نام کے ساتھ ذکر ہے وہ صرف مشرقِ وسطیٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن عظیم کے اوّلین مخاطب اہلِ عرب اور آلِ اسمٰعیلؑ تھے۔ اور آلِ اسحٰق مشرقِ وسطیٰ میں تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰق دونوں حقیقی بھائی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اہلِ عرب صرف ان ہی سے واقف تھے۔ دوسری قوموں کی اُن کو اطلاع نہ تھی۔ لہٰذا عربوں سے صرف ان ہی نبیوں کا نام کے ساتھ ذکر کیا گیا جو اُن کی قوم کے تھے اور جن سے وہ واقف تھے۔ اس لئے دوسری قوموں اور سرزمینوں پر جو پیغمبر آیا کئے اُن کا نام قرآن مجید میں مذکور نہیں، بلکہ صرف اجمالاً ذکر کیا گیا ہے کہ ہر قوم اور ہر سرزمین پر نبی اور پیغمبر آیا کئے ہیں۔

تاریخِ ہند قدیم میں جتنے لوگوں کا ذکر ملتا ہے، اُن میں سے شری رام چندر جی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کا جو کردار پیش ہوا ہے، اس سے روایتی اور اعتقادی حشو و زوائد کو نکال دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے، اس کا تجزیہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شری رام چندر جی ہندوستان کے پیغمبروں میں سے ایک ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ "راجہ" تھے مگر پیغمبری "فرمانروائی" نہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام "پیغمبر" بھی تھے اور حکمراں بھی۔ ہندو بھی شری رام چندر جی کو بھگوان کا اوتار ہی قرار دیتے ہیں۔

شری رام چندر جی، اجودھیا کے سب سے معزز خاندان اور حکمراں راجہ دشرتھ کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ پیغمبروں کے جس قدر حالات معلوم ہوتے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی قوم کے معزز قبیلہ اور معتبر خاندان میں ہی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ دشرتھ نے اولاد کی تمنا میں یکے بعد دیگرے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی رانی "کوشلیا" دوسری رانی "کیکئی" اور تیسری رانی "سمترا" تھیں۔ مگر کسی سے بھی اُن کو کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی۔ تاآنکہ راجہ دشرتھ کا بڑھاپا آگیا۔ اور وہ اولاد کی پیدائش سے ناامید ہو گئے۔ آخر میں کسی رشی کے مشورہ سے انھوں نے اپنے عہد کے مروجہ مذہبی طریقے پر کچھ خاص رسومات ادا کیں، جس کے نتیجہ میں رانی کوشلیا سے رام چندر جی پیدا ہوئے بعد میں رانی کیکئی کو بھی ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام بھرت تھا۔ تیسری رانی سمترا سے دو اولادیں ہوئیں۔ بڑے لچھمن جی اور چھوٹے شترگھن جی تھے۔ قرآن مجید سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور زکریا علیہما السلام کو بھی ابتداً کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ جب دونوں کا بڑھاپا آگیا تو انھوں نے اللہ تعالےٰ سے دعاء کی تھی کہ ان کا کوئی وارث پیدا ہو۔ چنانچہ ان کے یہاں اولادیں پیدا ہوئی تھیں۔ (والصّٰفّٰت ۳-$\frac{۱۰۲}{۹۹}$ اور مریم ۱-$\frac{۱۹}{۴-۲}$) قاعدہ کلیہ ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو ہمیشہ دہرایا کرتی ہے" یہ انگریزی محاورہ ہے۔ لوگوں کا تجربہ بھی ہے اور قانون الٰہی بھی۔ قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ:

"ہم ان ہی دنوں کو، لوگوں کے درمیان، اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں"

(آل عمران ۴-$\frac{۱۴۰}{۱۱}$)

آپ پیغمبروں کے حالات میں یہ ضرور دیکھیں گے کہ انہیں، بعثت سے پہلے، عمر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے کسی نہ کسی دور میں، یا تو صحراؤں اور میدانوں میں آزاد رہ کر، یا غاروں اور جیل خانوں میں بند رہ کر، تزکیۂ نفس کا موقع بہم پہنچایا گیا ہے۔ شری رام چندر جی کو بھی شاید ایسا ہی فریضہ سپرد کیا جانا تھا، لہٰذا ان کو بھی ایک عجیب حادثہ سے دوچار ہونا پڑا تھا، جو نہایت جرات و صبر آزما تھا۔ اور اس سانحے نے انہیں تزکیۂ نفس کا موقع دیا تھا جو برگزیدگی کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے سے پہلے ضروری تھا۔

شری رام چندر جی، جب پندرہ برس کے ہو گئے تو اُن کی شادی راجہ جنک کی بیٹی سیتا کماری سے ہو گئی۔ یہ شادی "سویمبر" (یعنی انتخابِ شوہر کی تقریب) کے ذریعہ ہوئی تھی، جس میں شیو جی کے عظیم دھنش کو توڑ دینے کا امتحان رکھا گیا تھا۔ چنانچہ شری رام چندر جی اُس دھنش کو توڑ کر انتخاب میں کامیاب ہوئے تھے۔ ریاستِ بہار کا آخری حصہ "متھلا" کہلاتا ہے جو دربھنگہ ضلع میں پڑتا ہے۔ متھلا کے راجہ "جنک" کے لقب سے مشہور تھے۔ جس طرح روس کے بادشاہ "زار"، یا جرمنی کے بادشاہ "قیصر"، یا مصر کے بادشاہ "فرعون" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ میتھلی زبان میں "باپ" کو "جنک" کہا جاتا ہے۔ متھلا کے راجاؤں نے یہ "باپ" کا ہم معنی لقب اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ ہندوستانی بادشاہ کے لیے، پیدا کرنے والے باپ کی طرح اپنی رعایا کی حفاظت و پرورش کرنے والا ہونا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ فی زمانہ ترکی کے صدر مصطفےٰ کمال کو ترکی زبان میں "اتاترک" کہا جاتا ہے، یعنی "ترکی کا باپ"۔ ترکی زبان میں "اتا" کے معنی "باپ" کے ہیں۔ بہر کیف! عوام ان راجاؤں سے ایسے خوش تھے کہ انہیں باپ کی طرح مانتے تھے۔ چونکہ سیتا جی، راجہ جنک کی بیٹی تھیں، اسی وجہ سے انہیں "جانکی جی" بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی "جنک والی"۔ انہیں "جنک دلاری" بھی کہا جاتا ہے اور "جنک نندنی" بھی۔ "دلاری" کے معنی "پیاری" اور "نندنی" کے معنی "بیٹی" کے ہیں۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اُن کو "جانکی جی" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ موضع جنک پور (ضلع چمپارن بہار) کی تھیں۔ "جنک پور" جس مقام کا نام ہے، اُس کی آبادی راجہ جنک کے آخر زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور وہ گاؤں ان کے نام سے موسوم ہوا تھا۔

سیتا جی کو، وشنو بھگوان کی بیوی لکشمی دیوی کا اوتار مانا جاتا ہے، جو دولت و

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ثروت کی دیوی سمجھی جاتی ہیں، اور جن کی پوجا کاتک کے مہینہ میں دیوالی کے روز کی جاتی ہے۔ جب رام چندر جی اٹھائیس ۲۸ سال کے ہوئے تو راجہ دشرتھ نے اُن کی ولیعہدی کا اعلان کرنا چاہا، کیونکہ وہ چاروں بھائیوں میں سب سے بڑے بھی تھے۔ اور وہ بچپن ہی سے وشوامتر جی کی نگرانی و سرپرستی میں آشرم کے اندر اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کیے تھے۔ لامحالہ راجہ دشرتھ کے اس خیال و ارادہ کی اطلاع محل کے اندر بھی پہنچ گئی۔ شاہی محلوں میں توڑ جوڑ اور سازش و سیاست کی کار فرمائی ہوتی ہی ہے نیز ہر ماں کو اپنے بیٹے کی بہبودی اور انتہائی عروج کا خیال ہوتا ہی ہے، چنانچہ یہاں بھی وہی ہوا۔ رانی کیکئی کے پیشِ نظر اپنے بیٹے بھرت جی کی بھلائی تھی، اس لئے وہ بھرت جی کی جانشینی کی کوشش میں لگ گئیں۔ اندرونی سازش اور ریشہ دوانی میں تو انہیں کامیابی نہ ہوئی، البتہ اُن کا ایک داؤں چل گیا۔

ایک مرتبہ، جنگ کے موقع پر، راجہ دشرتھ کے رتھ کا پہیہ ٹوٹ گیا تھا۔ اُس وقت رانی کیکئی ساتھ تھیں۔ راجہ دشرتھ کی جان پر آ بنی تھی کیونکہ فریق مقابل یہ صورت حال دیکھ کر اُن کے قتل کے لئے دوڑ پڑا تھا۔ اس موقع پر رانی کیکئی کے دانشمندانہ طرزِ عمل سے راجہ دشرتھ سنبھل گئے تھے اور ان کی جان بچ گئی تھی۔ اس کارگزاری اور احسان مندی کی بنا پر راجہ دشرتھ نے رانی کیکئی سے، ان کی ایک خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا تھا، جو اب تک وفا نہ ہوا تھا۔ اس موقع سے رانی کیکئی نے فائدہ اٹھایا اور راجہ کو اُن کا وعدہ یاد دلا کے اپنی خواہش اِس صورت میں پیش کی کہ "رام چندر کو بارہ برس کے لئے جلا وطن کیا جائے اور بھرت کی ولیعہدی کا اعلان کیا جائے"۔ راجہ دشرتھ نے انہیں سمجھانے کی امکانی کوشش کی، مگر عورت کی ہٹ مشہور ہے، رانی کیکئی نے ایک نہ مانی، بالآخر راجہ دشرتھ کو اپنی زبان کا پاس کرکے، ان کی خواہش پوری کرنی پڑی۔ رام چندر جی کی چودہ ۱۴ سال کی بن باسی اور بھرت جی کی ولیعہدی کا اعلان کرنا ہی پڑا۔

شری رام چندر جی نے لامعلوم طویل سفر پر روانہ ہونا چاہا تو اُن کی بیوی، سیتا جی نے "شریکِ زندگی" کی حیثیت سے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ دیکھ کر لچھمن جی نے بھی ان دونوں کے ساتھ جانے کا اعلان کر دیا۔ جب یہ لوگ اجودھیا سے روانہ ہوئے تو باہر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

باہر دشوامتر جی بھی آ کر اُن سے آ ملے۔

شری رام چندر جی نے جلا وطنی کی زیادہ مدت چتر کوٹ اور پنچ بٹی میں گزاری، جہاں اُس زمانہ میں، اُس عہد کے بڑے بڑے رشیوں اور خدا پرستوں کا جمگھٹا تھا۔ انھوں نے اُن بزرگوں سے بڑا فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ دکن چلے گئے۔

اس کو اتفاق کہئے یا سنّتِ الٰہی، کہ ہر برگزیدہ شخص کو، اُس کی زندگی میں ایک نہ ایک بھاری مفسد فرماں روا یا مفتری سردار سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو نمرود سے، موسیٰؑ کو فرعون سے، داؤدؑ کو جالوت سے، سلیمانؑ کو بلعام سے اور محمد رسول اللہ کو ابو جہل سے نپٹنا پڑا تھا۔ اُسی طرح شری رام چندر جی کو راون سے اور شری کرشن جی کو کنس سے ٹکر لینا پڑا تھا۔

شری رام چندر جی جب دکن پہنچے، تو لنکا کے راجہ راون کی حسین و جمیل بہن سوروپ نکھا نے، شری رام چندر جی کو ایک جوان رعنا پاکر انہیں اُسی طرح دعوتِ عیش دی، جس طرح بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جوان ہونے پر وزیر اعظم مصر کی پری جمال بیوی "زلیخا"[1] نے اُن کو پیغام وصل دیا تھا۔ پھر جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اس گناہ میں ملوث ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں زلیخا نے اپنے شوہر کو بھڑکا کر حضرت یوسفؑ کو جیل بھجوا دیا تھا اُسی طرح شری رام چندر جی کے انکار پر سوروپ نکھا نے اپنے بھائی راون کو اُبھار کر شری رام چندر جی سے بھڑا دیا۔ راون نے ایک موقع سے فائدہ اٹھا کر سیتا جی کا اغوا کر لیا اور لنکا لے بھاگا۔ تحقیقات کے بعد جب شری رام چندر جی کو حقیقت معلوم ہوئی تو اُنھوں نے دکن کے راجہ سگریو سے رجوع کیا۔ اُس نے اُن کی بڑی عزت کی اور اپنے سپہ سالار اعظم ہنومان جی کو شری رام چندر جی کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ لنکا پر فوج کشی ہوئی۔ پانچ ماہ تک جنگ برپا رہی، آخر راجہ راون مارا گیا اور سیتا جی قید سے آزاد ہوئیں۔ اس فتح و کامیابی اور سیتا جی کی بازیابی کا عظیم تیوہار کنوار کے مہینہ میں دسہرہ

---

[1] قرآن عظیم میں عزیزِ مصر کی بیوی کا نام مذکور نہیں، البتہ روایتی طور پر یہی نام مشہور ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے نام سے منایا جاتا ہے۔ لفظ "دسہرہ" دراصل سنسکرت زبان کے لفظ "دس پاپ ہر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "دس تکالیف سے نجات دلانے والے" کے ہیں۔

اِس کامیابی کے بعد، چونکہ چودہ (۱۴) سال کی مدت پوری ہو چکی تھی اس لئے شری رام چندر جی اجودھیا واپس آئے۔ شری رام چندر جی کی جلا وطنی، اپنی ولیعہدی اور ماں کی سازش کو بھرت جی نے بالکل ناپسند کیا تھا اس لئے راجہ دشرتھ کی وفات کے بعد بھرت جی نے تخت نشین ہونے سے انکار کر دیا تھا البتہ شری رام چندر جی کی واپسی تک کے لئے بحیثیت نائب السلطنت کام کرنا منظور کر لیا تھا۔ چنانچہ شری رام چندر جی کے واپس آتے ہی بھرت جی نے تاج و تخت ان کے حوالہ کر دیا۔ اور تخت نشین ہونے کے بعد، کہا جاتا ہے کہ شری رام چندر جی نے ایک ہزار برس تک حکومت کی۔

شری رام چندر جی کا زمانہ متعین نہیں ہے۔ قدیم زمانہ کی بات ہے۔ کون جانے اس وقت لوگ کتنی عمر کے ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا یقین کے ساتھ نہ تصدیق کی جا سکتی ہے اور نہ تردید۔ قرآنِ حکیم میں، حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ انھوں نے ساڑھے نو سو برس تک تبلیغِ رسالت کی تھی (عنکبوت ۲ - ۲۹/۱۴) پھر کون جانے کہ شری رام چندر جی کا عہد وہی ہے؟ یا اس کے بعد ہے؟ یا اس سے بھی پہلے ہے؟ اور کیسے حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شری رام چندر جی نے ایک ہزار برس تک حکومت نہیں کی؟ اور پھر یہ بھی کون جانے کہ یہ دونوں شخصیتیں دو ہیں یا ایک ہی؟

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

رامائن

انسان کے اظہارِ خیالات و جذبات کا ذریعہ زبان ہے جس کے دو اسلوب ہیں۔ ایک "نثر" دوسرا "نظم"۔ "نثر" سیدھی سادی عام بول چال کی زبان ہوتی ہے جس میں قیدِ وزن نہیں۔ اور اس لحاظ سے اس میں شاعرانہ کیف و مزہ نہیں۔ برخلاف اس کے "نظم" ایک ایسا پیرایۂ بیان ہے جس میں قواعد و ضوابط کے ذریعہ موزونیت، لحنی کیف اور نغماتی رس پیدا کر دیا گیا ہے اور اس رنگینی سے وہ فطرتِ انسانی کو فوراً اپیل کرتی اور جلد اپنی طرف مائل و متوجہ کر لیتی ہے۔ اسی لئے بالعموم، ہر زمانہ میں "مشرک و موحد" تمام قومیں اخلاقی اور مذہبی تعلیمات میں "شاعری" سے مدد لیتی رہی ہیں اور لوگوں نے جتنی مذہبی چیزیں اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے لئے پیش کیں، اُن کی زبان بالعموم نظم کی زبان رہی یا رکھی گئی تاکہ لوگ شعری نغمہ و لطافت کی وجہ سے اس چیز کو جلد اور بہ طیبِ خاطر قبول کریں اور ادھر لوگوں کا دل متوجہ ہو۔

اہلِ یونان و روم مشرک قومیں تھیں۔ اُن کے ارض و سماء میں بیشمار دیوتا تھے اور اُن سب دیوتاؤں کے محامد و مناقب کے لئے شاعری استعمال میں لائی جاتی تھی۔ اہلِ عرب و عجم میں خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا، سارے لوگ اصنام و اجرام پرست تھے اور اُن کی تحمید و تحسین کے لئے شاعری کام میں لائی جاتی تھی۔ اہلِ ہند بھی جن کی تہذیب و شائستگی کا سلسلہ یونانیوں سے بھی زیادہ قدیم تسلیم کیا جاتا ہے، ساری مذہبی تعلیمات و رسومات کو بہ حقِ شعر محفوظ کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام کتابیں، جو الہامی و آسمانی مانی جاتی ہیں یا جو بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود اور اُن کی درستیٔ اخلاق کے لئے لکھی گئیں، محاسنِ نظم سے متصف و آراستہ نظر آتی ہیں۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

قدیم ہند کی وہ عظیم کتاب جس کو "وید مقدس" کے نام سے پکارا جاتا ہے، قدیم ایرانی سرمایۂ مذہب جو "گاتھا" اور "ژند" کے لقب سے موسوم ہے، "زبور" جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، سب کی سب "نظم" میں ہیں۔ قرآنِ مجید کا اندازِ بیان ہر چند کہ شعرائے عرب کے اصولِ موضوعہ کے مطابق نہیں، مگر اُس کے بھی جابجا شاعرانہ طرزِ ادا اور ناظمانہ حُسنِ بیان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ شاعرانہ انداز و حُسنِ معانی، ترتیب و تشکیلِ، کلمات کی متانت، ہم قافیہ جملوں کا تواتر، بیان میں تشبیہ، تمثیل، استعارہ اور کنایہ وغیرہ کی دلکشی اور جذب واثر کا اہتمام، غرض وہ تمام محاسن، جو کسی اعلےٰ درجہ کی منظوم کتاب میں پائے جاتے ہیں، اُس میں بھی موجود ہیں۔ بہت سے مقامات پر "آیات" شعرہ اوزن اور قافیہ بھی رکھتی ہیں۔ چنانچہ علّامہ حمید الدین فراہی نے "نظام القرآن" کے عنوان سے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور اُس میں انھوں نے قرآن پاک کی نظمیت ثابت کی ہے۔ غرض کسی قوم کی کوئی مذہبی کتاب شاعرانہ خصوصیتوں اور ناظمانہ خوبیوں سے محروم و بے بہرہ نہیں۔ اور نہ اس حقیقت کے جاننے اور تسلیم کرنے سے کسی نے انکار کیا ہے۔ اِلّا یہ کہ علّامہ فراہی پر صرف یہی اعتراض ہوا تھا کہ انھوں نے یہ بالکل نئی بات کہی ہے اور اس سے پہلے کسی نے قرآن عظیم کی نظمیت کا کبھی دعویٰ یا ذکر نہیں کیا تھا۔ اوّل تو یہی تصوّر غلط ہے کہ چونکہ فلاں بات، اب سے پہلے کسی نے نہیں کہی ہے اس لئے وہ غلط یا قابلِ غور و تسلیم نہیں ہے۔ مکّہ کے مشرکین یہی کہتے تھے کہ چونکہ اب سے پہلے کسی نے ایسی چیز، ایسا تصوّر اور ایسا لٹریچر نہیں پیش کیا اس لئے یہ قرآن افترا ہے۔ زمین کو متحرک تو کوپرنکس سے پہلے کسی نے نہیں کہا تھا تو کیا اس کا کہنا غلط تھا؟ دوسرے یہ کہنا بھی بجائے خود غلط ہے کہ علامہ فراہی سے پہلے کسی نے قرآن حکیم کی نظمیت کا دعویٰ یا ذکر نہیں کیا ہے۔ علامہ امین احسن اصلاحی نے اپنے ایک مضمون میں یہ ثابت کیا اور دکھایا ہے کہ نظمِ قرآن کا اعتراف علمائے سلف سے چلا آتا ہے۔ نیز خود انھوں نے بھی دلائل و براہین کے ذریعہ قرآن حمید کی نظمیت ثابت کی ہے۔ بہرحال! "قرآنِ مبین" بیشک "شعر" نہیں، مگر وہ شاعرانہ انداز و حُسنِ بیان سے خالی بھی نہیں اور یہ اُس کی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

معجزانہ خصوصیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شعر نہ ہوتے ہوئے بھی شعریت کا حامل ہے۔

ہندوستان کی مذہبی اہم کتابیں رامائن، مہابھارت اور گیتا کے بہترین سرمایۂ شعروادب ہونے سے تو کسی طرح انکار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ محض شعروادب ہی نہیں، بلکہ اور بھی بہت کچھ ہیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے ہندوستانیوں کے قلب و دماغ پر، اپنا سکّہ کچھ اس طرح جما لیا ہے کہ انہیں اپنی کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی، چاہے وہ جس قدر بھی عمدہ اور قابلِ قدر ہو۔ اور مغرب کی ہر چیز اُن کے لئے وجہِ ناز بن گئی ہے، چاہے وہ جس قدر بھی ہم ہندوستانیوں کے مزاج، مذاق، تہذیب، روایت اور جذبہ و تصور کے خلاف ہو۔ دراصل اِس انداز میں غلامی کا وہ اثر کارفرما ہے جو دو سو برس کی مدت میں ہم پر اثر کر گیا ہے۔

ہندیوں کا وہ نظام فلسفہ جو "ویدانت" کے نام سے مشہور ہے، اتنی قدیم چیز ہے جس کے مقابلہ میں دُنیا کا کوئی دوسرا فلسفہ پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سلسلہ کی جو کتابیں ہیں، اُن کے بالمقابل دنیا کی کوئی فلسفیانہ قدیم کتاب نہیں لائی جا سکتی۔ اور درحقیقت یہی وہ سرمایۂ ناز سرچشمہ ہے جس کی سوتیں مغرب تک پہنچی ہیں۔ سر ولیم جونز نے غلط نہیں کہا ہے کہ:۔

"یہ ناممکن ہے کہ ویدانت اور اُس کی مختلف تفسیروں کا مطالعہ کیا جائے اور یہ نہ تسلیم کیا جائے کہ فیثاغورث اور افلاطون نے اپنے اعلیٰ نظریات، اسی سرچشمہ سے حاصل کئے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اگر اس ہندو فلسفہ کو، جس کی روح میں، اب اسلامی جلوہ باریاں بھی کروٹیں لے رہی ہیں، ہندوستانی، اپنے لئے شمعِ راہ بنلتے تو انہیں مغرب کا دست نگر نہ بننا پڑتا۔ بقولِ فریڈرک شلیکل (FREDERICK SHIELACALE) یہ تو ایسا جگمگاتا ہوا آفتاب تھا جس کے سامنے دنیا کے سارے چراغ مدھم نظر آتے۔ وہ کہتا ہے:۔

"مغرب کا بلند ترین فلسفہ اور عقلی تخیل، جس کی ترویج یونانی حکما نے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی ہے، مشرقی فلسفہ کی روشنی اور باجبروت آفتاب کی عظمت کے
سامنے، ایسی حیثیت رکھتا ہے، جیسے جھلملاتا ہوا چراغ، جو ہر لحظہ گل
ہونے کو تیار رہتا ہو۔

صرف اتنا ہی نہیں۔ وہ اس کا بھی معترف ہے کہ:۔

"ہندو فلسفہ، انسان کی یزدانی تخلیق کو مسلسل پیش نظر رکھتا ہے تاکہ
انسان، وصالِ الٰہی کو اپنے اعمال و افعال کا مقصدِ اوّلین بنائے۔"

مگر اس کا کیا جواب، کہ اہلِ ہند، احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کے
مرض میں بری طرح مبتلا ہیں۔ دیبی پرشاد بشاش نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ:۔

وطن میں پاسکے عزت، کبھی بھی اہلِ کمال؟
عزیز ہوتا ہے دوکانِ گلفروش میں، گل

بظاہر اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ ہندو فلسفہ، سنسکرت زبان میں اور مسلم فلسفہ
عربی زبان میں ہے اور یہ دونوں زبانیں ایسی ہیں جن تک عوام تو کیا خواص کی بھی عام
طور سے رسائی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے مغربی فلسفہ، مغربی علوم و فنون اور زبان کے
حصول کے سبب، ہندوستانیوں میں متعارف و مقبول ہو گیا ہے۔ ہر چند کہ یہ عذر ایک
حد تک صحیح اور یہ وجہ ایک گونہ معقول ہے مگر بہت زیادہ وزن دار اور وقیع نہیں۔
آخر یہ کیا بات ہے کہ اہلِ مغرب تو یہ زبانیں بطور خاص اس لیے سیکھیں کہ وہ ان
جواہر پاروں سے مستفیض ہو سکیں اور پھر اپنی اپنی قوم کے فائدے کے لیے، اپنی اپنی
زبانوں میں ان کے ترجمے کر ڈالیں، مگر خود اہلِ مشرق اِن زبانوں کو سیکھنا اپنی ہتک
سمجھیں؟ اور ان کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا فضول قرار دیں؟ یہ کیسی عجیب
بات ہے کہ ہماری چیز اور ہم ہی کو اس کی خبر نہیں، مگر کرزن جانتا ہے کہ یہ کیسی چیز ہے:
وہ لکھتا ہے:۔

"جب ہم مشرق کے فلسفیانہ اور شاعرانہ شاہکاروں کو دیکھتے ہیں،
خصوصاً اُن ہندوستانی شاہکاروں کو، جو، اب یورپ میں رواج پاگئے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیں، تو ہم ان میں صداقتوں کا خزانہ پاتے ہیں۔ ایسا خزانہ جس کا
مقابلہ اگر اُن پست نتائج سے کیا جائے جن پر مغربی دماغوں کو ناز ہے،
تو ہمیں مجبوراً مشرقی فلسفہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا پڑتا ہے اور
ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نسلِ انسانی کا یہ گہوارہ، بلند ترین فلسفہ کا وطن ہے۔"

بہر کیف! ہندوؤں کی اہم اور مشہور مذہبی کتابوں میں، جو شاعرانہ حسنِ بیان کی وجہ سے بطور خاص قابلِ ذکر ہیں، ایک کتاب "رامائن" ہے۔ یہ کوئی آسمانی کتاب اور الہامی صحیفہ نہیں، بلکہ انسانی تصنیف ہے جس میں شری رام چندر جی کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں۔ "رامائن" نام کی کتاب بہت سے لوگوں نے لکھی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک "رامائن" کے بیس نسخے، بیس مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے، بنارس کے کتب خانہ میں موجود تھے۔ مگر سب رامائنوں میں جو مشہور و متداول ہیں، وہ دو ہیں، ایک بالمیک جی کی رامائن، جس کو اولیت کا فخر حاصل ہے اور جو ادب و شعر کا نادر نمونہ متصور ہوتا ہے اور خواص کی چیز ہے۔ دوسری تلسی داس کی رامائن جو فنی و علمی نہیں، بلکہ آسان ہونے کی وجہ سے عوام کے نزدیک قابلِ قدر سمجھی جاتی ہے۔ اور دونوں کا یہ فرق دراصل دو اسکول کا فرق ہو جاتا ہے۔ باقی کتابیں جو "رامائن" کے نام سے لکھی ہوئی بیان کی جاتی ہیں وہ نہ تو موجود ہی ہیں اور نہ کوئی اہمیت رکھتی ہیں۔ یا اگر کہیں الماریوں میں موجود بھی ہوں تو وہ متعارف و مقبول نہیں۔

ہندوؤں کی "رامائن" کی تاریخ بالکل ویسی ہی ہے جیسی عیسائیوں کی "انجیل" کی ہے۔ قرآن حمید کے رو سے تو "انجیل" اس مخصوص کتاب کا نام ہے جس کے احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے اور کتابی صورت میں جمع ہوئے تھے۔ مگر آج وہ کتاب پردۂ دنیا پر کہیں موجود نہیں ہے۔ موجودہ چاروں "اناجیل" جو متعارف و متداول ہیں، وہ انسانی تصانیف اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار شاگردوں یا صحابیوں، یا دوستوں متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی لکھی ہوئی، حضرت عیسیٰ ؑ کی سوانح عمریاں ہیں، جن میں ان مصنفوں نے اپنی اپنی یادداشت کے مطابق حضرت عیسیٰ ؑ سے سنے ہوئے اقوال

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

و احکام بھی جمع کر دیئے ہیں ۔ اسپنگلر لکھتا ہے :۔

"جب حضرت مسیح کے دوست اور شاگرد بوڑھے ہو گئے اور یروشلم میں اس جماعت کے صدر آپ کے بھائی تھے، تو انھوں نے ان قصص و روایات کو، جو عام طور پر زبان زد خلائق تھیں یکجا مرتب کر کے آپ کی سوانح عمری تصنیف کی اور وہ یہی اناجیل ہیں"

اِس وقت تو صرف وہی چار انجیلیں مروّج اور موجود ہیں جو اُن کے چار شاگردوں نے لکھیں اور اُن ہی کے نام سے موسوم بھی ہیں اور جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، مگر درحقیقت ان کی تعداد چار نہ تھی اور نہ صرف چار شاگرد یا صحابی حضرت عیسیٰؑ کے تھے ۔ بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کے چونتیس ۳۴ شاگرد تھے اور سبھوں نے الگ الگ اپنی اپنی یاد داشت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور اُن کے اقوال و احکام کے متعلق لٹریچر فراہم کیا تھا ۔ اس طور پر چونتیس ۳۴ انجیلیں لکھی گئیں اور رائج تھیں ۔ اِن انجیلوں میں بہت سی باتیں، بہت سے اقوال اور اکثر حالات مشترک اور یکساں بھی تھے ۔ اور بہت سی باتیں بالکل ایک دوسرے کے برخلاف بھی، یا کم و بیش یا بالکل نئی تھیں ۔ مگر سب انجیلیں تین سو برس تک رائج رہیں اور چلتی رہیں ۔ ۳۲۵ء میں نیقیہ (مذہبی انجمن یا مجلس) کی مشہور کونسل میں اُس عہد کے سارے مذہبی اکابرین جمع ہوئے اور اُن کے سامنے یہ سارا لٹریچر رکھا گیا ۔ اِس کونسل نے صرف اِن ہی موجودہ چاروں انجیلوں کو اصلی اور صحیح قرار دیا اور باقی کو "اپوکریفا" (APO-CRYPHA) ۔ یعنی وضعی و غیر ملہم قرار دیا ۔ اور حکماً باقی اناجیل کو مسترد قرار دے کر اُن کا پڑھنا اور رکھنا جرم قرار دے دیا ۔ نتیجتاً وہ آہستہ آہستہ نابود ہو گئیں ۔ البتہ ۱۹۰۷ء میں ایک پادری کو ویاناّ میں رد کردہ اناجیل میں سے "انجیل برنباس" کا ایک نسخہ مل گیا تھا جسے اُس نے مصر لا کر چھپوا دیا تھا ۔ جب یہ خبر پاپائے روم کو پہنچی تو اُس نے برطانوی حکومت کے ذریعہ اس کو ناجائز قرار دلوایا اور ضبط کرا دیا ۔ تاہم اُس کا کوئی کوئی حصہ بعض مصری کتابوں میں نقل ہو ہو کر زندہ ہے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُس انجیل میں پیغمبرِ اسلام کی آمد کی واضح پیشگوئی کی گئی تھی ۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بالمیک جی کی رامائن، ادبی اور شعری لٹریچر کے لحاظ سے ساری دنیا میں متعارف و مقبول ہے۔ اس کی ابتدا میں بالمیک جی نے لکھا ہے کہ ایک روز انھوں نے، آشرم کے سامنے ایک شکاری کو دیکھا کہ وہ ایک پرندے کو پکڑ رہا ہے۔ اُس پرندے کی مصیبت اور شکاری کی قساوت کے منظر کی دردناکی سے اُن کا دل بے حد متاثر ہوا۔ اور غیر ارادی طور سے، شکاری کے حق میں اُن کی زبان سے لعنت و ملامت کے کچھ الفاظ نکل گئے۔ بعد میں انھیں احساس ہوا کہ یہ الفاظ اشعار (اشلوک) کا پیکر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ چونکہ شاعری کا ذوق اور تجربہ اُن کو نہ تھا، اس لئے وہ حیرانی کے عالم میں اِس عجیب واقعہ پر ششدر اور محو حیرت تھے کہ یکایک برہما نمودار ہوئے اور انھوں نے بالمیک جی کو حوصلہ دلایا اور بات سمجھائی کہ یہ شاعری کی خداداد نعمت انھیں مل گئی ہے۔ اور مشورہ دیا کہ اب اُن کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس ملکہانہ لیاقت و صلاحیت کو شری رام چندر جی کی مقدس سرگزشت حیات لکھنے میں صرف کریں تاکہ دنیا کو اس سے عبرت و سبق حاصل ہو۔ برہما نے انھیں یہ بھی بشارت سنائی کہ:-

"جب تک زمین پر پہاڑ قائم اور ندیاں رواں ہیں، تب تک اُن کی رامائن ساری دنیا میں زندہ و پائندہ رہے گی۔"

چنانچہ انھوں نے نارد منی سے سنی ہوئی رام کہانی کو رامائن کی صورت میں نظم کر ڈالا۔

بہت سے لوگ بجائے خود اس قصہ کو شاعرانہ لطیفہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جیسا کہ عام طور پر ہر زبان کے شعرا، اپنی تخلیقات کو پیش کرتے ہوئے، اُس کی قدر اور عظمت بڑھانے کو اُس کے بارے میں کسی نہ کسی الہامی اشارہ کا ذکر کرتے ہیں، اُسی طرح بالمیک جی نے بھی بحیثیت شاعر یہ افسانہ گھڑا ہے۔ کچھ لوگ اس سے بھی آگے بڑھ کر، شری رام چندر جی کے وجود اور اُن کی شخصیت ہی سے انکار کرتے اور انھیں فرضی کردار کہتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ در حقیقت بالمیک جی نے اپنی اس کتاب میں "نیکی" اور "بدی" کی آویزش کو ایک مثالی قصہ کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ جو رام نیکی کی نمائندگی کرتے ہیں اور "راون" بدی کی۔ لغت میں "راون" کے معنی ہیں "رلانے والا"۔

"رامائن" کا زمانہ تصنیف بہت متنازعہ ہے، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ پنڈت لیکھرام نے رامائن کو ۲ لاکھ برس پرانی کتاب بتایا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی تحقیق کے مطابق

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اس کا زمانہ، تصنیف تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح ہے۔ مسٹر گووند داس ایلامائن کو حضرت مسیح سے صرف تین برس پہلے کی کتاب بتاتے ہیں۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ:۔

"اس کا پہلا اور ساتواں باب بعد کا اضافہ ہے اور باقی متن کی بھی حالت یہ ہے کہ اس میں بہت کچھ رد و بدل ہوتا رہا ہے۔"

جو لوگ "رامائن" کو "مذہبی کتاب" نہیں بلکہ "تاریخ کی کتاب" مانتے ہیں، گووند داس نے اُن کی بھی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ:۔

"یہ محض شاعری ہے ہرگز تاریخ نہیں۔"

یونان کے مشہور و مایہ ناز شاعر ہومر (HOMER) کی شہرۂ آفاق کتاب الیڈ (ILIAD) کے بارے میں بھی یورپ کے ارباب فکر و تحقیق اور اصحاب علم و دانش خود بھی شروع سے یہی سمجھے اور لوگوں کو بھی بتاتے اور سمجھاتے آتے تھے کہ وہ ایک تخیلی فکر ہے کوئی واقعاتی چیز اور تاریخی حقیقت نہیں۔ سکندر اعظم (ALEXANDER) نے بھی ایک مرتبہ اپنے استاد ارسطو (ARISTOLLY) سے فرمائش کی تھی کہ "الیڈ" کی حقیقت پر روشنی ڈالئے تو انھوں نے بڑی متانت سنجیدگی اور ماہرانہ و محققانہ طور پر سکندر سے فرمایا تھا کہ:۔

"یہ کتاب، خطابت شعر کی سحر آرائی کا ایک کرشمہ ہے تاریخ نہیں، جیسے کہ ہیروڈوٹس (HERODOTUS) کی تاریخی کتاب ہے۔ نظم کی حیثیت میں اس کا پایہ یقیناً بہت بلند ہے لیکن اسے طبعی واقعات کی حقیقی سرگذشت نہیں قرار دیا جا سکتا۔"

یعنی نہ تو ٹرائے (TROY) کا کوئی وجود تھا۔ نہ اُس کے کسی بادشاہ پریام (PARIAM) کا بیٹا پارس (PAROUS) تھا۔ نہ واقعی وہ کسی لیڈا (LEDA) کی بیٹی، یا شاہ اسپارٹا مینی لاس (MENELAUS) کی بیوی، ہیلن (HELEN) کو بھگا کر ٹرائے لے گیا تھا۔ نہ مینی لاس نے کبھی ہیلن کی واپسی کے لئے کوئی جدوجہد کی تھی۔ اور نہ جنرل اکیلیز (ACHILLES) نے ہیلن کو بھگا کر لے جانے کے جرم میں ٹرائے پر حملہ کیا تھا نہ واقعی "TROJAN WAR" کا کوئی وجود ہے۔ اور نہ ٹرائے کبھی برباد ہوا تھا۔ بلکہ ہومر نے یہ سب محض تخیلی کردار اور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

فرضی قصہ پیش کیا ہے ۔ مگر جب انیسویں صدی میں جرمن ماہرِ ارضیات ہنرک اسکلیمن (HEINRICH SCHLIEMANN) نے ترکی حکومت سے اجازت لے کر ایشیائے کوچک کے علاقہ حصارلیک (HISSARLIK) کی کھدائی کرکے " ٹرائے " شہر کے آثار برآمد کرنے اور ۱۸۷۵ء میں اس نے اپنی کتاب "TROY AND ITS REMAINS" شائع کیا تو یہ دیکھ کر ساری دنیا حیران اور علماء و محققینِ یورپ انگشت بدنداں رہ گئے کہ ہومر نے جو کچھ لکھا تھا وہ افسانہ نہیں حقیقت تھی ۔ پھر اگر کبھی بالمیک جی کے تخیل نے بھی حقیقت کا جامہ پہن لیا تو مسٹر گونڈر اس حیران رہ جائیں گے ۔ بہرکیف ! پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی موقر کتاب " دی ڈسکوری آف انڈیا " میں رامائن کے بارے میں لکھا ہے کہ :-

" یہ سیکڑوں برس کے عرصہ میں جاکر متشکل ہوئی ہے اور اس کے بعد بھی اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے "

ہمارے نزدیک " رامائن " کی حقیقی عزت کا راز صرف اس امر سے وابستہ ہے کہ قدیم ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی تصویر ہمارے سامنے پیش ہو جاتی ہے اور انسانی زندگی کو جن مختلف حالتوں اور انسانی معاشرت کی جن مختلف کیفیّات کو وہ ظاہر کرتی ہے ، اس کا تتبع اگر آج بھی کیا جائے تو بنی نوع انسان کو اس دنیا میں جنت کا مزہ مل سکتا ہے ۔ اگر ہمارے امراء اور بڑے لوگ دشرتھ کے سے اوصاف حاصل کرلیں ۔ اگر ہمارے امراء کے بچے رام کا سا عزم ، رام کی سی حق پرستی ، رام کا سا پاسِ عہد اور رام کی سی اطاعت و شجاعت کے حامل ہوں ، اگر ہماری عورتوں میں سیتا کی سی وفاداری اور مصائب کے مقابلے میں سیتا کا سا عزم و ثبات پیدا ہو جائے تو یقیناً ہندوستان جنت نشان بن جائے ۔ " رامائن " کہنے کو ایک مہاراجہ کی سوانح عمری ہے مگر فی الواقع اس میں اس زندگی کا پورا مرقع پیش کیا گیا ہے جو قدیم آریوں کی نگاہ میں مکمل تھی ، جس وجہ سے اس میں فرائض کے بہترین نمونے ، ایفائے عہد کے بے مثل مرقعے ، راستبازی اور احترامِ والدین کے قابلِ رشک حوصلے ، حِلم و محبت کے بے پناہ جذبے ، استحکامِ عزم اور استقلالِ مزاج کے عظیم کارنامے ، جود و سخا اور عفو و درگزر کے حیرت انگیز کرشمے ، اس رنگینی و رعنائی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جو دلپذیر و سبق آموز

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیں۔ مسٹر جیمس ہیچنسن (JAMES HUTCHINSON) نے راماٸن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہومر کی "ایلیڈ" سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ شاید اُن کے خیال میں بالمیک جی نے یہ قصہ یا کردار یا تصوّر، یورپ سے مستعار لیا ہے۔ مگر حقیقتاً کہاں ہومر کی ہیلن جو صرف نسوانی حُسن و جمال اور معشوقانہ دلکشی و دلربائی کا ایک نمونہ ہے، اور کہاں سیتا۔ جو علوئے فطرت، عفّت و حیا، عزم و ثبات اور ایثار و قربانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے؟ آپ ہومر کی کتاب میں بڑی نادر نادر تشبیہیں پائیں گے، اندازِ بیان کے اچھوتے اچھوتے نمونے دیکھیں گے، لیکن وہاں نہ کوئی رام ملے گا اور نہ کوئی سیتا۔ نہ کوئی دشرتھ نظر آئیں گے نہ لچھمن۔ اگر یورپ کے عہدِ وسطےٰ کی اخلاقی تہذیب، جس کی دانتے (DANTE) نے تصویر کھینچی ہے، قدیم ہندوستان کی اخلاقی تہذیب کا مقابلہ کر سکتی ہے، تو ڈیوائن کومیڈی (LA DIVINA COMMEDIA) کا ذکر البتہ "راماٸن" کے مقابلہ میں کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ "ایلیڈ" اور "راماٸن" میں تو کوئی نسبت ہی نہیں۔ وہ اعلیٰ انسان جو رام چندر اور سیتا کے ملبوس میں دکھایا گیا ہے۔ وہ پاکیزہ و مقدّس زندگی جس کی تصویر "راماٸن" میں کھینچی گئی ہے، یقیناً نہ ہومر کے خیال میں آسکتا تھا اور نہ ڈانتے کی پروازِ تصوّر وہاں تک پہنچ سکتی تھی۔ ہم بھی بلاشبہ راماٸن کو مستند تاریخی کتاب نہیں مان سکتے، نہ اس کا درجہ الہامی کتاب کا سا تسلیم ہے، مگر اس کتاب میں انسانی سیرت کا جس قدر بلند نمونہ پیش کیا گیا ہے، وہ ہندوستانیوں کے لئے کچھ کم آئیڈیل (IDEAL) نہیں ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

رامائن کے منظوم ترجمے

"رامائن" یا دوسرے تمام مذاہب کی اہم مذہبی و تاریخی کتابیں، ایک قابلِ قدر سرمایۂ ادب و اخلاق ہیں۔ اور جب یہ لکھی گئی تھیں تو اس خیال سے لکھی گئی تھیں کہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان کتابوں کا مطالعہ کریں گے اور ان کی افادیت عام ہو گی۔ ابتداً یہ مقصد پورا بھی ہوتا رہا جیسا کہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایسا ہوا کیا ہے۔ مگر انقلابِ زمانہ سے کچھ دنوں کے بعد یہ مقصد فوت ہو کر رہ گیا۔ عوام ان کتابوں کو صرف مقدس صحیفہ تسلیم کر کے لائقِ تعظیم سمجھتے اور انہیں طاقوں کی زینت بنائے رکھتے تھے۔ مذہبی رہنماؤں نے بھی اپنی مونوپولی (MONOPOLY) اور اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے ایسی کتابوں کا پڑھنا صرف اپنے حق میں محفوظ کر لیا تھا۔ زمانہ نے پلٹا کھایا اور روشن دماغ اور دیدۂ بینا رکھنے والوں نے غور کیا کہ دنیا کی ساری الہامی اور مذہبی کتابیں صرف بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے نازل ہوئی اور لکھی گئی تھیں اور ان سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے، ان میں، اسی عہد کی زبان بھی استعمال ہوئی تھی، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک وہ تعلیمات پہنچ سکیں، تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ مذہبی کتابیں، ہر عہد میں، اس دور کی مروّجہ عام زبانوں میں منتقل اور ترجمہ ہوتی رہنی چاہئیں۔ تاکہ ان کتابوں کی تعلیمات عام رہیں اور کسی خاص فرد یا جماعت تک وہ محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اہلِ فکر و نظر لوگوں نے یہ ضروری خیال کیا کہ اپنے مذہب کی بھی کتابیں عام کی جائیں۔

یہ کچھ صرف ہندوستان ہی میں نہیں، ہر جگہ یہی ہوا یہاں تک کہ دنیا میں سب سے پہلے مارٹن لوتھر (MARTIN LUTHER) نے کلیسا کے خلاف بغاوت کیا۔ لوتھر ۱۰ ارنومبر ۱۴۸۳ء کو پیدا ہوا اور ۱۸ ارفروری ۱۵۴۶ء کو مرا۔ اس جرمن مُصلح نے دنیا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی راہ کھول دی۔ ابتداً تو بڑا خلفشار پیدا ہوا اور عرصہ تک رہا مگر آہستہ آہستہ فضا ہموار ہوتی گئی۔ آخر میں مخالفت کا خاتمہ ہو گیا۔

مسلمانوں کے یہاں بھی مذہبی رہنما، قرآن حکیم کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کو جرم عظیم قرار دیئے ہوئے تھے۔ مگر جب انگریزوں کے ذریعہ تو ہمّ کی روایت عام ہوئی تو سب سے پہلے شیخ سعدی شیرازی (۱۱۷۵ء / ۵۷۱ھ - ۱۲۹۲ء / ۶۹۱ھ) نے ایران میں اور ان کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب (۱۷۰۳ء / ۱۱۱۴ھ - ۱۷۶۲ء / ۱۱۷۶ھ) نے ہندوستان میں قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان ترجموں پر دونوں جگہ دونوں زمانوں میں بڑے ہنگامے ہوئے۔ پھر جب اردو زبان نے پر پانکھ سنبھالے تو علامہ شاہ ولی اللہ کے حکم سے شاہ عبدالقادر صاحب نے سب سے پہلے قرآن عظیم کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس کے بعد ان کے لڑکوں نے یہ کام انجام دیا۔

ہندوستان میں بھی انگریزوں کے اثر سے جب روشن خیالی آئی تو ہندوؤں نے ضروری سمجھا کہ ہندو مذہب کی مذہبی کتابیں اردو زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ البتہ انھوں نے کسی قدر ذہانت سے کام لیا کہ ترجمہ کے لئے "نثر" کو نہیں بلکہ "نظم" کو ترجیح دیا، تاکہ وہ عوام و خواص سب کے اخلاق و وجدان کو براہ راست مسرور و متکیف کر سکیں۔ چنانچہ اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تمام مشہور و معروف مذہبی کتابیں نظم کی جانے لگیں۔

تمام مذہبی کتابوں میں "رامائن" کو اولیت و عوامیت کا درجہ حاصل تھا اس لئے اس کی طرف ہندو شعرا کی توجہ زیادہ ہوئی۔ ذیل میں "رامائن" کے ان منظوم ترجموں کا اجمالی ذکر کیا جا رہا ہے جو "مثنوی" کی شکل میں ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب صرف "مثنوی" کی صنف تک محدود ہے۔

۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۲ء میں "رامائن" کو سب سے پہلے اردو نظم اور مثنوی کا جامہ منشی جگنناتھ لال خوشتر لکھنوی نے پہنایا۔ اس مثنوی کا مادہ تاریخ ہے:

ریاضِ نور ہے تاریخ خوشتر

اور حقیقت یہ ہے کہ خوشتر کا یہ ریاض، نور میں شرابور ہے۔ چونکہ خوشتر اردو، فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں کے فاضل تھے، اس وجہ سے ان کا نتیجۂ فکر اپنے طرزِ ادا اور صفائی بیان کی وجہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے ملاحظے کی چیز ہو گئی ہے۔ کلام میں روانی، بندش میں چستی، تخیل میں بلندی اور بیان میں زور ہے۔ زبان اردو پر پوری طرح قدرت رکھتے تھے لہٰذا ان کا کلام مرصّع ہے اور انھوں نے انتخاب الفاظ میں حسنِ ذوق سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اور اردو زبان، دونوں کو خوشتر کا ممنون و شکر گذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ہندوستان کی اس بیش قیمت تصنیف کو ہندوستان کی لنگوا فرانیکا (LINGUA FRANCA) میں منتقل کر کے عوام کو اس کے پڑھنے، سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ یہ مثنوی یوں شروع ہوتی ہے:

خدایا! خامہ کو نام آوری دے ❊ قلم کو جلوۂ بال و پری دے
ریاضِ حمد میں، تاحسبِ انداز ❊ عنادل کی طرح ہو نغمہ پرداز
مضامینِ ثنا میں، تر زباں ہو ❊ برنگِ ابر نیساں، ہر زباں ہو
گل افشاں حمدِ باری میں قلم ہے ❊ بیاضِ نامہ گلزارِ ارم ہے
بہارِ نامہ شکرِ فیضِ حق ہے ❊ برنگِ لالہ رنگیں ہر ورق ہے

جس زمانہ میں یہ "حمد" لکھی گئی ہے وہ انگریزوں کا دور تھا، مسلمان بادشاہ، تاش کے بادشاہ سے زیادہ بااختیار اور اہم نہ تھا، کہ خوشتر پر کوئی اخلاقی یا سیاسی دباؤ ہوتا۔ ذرا اس "حمد" پر غور فرمائیے کس طرح دل کی گہرائیوں سے لب پہ آئی ہوئی حمد و دعا ہے اور حسنِ لسان و اندازِ بیان کو دیکھئے کہ کیا یہ زبان کسی ہندو کے منھ میں معلوم ہوتی ہے؟ یہ تو اردو زبان سے ہندو حضرات کی دل دادگی کا ہی اثر ہے کہ سو برس کے اندر یہ زبان معراجِ کمال حاصل کر گئی۔ لنکا کے میدانِ جنگ کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

کماں دارانِ نامی، حلقہ حلقہ ❊ زرہ پوشانِ جنگی، طبقہ طبقہ
قطارِ زندہ پیلاں، خیل در خیل ❊ خروشاں جانبِ میداں بصد میل
شمارِ بادپایاں، عقل سے بیش ❊ ہوئی جن کے سُموں سے سب زمیں ریش
ہزاراں نیزہ باز و گرز بردار ❊ ہزاراں یکّہ تاز و چست و پیکار
شمارِ فوج لاؤں کیا کروں اب ❊ یہی بہتر ہے خوشتر، چپ رہوں اب

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نہ آئے جو کہ شے وہم و گماں میں :: نہ کیونکر ہو کوئی عاجز بیاں میں

یہ ایک فوج کی تیاری کا حال تھا، اب دوسرے فوج کی طرف کا حال ملاحظہ ہو: ؎

ہوئے اسوار دونوں بھائی اُس پر :: ہوئی فتح و ظفر پا بوس آکر
سوئے میداں چلے دونوں برادر :: برنگِ شیر و مثلِ ضیغم نر
رکابِ شاہ میں انگد ہنومان :: لیے گُرزِ گراں باشوکت و شان
خراماں شاہ میموں، پیشِ لشکر :: ظفر ہم باز تھا، اقبال رہبر
یہ سوئے راست شاہِ فوج خرسان :: شتاباں، ہم عنانِ شاہِ دوراں

اودھ سے رام چندر جی اور لچھمن جی کے رخصت ہوتے وقت بادشاہ کی حالت زار کا نقشہ اور فضا و ماحول کی سوگواری کی تصویر دیکھئے: ؎

کیا غم سے سحر نے پیرہن چاک :: اُڑائی سر پہ اپنے شام نے خاک
جہاں گریاں تھا سب آہ و فغاں سے :: فرشتے گُل فشاں تھے آسماں سے
زمیں پر شاہ تھا اس طرح بیتاب :: کہ ہو جس طرح سے آتش پہ سیماب
ہو تھا ہر بُنِ مژگاں سے جاری :: پسند آنکھوں کو آئی اشکباری
اودھ میں زاغ نالاں، بن میں بلبل :: اُگے کانٹے یہاں، پھولے وہاں گُل
چلے جس دم اودھ سے رام، لچھمن :: گرا لنکا میں سر سے تاجِ راون

پوری مثنوی اسی طرح شاندار و آب دار ہے۔ شاعرانہ طنطنہ اور فنکارانہ زمزمہ اس مثنوی میں بطور خاص قابلِ ذکر اور لائقِ داد ہے۔

۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۷ء میں رامائن کا اردو نظم میں دوسرا ترجمہ، منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی کے قلم گہر بار کا مرہونِ منت ہے۔ اس کا مادۂ تاریخ ہے: ع

ترجمہ اردو میں رامائن ہوئی

یہ مثنوی لکھنوی رنگ و انداز کی ہے۔ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ اس میں صنائع و بدائع بھی کارفرما ہیں۔ الفاظ بھی پُرشکوہ ہیں اور اندازِ بیان بھی باحشمت

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے ۔ رام چندر جی کی سیہہ گری کے سلسلے کا محض ایک سین ملاحظہ ہو :-

قریب قوس پہنچے جب سری رام ⁂ قدم سے دامنِ غرّا لیا تھام
دھنک کو توڑ پھینکا جب زمیں پر ⁂ اندھیرا چھا گیا عرشِ بریں پر
ہوئے آثارِ محشر، مچ گیا شور ⁂ چھپے گوشوں میں مرغ و ماہی و مور
پرندوں کے اُڑے ہاتھوں کے توتے ⁂ یکایک چونک اٹھے دریا کے سوتے

ایک "اپسرا" کو سلطان نے حکم دیا کہ "رکھ" کو جنگل سے تلاش کر کے لائے ۔۔ "اپسرا" قدیم ہند کے تصوّر کے مطابق ہندوستانی ادب میں بہشتی نازنین یا حور کو کہا گیا ہے ۔ اُس کی تصویر دیکھئے :-

گئی بن میں وہ محبوبِ زمانہ ⁂ زبانِ پُر تکلّم پر ترانہ
وہ رخ جس پر عروسِ گل ہو مفتوں ⁂ گلستاں، صورتِ بلبل ہو مفتوں
روش پر مبتلا کبکِ دری تھی ⁂ شرارت جسمِ نازک میں بھری تھی
لباسِ پُر تکلّف تن میں پہنے ⁂ تنِ گل رنگ میں پھولوں کے گہنے
بہار آسا رخِ گلگوں پہ آنچل ⁂ کمر میں بارِ گیسو سے پڑے بل
غرض گت ناچتی آئی جو بن میں ⁂ بہار آئی ہر اک نخلِ کہن میں
برنگِ سایہ، رکھ زیرِ شجر تھے ⁂ نہاں مردم سے، مانندِ نظر تھے
سراسر سایۂ گیسو تھا سر پر ⁂ پڑا تھا پردۂ مژگاں نظر پر
گئی بن میں جو وہ غارت گرِ ہوش ⁂ تو وحشی ہو گئے از خود فراموش

ہر شعر میں لکھنوی مبالغہ موجود ہے مگر اِس حسن، اس سلیقہ اور اِس انداز سے ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے، ایک کیف محسوس ہوتا ہے ۔ "سوئمبر" کا ایک سماں ملاحظہ ہو :-

لباسِ نو عروسی زینت بر ⁂ بسا عطر و گلاب و مُشک و عنبر
پسینے نے یہ زیور پر جلا کی ⁂ ہوئی بُو موتیوں میں، موتیا کی
جنابِ رام کے پاس آ کے فی الحال ⁂ پنہا دی پھول کر پھولوں کی جے مال

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہوئے شاداں، دلِ ناشاد ہر سو ∴ مچا شورِ مبارکباد، ہر سو

پوری مثنوی اسی طرح معطّر و معنبر اور دامانِ باغبان و کفِ گلفروشں بنی ہوئی ہے ۱۲۹۵ھ میں رامائن کو تیسرا خلعتِ اردو پہنانے والے منشی بانکے لال بہاری ۱۸۸۰ء بہار دہلوی ہیں۔ اس مثنوی کا مادّہ تاریخ ہے:

روشن ہے کیا چراغِ دینی

اس مثنوی سے بہار کی ذہانت و فطانت اور جولانیٔ طبیعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے مضمون کو قیدِ شعر میں لے آنے کی پوری قدرت رکھتے تھے۔ رام چندر جی اور راون کی جنگ کی صبح کا سماں ملاحظہ ہو:

ہوا خورشیدِ رخ جس دم نمودار ∴ عروسِ شب ہوئی پردہ میں یکبار
ہوئے بیدار رگھوبر اور لچھمن ∴ سبھی اُس دم ہوئے تیار بن ٹھن
دلیروں نے بحکم رام چندر ∴ ہر اک جانب سے گھیرا قلعۂ زر
سنا جس دم مندانیتک نے یہ حال ∴ نکل آیا قلعے سے ہوکے بے حال
سبھی شیطان لنکا کے بلائے ∴ ملخ اور مور کے مانند آئے
درِ لنکا کے ہر سُو، چار سُو پر ∴ پسر راون چڑھا، لشکر کو لے کر
دو رویہ جنگ تھی اُس دم وہاں پر ∴ ہوا ایسا ولیکن رام لشکر
نظر آئے گریزاں، ریچھ، بندر ∴ ہنوماں گونج کر پہنچے وہاں پر
بڑھا کر دُم، لپیٹے دیو ناپاک ∴ غضب سے اُس کو پھینکا برسرِ خاک

رام چندر جی اور راون کی جنگ لنکا میں ہوئی تھی، جہاں راون کی حکومت تھی۔ دکن کے راجہ سگریو، بندر کو اور ان کے سپہ سالار، ہنوماں کو بتایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنوبی ہند میں، اُس عہد میں انسان نہیں بستے تھے بلکہ صرف جانور ہی جانور تھے۔ جنوبی ہند کا بڑا حصہ جنگلوں اور پہاڑوں پر مشتمل ہے، اس لئے قدیم عہد میں جبکہ دڑاویڈین، پوری طرح جنوبی ہند کی طرف نہیں سمٹے تھے، ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں، جیسا کہ بہار نے کہا ہے۔ اور تقریباً رامائن کے سارے مترجم اور شارح

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ایسا ہی ظاہر کرتے ہیں - مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مہمل خیال اور غلط تصور ہے - اصل یہ ہے کہ رام چندر جی کی مدد وہاں کے انسان بادشاہ اور راجہ نے کی تھی جن کا نام سگریو تھا اور سگریو کی فوج کے سپہ سالار بھی آدمی ہی تھے جن کا نام ہنومان تھا - چونکہ یہ جنگلی انسان اور وحشی آدمی تھے اس لئے اُن کے نام جانوروں ہی پر رکھے جاتے تھے - چونکہ یہ سردارِ فوج ذاتی طور پر بھی بڑا قوی ہیکل انسان تھا اس لئے اُس کو ہنومان یا مہابیر کہا گیا، ورنہ بھلا جانور، رام چندر جی کی کیا مدد کرتے۔

یہ صحیح ہے کہ وحشی و بدوی انسانوں کے نام، جانوروں کے نام پر رکھے جاتے تھے اور یہ نام اُس جانور اور اُس انسان کی صفات و خصوصیت کے باہم مماثل و مشترک ہونے کی بنا پر رکھے جاتے تھے - رام چندر جی کا زمانہ صحیح طور پر معلوم نہیں اس لئے کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ منضبط نہیں ہوئی مگر عربوں کی تاریخ موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں بھی زمانہ قدیم و قبل از تاریخ میں، انسانوں کے نام، جانوروں کے ناموں پر رکھے جاتے تھے - اور اُس کے عہد ہی میں یا اس کے بعد بھی، اُس کا پورا خاندان اور قبیلہ اُسی نام و نسبت سے موسوم و مشہور ہوتا تھا۔ مثلاً ایک شخص کا نام "اسد" تھا جس کے معنی "شیر" کے ہیں - اُس کا قبیلہ آج تک "بنی اسد" کے لقب سے معروف و مشہور چلا آتا ہے - اسی طرح دوسرے قبائل "بنی کلاب" (کتے) یا "بنی ثعلب" (لومڑی) وغیرہ وغیرہ کے نام اور لقب سے ابھی تک موسوم و مشہور چلے آتے ہیں - لہٰذا یہ قیاس قرینِ عقل ہے کہ راجہ سگریو کے سپہ سالارِ اعظم انسان تھے جن کا نام "ہنومان" تھا - مگر اس روایت کو صرف اس عقلی دلیل پر غلط قرار دے کر اس کا مضحکہ اڑانا صحیح نہ ہوگا کہ بھلا جانور، انسان کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ قرآن حکیم میں بیان ہوا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو، عرب کی ملکہ سبا کا حال ایک معروف و مشہور پرندہ "ہدہد" نے سنایا تھا اور انھوں نے اُس ملکہ کو اُسی پرندہ کے ذریعہ خط بھیجا تھا - بہت سے عقلمند مسلمان اس کی تاویل کرتے ہیں کہ دراصل وہ "پرندہ ہدہد" نہیں ہوگا بلکہ کوئی انسان ہوگا جس کا نام "ہدہد" ہوگا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مگر قرآنی الفاظ سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خبر دہندہ اور نامہ بر جانور نہیں انسان تھا۔

"جب اُنھوں نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں ہُدہُد کو نہیں دیکھتا؟ کیا کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اُس کو سخت سزا دوں گا یا اُس کو ذبح کر ڈالوں گا۔ ورنہ وہ صاف حجت پیش کرے۔ سو وہ تھوڑی ہی دیر میں آ گیا۔ اور کہنے لگا ...... میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ بادشاہی کر رہی ہے اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ خدا کو چھوڑ کر آفتاب کی پرستش کرتی ہے .... سلیمان نے کہا .... میرا یہ خط لیجا اور اس کو اُس کے پاس ڈال دینا پھر ہٹ جانا اور دیکھنا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔"

(نمل ۲-$\frac{۲۷}{۲۸-۲۰}$)

جب پرندوں کے ذریعہ خبر رسانی عام ہو گئی اور جنگِ عظیم اوّل میں لوگوں نے آنکھوں سے اس کا حال دیکھ لیا تو مانا کہ حضرت سلیمانؑ نے پرندہ کے ذریعہ خط بھیجا ہوگا۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کی پیدائش سے چالیسؔ دن پہلے حبشی سپہ سالار ابرہہ نے مکّہ پر چڑھائی کی تاکہ خانہ کعبہ کو برابر کر دے۔ اُس نے اس کام میں ہاتھیوں کو استعمال کرنا چاہا۔ مکّہ والے کمزور تھے، ہٹ گئے۔ اتنے میں غول کے غول پرندوں نے پتھر برسا کے، ابرہہ کے لشکر کو "کھایا ہوا بھوسہ" بنا دیا تھا۔ قرآن شریف میں ہے کہ :۔

"کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ ہم نے اُن پر غول کے غول پرندے بھیجے جنھوں نے اُن پر سب پتھر کی کنکریاں برسایا اور اُن کو کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح کر دیا۔" (فیل - $\frac{۹۴}{۱-۵}$)

لوگ پہلے اس کی یوں تاویل کرتے تھے کہ پرندے لاشیں کھانے کو آئے ہوں گے اور فوج، عربوں کے پہاڑوں سے پتھر پھینکنے سے مری ہوگی۔ مگر جب سائنس

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نے کششِ ثقل (FORCE OF GRAVITY) کا پتہ لگایا اور جانا گیا کہ اگر دس ہزار فٹ کی بلندی سے پتھر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑہ چھوڑا جائے یا کنکری گرائی جائے تو کششِ ارضی سے ہر ثانیہ کے بعد اُس کنکری کی رفتار بڑھتی چلی جائے گی اور اگر اُس کنکری کے زمین تک آتے آتے دو منٹ لگ جائیں تو آخری سکنڈ میں اس کی رفتار ۴۴۸۰ فی منٹ ہوگی جو بندوق کی گولی کی رفتار سے تقریباً نصف ہوگی اور اُس سے انسانوں اور حیوانوں کی ہلاکت و بربادی لازمی ہے، تب لوگوں نے تسلیم کیا کہ واقعی ابرہہ کا لشکر پرندوں کے کنکریاں پھینکنے سے تباہ و برباد ہوا ہوگا۔ آج بھی کتے اور بندر، فوج میں جن جن طرح کی اہم خدمات انجام دیتے ہیں وہ حیران کن ہے اور اگر ہم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے تو کبھی نہ مانتے۔ اسی طرح اگر چہ ابھی جانور ہنومان کا رام چندر جی کا مدد کرنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، مگر کون جانے کہ ہنومان یا دوسرے جانوروں سے خدمت لینے کا رام چندر جی نے کیا طریقہ دریافت کر لیا تھا؟ یا وہ کون سی طاقت تھی جس کے بل پر جانوروں نے اُن کی مدد کی تھی۔ مسلمان انہیں پیغمبر مانتے ہیں۔ اگر حضرت سلیمانؑ پیغمبر کی حیثیت میں "ہدہد" سے کام لے سکتے ہیں تو رام چندر جی بھی "ہنومان" سے مدد لے سکتے ہیں۔ بہر کیف! بہار کی مثنوی سے جنگ کا ایک نقشہ ملاحظہ ہو:

ہوئی جب دو پہر لڑتے لڑائی ؛؛ دلِ شیطان میں دہشت سمائی
ہوا اُس دم تراتینگ غضبناک ؛؛ ہوا عازم زمیں سے، سوئے افلاک
فلک پہ جا کے برسانے لگا تیر ؛؛ تبر، خنجر بھی برسائے بہ تزویر

وہ سماں بھی ملاحظہ ہو جبکہ رانی کیکئی، راجہ دشرتھ سے ایفاء عہد کا مطالبہ کی ہیں:

اٹھی وہ مہ جبیں فرشِ زمیں سے ؛؛ وہ تھی نازک بدن ہر نازنیں سے
نزاکت، ناز میں وہ خوش ادا تھی ؛؛ حضورِ شہ عجب غمزہ نما تھی
کہا، اِس دم جو ہیں میرے مطالب ؛؛ وفائے عہد ہے شہہ کو مناسب
بھرت کا راج ہووے اِس چمن میں ؛؛ رہیں چودہ برس رگھبیر بن میں
یہ سن کر، راجہ دشرتھ ہوئے بیہوش ؛؛ گرے فرشِ زمیں پر بادلِ جوش

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جو بیہوشی سے اک دم ہوش آیا * تو پھر نازک بدن سے دل لگایا
کہا، دوں، کیکئی سے، بھرت کو راج * کٹھن ہے پر جدائی رام کی آج
مسافت کے نہیں لائق سری رام * نہ ہو رسوا ابد تک اے گل اندام!
ہوا، لختِ جگر، کرنا، غضب ہے * ترا اس وقت کا ہٹ بے سبب ہے
کہا، زیبا نہیں شاہوں کو انکار * کریں اپنی زباں سے جس کا اقرار
ہٹی، ہٹ سے نہ وہ زنہار زنہار * شہ اپنے قول پر نادم ہے مربار
ہے نارِ نارِ نیناں، وکرِ دلبر تنگ * ہوئے بر باز اس سے تاج و اورنگ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔ ہر خواب "تمثیلی" ہوتا ہے۔ یعنی اصل مقصد کو دوسرے انداز سے انسان دیکھتا ہے۔ اسی لیے خواب کی تعبیر ایک خاص علم ہے اور ہر شخص ہر خواب کی تعبیر نہیں بتا سکتا۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیلؑ کو شام سے حجاز سے جا کر آباد کریں تاکہ خانہ کعبہ کی وہ مجاورت کرے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ نے فلاکاری کے جوش میں خواب کی اصلیت کو نہیں سمجھا اور واقعی بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر تل گئے۔ بیٹے کو بلا کے خواب کی خبر سنائی اور اس کی مرضی دریافت کی۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے خواب کو سنا تو بصد ادب فرمایا کہ آپ کو اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں جو کچھ کرنا ہے شوق سے کیجیے۔ میں بطیبِ خاطر حاضر ہوں۔ یہ پیغمبرانہ شان۔

رام چندر جی کی غیر موجودگی میں، رانی کیکئی، راجہ دشرتھ سے ایفاء عہد کا مطالبہ کرتی ہیں۔ شہنشاہ سمجھاتے ہیں مگر وہ نہیں مانتیں اور بضد ہیں کہ بھرت کو راج دیا جائے اور رام بن باس کے بھیجے جائیں۔ راجہ دشرتھ مجبور ہو کے رام چندر جی کو بلاتے ہیں اور صورتِ حال کی نزاکت بتلاتے ہیں۔ رام چندر جی فوراً تیار ہو جاتے اور کہتے ہیں کہ آپ ایفاء عہد سے نہ ہٹیے۔ ہم بن باس کے لیے تیار ہیں: ؎

کہا، قولِ پدر ہے ہم کو منظور * نکوئی ہے ہماری اس میں بھرپور
ہوئے رخصت پدر سے کہہ کے اسو ہنگ * بھرت کو ہو مبارک تاج و اورنگ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سیتاجی نے شوہر کا یہ فیصلہ سنا تو رفاقت کا مصمم ارادہ کرکے :-

گئیں خدمت میں پیشِ مادرِ رام ✤ محبت دل کی کر ظاہر، گل اندام
بہ خوشدامن ملیں رنج و تعب سے ✤ ہوئیں خواہانِ رخصت، پھر ادب سے
ہوئیں مانع، مگر سیتا نہ مانی ✤ محبت رام کی بس دل میں ٹھانی
کہا، دنیا میں ہے عورت کو دولت ✤ کرے شوہر کی وہ دل سے اطاعت

لوگوں نے صحیح کہا ہے کہ "عورت" کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ رانی کیکئی بھی "عورت" ہی تھیں اور سیتا جی بھی "عورت" ہی تھیں۔ مگر دیکھئے کہ وہاں عورت نے اپنی نامعقول ہٹ کے سامنے شوہر کی کسی بات، کسی دل گرفتگی اور کسی التجا کی پروا نہ کی۔ شوہر کے گرم آنسوؤں سے بھی کیکئی کا دل نرم نہ ہوا۔ مگر یہاں دیکھئے کہ شوہر پرستی کے جوش میں سارے عیش و آرام کو تیاگ کر صرف شوہر کی مصیبت میں شرکت کے لئے سیتا خود بھی بن باس ہو گئیں۔ بہرکیف! رام چندر جی کی واپسی کا منظر یہ ہو :-

ہوا جس وقت شہرہ مشرق راہی ✤ علم نزیر بنے باقی کلا ہی
شہیر رام و لکھن، لنکا سے چل کر ✤ اودھ پہنچے وہ لے کر ساتھ لشکر
ہوئے تیار استقبال کو سب ✤ لیے ہمراہ سواری پیل و مرکب
ہوئی آئینہ بندی نقش کاری ✤ شہر نے کی بہ عزت غمگساری
ملے رام و لکھن جب مادروں سے ✤ ندی جاری تھی چشم گل رخوں سے

شرط پوری ہو چکی تھی۔ ملک رام چندر جی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ درباری رگھوبیر کے فدائی تھے۔ بھرت بھائی کا حق شناس تھا۔ لہٰذا رانی کیکئی بھی فرمانے لگیں :-

خوشی ہے رام کی شاہی میں بیشک ✤ بھرت کو فخر ہو، ہو دیں جو سیوک
نہ ہرگز ہووے گی ان سے جدائی ✤ وہ ہیں یک جان دو قالب دونوں بھائی

چنانچہ اجودھیا کے تخت پر شری رام چندر جی بحیثیت راجہ متمکن ہوئے۔ انہوں نے اپنے عہدِ حکومت میں سرزمینِ اجودھیا کیا اپنی پوری مملکت کو عدل و انصاف سے بھر دیا۔ ہر چند کہ بہار دہلوی تھے۔ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر بھی اٹھا نہیں رکھی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جو کچھ لکھا ہے رواں بھی ہے اور سلیس بھی۔ مگر ان کی مثنوی میں وہ شاعرانہ حسن و جمال موجود نہیں جو خوشتر کی مثنوی میں کارفرما ہے۔ اس میں وہ ناظمانہ لطف و مزہ پیدا نہیں ہوا جو فرحت کی رامائن میں ہے۔ ایک مرتبہ ایک استاد شاعر سے، اُن کے نزدیکی اور منجھے ہوئے شاگرد وں نے کہا کہ اگرچہ آپ کہا کرتے ہیں کہ اب تم لوگوں کو اصلاح کی ضرورت نہیں، مگر ہمارے اشعار میں وہ کیف نظر نہیں آتا جو آپ کے اشعار میں جلوہ گر ہے؟ استاد نے مسکرا کے کہا تھا کہ استاد، استاد ہی ہے۔" ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ "استاد، استاد ہی ہے۔"

۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء میں رامائن کو اردو نظم کا چوتھا زرنگار جوڑا پہنانے والے منشی رام سہائے تمنا لکھنوی ہیں۔ اس مثنوی میں تمنا نے حسب دستور بڑی سلاست و روانی دکھائی ہے۔ بقول: ؎

وہ ذکر لکھوں کہ دل پھڑک جائے :: گلزارِ سخنوری مہک جائے

تمہید میں انھوں نے خوشتر و فرحت کی مثنویوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اُن کے محاسن کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس مثنوی سے نمونہ کے لئے وہ حصہ سنئے جبکہ صوبۂ بہار کے ضلع چمپارن کے ایک مقام جنک پور میں جانکی جی کا ظہور ہوا تھا: ؎

اک شہر نفیس تھا جنک پور :: مرغوبِ زمانہ، مخزنِ نور
راجہ تھا یہاں کا اہلِ اکرام :: مشہورِ زمانہ وجنک رام
اک روز چلا برائے گلگشت :: گذرا سوئے کشت و گلشن و دشت
پیدا تھا نشانِ خشک سالی :: برہم ہوئی غم سے طبعِ عالی
بُلوا کے منجمانِ عاقل :: کہنے لگا حکم رانِ عادل
بارش کے نزول کی ہو تدبیر :: مطلب کے حصول کی ہو تدبیر
بولے کہ اگر حضورِ پُر نور :: جوتیں کھیتوں کو حسبِ دستور
پانی ابھی آسمان سے برسے :: کوئی نہ پھر آب کو، ترسے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

چنانچہ راجہ جنک اپنی رعایا کی خدمت اور اہلِ ملک کی فلاح کے لئے اپنے ہاتھ سے کھیت جوتنے لگے۔ ؎

اک جا پہ تہہِ زمیں سبُو تھا ؛ پنہاں وہ چمن میں مثلِ بُو تھا
راجہ نے وہیں جو ہل چلایا ؛ قدرت نے شگوفہ یہ کھلایا
شق ہوگیا وہ سبُو وہیں پر ؛ نازل ہوئیں چھمنیں زمیں پر
جب جاوۂ روئے پاک دیکھا ؛ دامنِ ظلمت کو چاک دیکھا
تھی چہرۂ پاک میں صفائی ؛ حاصل ہوئی دل کو روشنائی
گلشن ہوا جانکی سے آباد ؛ راجہ کا دلِ حزیں ہوا شاد
راجہ نے سمجھ کے دخترِ خاص ؛ آغوش میں لیا بصد اخلاص
حاصل ہوا دل کو لطف و آرام ؛ رکھا دختر کا جانکی نام

لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سیتا جی یا جانکی جی جو کہئے، اسی طرح ظاہر ہوئیں۔ اور اُن کی پیدائش یا اُن کے ظہور کے بعد، ملک میں خوب پانی برسا اور عوام وکسانوں کی تکلیف دور ہوگئی۔ اسی لئے اس علاقہ کے لوگ ہندو کاشتکار بعض جگہ پھاگن کے مہینہ میں اور بعض جگہ بھادوں کے مہینہ میں ایک پرب " جانکی جنم اُتسو" کے نام سے مناتے ہیں۔ پانی کا برسانا خدا کے اختیار کی بات ہے مگر کوئی سبب کا پیدا ہوجانا بھی ضروری ہے۔ مسلمان بھی عام طور سے عقیدہ رکھتے ہیں کہ نمازِ استسقار پڑھنے سے پانی برستا ہے۔ یا بزرگوں کی دعا سے بارش ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ایسا کرتے ہیں۔

تمنا لکھنوی نے رام و راون والے قصہ کو بمقابلہ دوسروں کے زیادہ تفصیل سے لکھا اور بیان کیا ہے۔ کہ ایک دن، جبکہ رام چندر جی بن باس ستے، سیتا جی کو لچھمن جی کی حفاظت میں، چھوڑ کر شکار کھیلنے چلے گئے اور ایک ہرن کے تعاقب میں مستقر سے بہت دور نکل گئے۔ یہ ہرن واقعی ہرن نہ تھا، بلکہ راون نے ہرن کی شکل اختیار کرکے یہ ترکیب کی تھی کہ وہ رام چندر جی کو سیتا جی سے الگ کرکے دور ہٹا دے۔ جب وہ کامیاب ہوگیا اور رام چندر جی بہت دور نکل گئے تو وہ وہاں سے غائب ہوگیا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اور اُن کے مستقر پر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے لچھمن جی کو سیتا جی سے الگ کر دینے کی یوں کوشش کی کہ اُس نے تھوڑی دور پر رام چندر جی کی آواز میں کراہنا شروع کر دیا۔ سیتا جی نے آواز کو پہچانا تو بیتاب ہو گئیں۔ جب اُن کا اضطراب بہت بڑھ گیا اور انھوں نے حقیقت جاننے پر اصرار کیا تو مجبوراً لچھمن جی اس طرف چلے البتہ بخیالِ حفظ ماتقدم انھوں نے سیتا جی کے گرد ایک خط یا حصار کھینچ دیا اور تاکید کر دی کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اُس حصار سے باہر نہ آویں۔ جب یوں لچھمن جی بھی سیتا جی سے الگ ہو گئے تو راون نے یہ چال چلی کہ :-

شکل اپنی بدل بہ حیلہ و فن :: اچھا خاصا بنا " برہمن "
زُنّار گلو سے تا کمر تھا :: قشقہ صندل کا ماتھے پر تھا
حسبِ معمول کچھ دعا کر :: سیتا کے قریب بولا آ کر
ہے فاقہ کشی سے غم نہایت :: حاضر ہو تو کچھ کرو عنایت
سیتا جی ترس کچھ اُس پر کھا کر :: دینے لگیں پھل اُسے بلا کر
وہ بولا کہ خط سے ہو کے باہر :: دو پھل کہ ہو پھل تمہیں برابر
حد سے جو بڑھا قدم سیتا کا :: راون انہیں لے کے واں سے بھاگا

عورت فطرتاً رحمدل ہوتی ہی ہے اور وہ طبعاً غمگسار واقع ہوئی ہے۔ وہ دوسروں کی تکلیف جان، سُن اور دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے۔ وہ ہر اُس موقع پر، جہاں رحم، خدمت اور ہمدردی درکار ہو، ہر طرح کی حفاظت، دور اندیشی اور عاقبت بینی سے بے نیاز و بے پروا ہو کر اُدھر جھک جاتی ہے۔ پھر سادھو بھی وہ تھا جو پھلوں کے بدلے "پھل" دینے کی دعا و بشارت دے رہا تھا۔ "اولاد" عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ پھر حالات یہ تھے کہ انہیں رام چندر جی کے بیمار و زخمی ہونے کا یقین ہو چکا تھا اور وہ ہر قیمت پر اُن کی صحت و سلامتی کی خواہاں تھیں، لہٰذا انہیں لچھمن جی کی نصیحت یاد نہ رہی نیز "سادھو" سے انھوں نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا، کسی احتیاط کا دھیان نہ رہا تا آنکہ وہ راون کے چنگل میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پھنس گئیں۔ اُدھر نقلی ہرن تو غائب ہو گیا۔ مگر ایک اصلی ہرن ہاتھ آ گیا۔ اور:۔

جب رام ہرن کو لے کے آئے ۔: آثارِ ملال آگے پائے
لچھمن کو میانِ راہ پاکر ۔: بولے یوں، اشکِ تر، بہاکر
سیتا کو کہاں اکیلے چھوڑا ۔: کیوں رشتۂ عقل و ہوش توڑا
وہ بولے کہ ہٹ انہیں رہی تھی ۔: آوازِ ملال کچھ سنی تھی
مجھ کو بہرِ تلاش بھیجا ۔: ہٹ کی، با صد خراش بھیجا
پر میں نے حفاظت ان کی، کی تھی ۔: حکمت سے لکیر کھینچ دی تھی

مگر جب دونوں بھائی قیامگاہ پر پہنچے تو سیتا جی کو غائب پایا۔ دونوں کی آویزش راون سے چل ہی رہی تھی اور دونوں راون کی طاقت و عظمت سے بھی واقف تھے۔ اس لئے فوراً سمجھ گئے کہ وہ راون کی مکاریوں، چالبازیوں اور زیادتیوں کا شکار بن گئیں۔ لامحالہ انہیں سخت صدمہ ہوا۔ تاہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اس لئے تلاش میں سرگرداں ہوئے اور بڑی مشکلوں سے پتہ چلا کہ حقیقتاً سیتا جی کو راون لے گیا ہے اور وہ اس کی قید میں ہیں۔ اب ان دونوں بھائیوں نے سیتا جی کی مخلصی اور راون تک رسائی کی ترکیبیں سوچنا شروع کیں۔ آخر کار یہی واقعہ رام چندر جی اور راون کی جنگ اور لنکا پر حملہ کا سبب ہو گیا۔

"رامائن" کو مسٹر جیمس کے "ایلیڈ" سے تشبیہ دینے کی وجہ غالباً یہی ہے کہ جس طرح "ہیلن" کا اغوا "ٹرائے" کی تباہی و بربادی اور ایک تاریخی جنگِ عظیم کا سبب بنا تھا، اسی طرح "سیتا جی" کا اغوا "لنکا" کی تباہی و بربادی اور ایک تاریخی جنگِ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ مگر مسٹر جیمس نے یہ فرق فراموش کر دیا کہ مغربی غیرت یہ تھی کہ ہیلن کے اغوا کے بعد اس کے لوگ اور اس کی قوم خاموش رہ گئی تھی۔ صدیوں بعد ہومر نے جب اہلِ اسپاٹا کا خون گرمایا تب جاکر یہ جنگ ہوئی۔ لیکن یہاں مشرقی حمیت یہ تھی کہ رام و لچھمن نے اسی وقت راون کی حکومت کا خاتمہ اور لنکا کو برباد کرکے سیتا کو چھڑا لیا۔ وہاں شاعر کی دلائی ہوئی غیرت محرک ہوئی اور یہاں دلی محبت نے حوصلہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دلایا - وہاں ہیلن بادلِ ناخواستہ ہی سہی، ہل مل گئی - لیکن یہاں سیتا یکہ و تنہا محصور و مقیّد رہی مگر گریاں و نالاں ہی رہی - پھر ہیلن اور سیتا کا کیا مقابلہ؟ رامائن کا اِلیڈ سے کیا تعلق؟ بہر کیف! رامائن اپنے رنگ کی منفرد کتاب ہے اور وہ تاریخ کی نظر میں لاکھ غیر یقینی سہی مگر اُس میں بنی نوع انسان کے لئے لاتعداد دروس و اسباق ہیں -

---

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تاریخ دہلی

کہا جاتا ہے کہ ایک مچھوا کی ایک کنواری لڑکی "ستیہ وتی" تھی۔ وہ اگرچہ بڑی حسین تھی مگر مچھوا زادی ہونے کی وجہ سے وہ نہایت بدبو مہکتی تھی۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے "پراشر رشی" دریا کے اُس پار جانے کو کنارہ پہنچے تو ستیہ وتی کو ایک کشتی میں دیکھا اور اُس کے حُسن پر فریفتہ ہو کے طالب وصل ہوئے۔ پہلے تو ستیہ وتی نے اپنے جسم کی بدبو کا عذر کیا تو رشی نے اُس کو اپنے فیض سے دور کر دیا جس کے بعد اُس کے جسم سے نہایت لطیف خوشبو پھوٹنے لگی۔ اس کے بعد ستیہ وتی نے دن کی روشنی کا عذر کیا تو رشی نے اندھیرا کر دیا۔ بالآخر ستیہ وتی نے اپنے آپ کو "پراشر رشی" کے حوالہ کر دیا۔ اس اتصال سے ستیہ وتی حاملہ ہو گئی۔ مدتِ حمل گذرنے کے بعد اُس کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوا وہ عجیب و غریب تھا۔ اوّل تو وہ نہایت کریہہ المنظر تھا۔ دوم وہ مُردہ بھی تھا۔ ستیہ وتی نے اپنے بچے کی یہ حالت دیکھی تو بیحد مغموم اور پریشان ہوئی۔ اُس نے بچے کے باپ پراشر رشی کو یاد کیا اور وہ آموجود ہوئے۔ انھوں نے بچے کو زندہ کر کے سانولا سلونا بنا دیا۔ بچہ زندہ ہو کر رونے لگا۔ ماں بیحد خوش ہوئی۔ اُس نے بچے کا نام "کرشن" رکھا۔ (کرشن کے معنی ہی سانولے سلونے کے ہیں)۔ یہی بچہ "مہرشی کرشن دَویپاین وید ویاس" کہلا کر زندہ جاوید بن گیا۔ "دویپاین" کے معنی "الجزائری" کے ہیں، ویاس جی "دَویپاین" اس لئے کہلائے کہ وہ ایک جزیرے میں پیدا ہوئے تھے۔ ویاس جی ہی نے ویدوں کی پہلی بار تدوین و تبویب کی۔ اور اُسے چار الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا۔ مہابھارت اور اٹھارہ پُران بھی ان ہی کی گرانقدر تصنیفات کہی جاتی ہیں۔ ویاس جی ہندوستان کا عظیم ترین شخصیت کا اکثر ... تعوذ اللہ کو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"مہرشی" یعنی "رشیوں میں عالی مرتبت" کہا جاتا ہے۔ اُن کے دو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے پیدا ہونے کی مشہور روایت جاہلانہ خرافات کی حیثیت رکھتی ہے۔ "ویاس" کے لفظی معنی "قطر" کے ہیں، جو دائرہ کو دو ٹکڑوں میں بانٹتا ہے، اس لئے جاہلوں نے خود اُن کے دو ٹکڑوں میں بٹے ہونے کی روایت گھڑ لی، حالانکہ یہ خطاب ویدوں کی باقاعدہ تقسیم کے سلسلے میں ملا تھا۔

لوگ پیغمبروں اور دیوتاؤں کے ساتھ اس طرح کے قصے جوڑ دینے کے بڑے ماہر اور شوقین ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں بھی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ فلسطین کے بادشاہ پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہاں بھی ایک بیوی سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوا تھا جو ہاتھ سے لُنجا اور پاؤں سے اپاہج پیدا ہوا تھا اور اُس کو آنکھ نہ تھی مگر وہ دیکھتا۔ زبان نہ تھی مگر بولتا تھا۔ مگر وہ ہو یا یہ، یہ عوامی روایت ہے جس کی کوئی حقیقت واصلیّت نہیں۔

کہا گیا ہے کہ ویاس جی کی ولادت کے بعد ستیہ وتی بدستور کشتی رانی اور ماہی گیری میں لگ گئی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن اتفاقاً ہستناپور کے راجہ شانتنو، کسی خاص سبب سے، بھیس بدلے ہوئے دریا کے کنارے آئے اور دریا پار جانے کے لیے کشتی کے خواہاں اور متلاشی ہوئے۔ ستیہ وتی وہاں موجود تھی۔ اُس نے اپنی کشتی پیش کی۔ راجہ شانتنو نے دریا پار کیا مگر ستیہ وتی کے حسن اور اس کی جسمانی خوشبو نے انہیں بہت متاثر کیا۔ واپسی میں راجہ ستیہ وتی سے شادی کے خواہاں ہوئے۔ ستیہ وتی نے عذر کیا کہ ایک تو آپ سن رسیدہ ہیں۔ دوسرے آپ کا لڑکا "دیو برت" موجود ہے جو آپ کے بعد تخت نشین ہوگا اور ہم سے جو بچہ ہوگا وہ اُس کا غلام بن کے رہے گا۔ لہٰذا میں اپنے کو "غلاموں کی ماں" بننے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ راجہ شانتنو ناشاد و ناکام لوٹ گیا اور بالعموم مغموم رہنے لگا۔ دیو برت کو جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے ستیہ وتی سے مل کے وعدہ کیا کہ وہ نہ تو گدّی کا کبھی خواہاں ہوگا اور نہ شادی کرے گا کہ اُس کی اولاد تخت وتاج کی خواہش

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کرے۔ لہٰذا وہ راجہ سے شادی کرلے۔ اس عہد و پیمان کے بعد ستیہ وتی نے راجہ شانتنو سے شادی کرلی۔ چونکہ یہ ایثار و قربانی کا زبردست مظاہرہ تھا اس لئے "دیوبرت" کو "بھیشم پتاما"، یعنی "نہایت شدید" کہا جانے لگا۔ اور وہ تارک الدنیا ہو کر عبادت و ریاضت میں لگ گئے۔ شادی کے بعد ستیہ وتی سے راجہ شانتنو کے یہاں دو لڑکے ہوئے "چترانگد" اور "وچتر برج"۔ اِن دونوں کے جوان ہونے پر دونوں کی شادی ہوئی مگر کسی کو کوئی اولاد نہ ہوئی۔ آخر ستیہ وتی کے رشی زادہ بیٹے ویاس سے رجوع کیا گیا۔ کہ وہ اِن رانیوں کو بیٹے دیں، ورنہ راجہ شانتنو کی نسل ختم ہو جائے گی۔ ویاس نے اس کو منظور کیا۔ "چترانگد" کی رانی جب ویاس کے پاس آئی تو شرم سے اُس نے اپنی آنکھ پر پٹی باندھ لی جس وجہ سے جب اُس کو بیٹا پیدا ہوا تو وہ اندھا پیدا ہوا۔ یہی بچہ "دِھرت راشٹر" کے نام سے مشہور ہوا جو اندھا تھا۔ "وچتر برج" کی رانی جب ویاس سے ملنے گئی تو اس نے پیلی مٹی اپنے بدن پر مل لی، جس وجہ سے جب اس کو بیٹا پیدا ہوا تو وہ سر سے پاؤں تک زرد تھا۔ یہی بچہ "پانڈوین" کہلایا۔ اِن دونوں رانیوں کی خدمت پر جو دائی مامور تھی، وہ بڑی چلتا پرزہ تھی۔ وہ بھی خوب بناؤ سنگھار کر کے ویاس کے پاس پہنچ گئی۔ نتیجتاً اُس کو جو بیٹا پیدا ہوا وہ بڑا ذہین و فطین تھا۔ یہی بچہ بعد میں "بِدُر" کہلایا۔

راجہ شانتنو کے انتقال کے بعد جب گدّی نشینی کا مسئلہ اٹھا تو اُن کے بڑے لڑکے "چترانگد" مر چکے تھے اور چترانگد کا لڑکا دِھرت راشٹر اندھا تھا اس لئے راج گدّی پر راجہ شانتنو کے دوسرے بیٹے "وچتر برج" بیٹھے۔ اور ان کے مرنے پر اُن کے لڑکے پانڈوین تخت نشیں ہوئے۔

دِھرت راشٹر کے اندھے ہوتے ہوئے بھی، ان کی شادی گندھار کی راجکماری سے ہو گئی تھی جس سے دِھرت راشٹر کو ایک سَو بیٹے پیدا ہوئے اور وہ سب "کورو" ہی کہلائے۔ ان میں سب سے بڑے لڑکے "دریودھن" تھے۔

پانڈوین نے دو شادیاں کیں۔ ایک رانی کنتی سے۔ اس رانی کنتی کو شادی ہونے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے پہلے ہی ایک لڑکا پیدا ہو چکا تھا جس کا نام "کرن" تھا۔ مہابھارت میں اس لڑکے نے بڑا کام کیا اور بہت نام پیدا کیا۔ کُنتی سے پانڈوں کے تین بیٹے ہوئے، یدھشٹر بھیم اور ارجن۔ اور دوسری رانی مادری سے دو بڑے نکل اور سہدیو۔ ابھی یہ پانچوں راجکمار تعلیم و تربیت ہی حاصل کر رہے تھے کہ پانڈو کا انتقال ہو گیا۔ قاعدہ کے مطابق پانڈوں کے بڑے لڑکے یدھشٹر کو تخت نشین ہونا تھا مگر وہ کمسن تھے۔ اس لئے دھرت راشٹر سے کہا گیا کہ وہ اُس وقت تک کے لئے کاروبارِ حکومت چلائیں جب تک کہ یدھشٹر بالغ نہیں ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے منظور کر لیا۔ مگر چونکہ وہ اندھے تھے اس لئے انھوں نے اپنا وزیر و مُشیر یا مختار عام اپنے بڑے بیٹے دریودھن کو بنایا۔ جو بڑے سیانے تھے۔

دریودھن نے یہ نادر موقع ہاتھ سے جانے دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے حق میں مستقلاً انتقال حکومت کی ترکیب یہ نکالی کہ کسی رات کو پانڈوں کے گھر میں آگ لگا کے اُن سبھوں کو مار ڈالنے کی سازش کی۔ مگر سازشیوں میں سے کسی نے عین وقت پر پانڈوں کو خبر کر دی اور وہ سب اُس خبر دہندہ کے مشورے کے مطابق بڑی خاموشی کے ساتھ راتوں رات گھر سے نکل کے جنگل میں جا کے چھپ گئے۔ آگ لگائی گئی جو ایسی غضبناک تھی کہ کئی دنوں تک بجھائی نہ گئی یا بجھائی نہ جا سکی اور دریودھن بڑے خوش تھے کہ یہ قصّہ ہمیشہ کے لئے پاک ہو گیا۔ اور وہ سب جل کے خاکستر ہو گئے۔ اندھے دھرت راشٹر اس سازش سے بالکل بے خبر رکھے گئے۔

پانڈوں نے بھی رات جنگل میں گذارنے کے بعد، شہر کو واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور ماں نے مشورہ دیا کہ کہیں دُور چل دیا جائے ورنہ مبادا کوئی دوسری سازش کی جائے اور ہم سبھوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ لہذا پانڈون جنگل سے کسی لامعلوم منزل کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر میں جب گھومتے پھرتے قنوج پہنچے تو وہاں کی راجکماری دروپدی کے سوئمبر کی تقریب منعقد ہونے کی خبر گرما گرم تھی۔ یہ سب بھی تماشا دیکھنے کو ٹھہر گئے۔ قدیم ہندوؤں میں عورتوں کو اپنی شادی اپنی پسند سے کرنے کا اختیار حاصل تھا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اور طریقہ انتخاب یہ رائج تھا کہ کسی خاص دن، تمام امیدواروں کو حاضر ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔ اور اگر راجکماری کی خواہش ہوتی تھی تو اُس کی مرضی و پسند سے کوئی کڑا امتحان رکھ دیا جاتا تھا تاکہ راجکماری کا شوہر بہترین اور نامور منتخب ہو۔ جو شخص اس امتحان میں کامیاب ہوتا تھا یا بلا امتحان ہی راجکماری جس شخص کو، جس سبب سے بھی منتخب اور پسند کر لیتی تھی، اس کے گلے میں ہار ڈال دیتی تھی یہی ثبوت پسندیدگی و انتخاب کا بھی تھا اور عام اعلان کا بھی۔ اس رسم کو "سوئمبر" کہا جاتا تھا۔

پانڈوں کو جب قنوج میں اس دلچسپ تقریب کی خبر ملی تو وہ وہاں ٹھیر گئے اور تماشا دیکھنے کے شائق ہوئے۔ سوئمبر کی تقریب میں اگرچہ بالعموم راجکمار اور اُمراء کے لڑکے ہی حصہ لیا کرتے تھے مگر یہ لازمی قید نہ تھی۔ عوام کو بھی اُس میں حاضر ہونے، تماشہ دیکھنے بلکہ آخر میں حصہ لینے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔ پانڈوں اگرچہ شاہزادے تھے مگر وہ غریب الوطنی میں فقیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے اور بحیثیت شاہزادہ اُس تقریب میں حصہ لینے اور اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ صرف تماشائی بننا چاہتے تھے، کیونکہ ایک تو سفر کی صعوبتوں سے پریشاں خاطر تھے اور دلبستگی کے اس موقع کو کھونا نہ چاہتے تھے۔ دوسرے راجکماری دروپدی کے حُسن کا بڑا شہرہ اور چرچا تھا لہٰذا اس کو دیکھنے کا شوق رکھتے تھے۔ تیسرے، اس سوئمبر میں ایک امتحان رکھا گیا تھا وہ یہ کہ ایک چوڑے لگن میں جو ایک چھوٹے تالاب کے مشابہ تھا، پانی بھروا کے رکھ دیا گیا تھا اور اُس میں ایک زندہ چھوٹی مچھلی چھوڑ دی گئی تھی۔ اور اُس لگن کے نیچے دھیمی آگ روشن کرا دی گئی تھی تاکہ وہ مچھلی تہہ نشین نہ ہو یا کسی مقام پر ٹھیر نہ سکے، بلکہ پریشان و بے قرار رہے۔ دیگ کے پاس ایک نہایت بھاری کمان اور تیروں کے گچھے رکھ دیے گئے تھے۔ اعلان یہ تھا کہ جو بہادر نشانہ باز، اس تیر و کمان کے ذریعہ، اُس مچھلی کو نشانہ بنا دے گا، اُسی کو راجکماری دروپدی منتخب کرے گی۔ اِس طور پر طاقت اور نشانہ بازی دونوں چیزوں کا امتحان مقصود تھا، کیونکہ کمان اتنی وزنی تھی کہ اُسے کوئی ایک آدمی مشکل

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نہ سکتا تھا، چہ جائیکہ چلّہ کھینچنا اور اس سے تیر سر کرکے نشانہ لگانا اور وہ بھی ایسی چھوٹی مچھلی پر، جو چشم زدن میں بیسیوں چکر لگا رہی تھی۔ ارجن کو اپنی نشانہ بازی پر بڑا ناز تھا اور اس امتحان میں بڑے بڑے نشانہ باز شریک ہونے والے تھے اس لئے بھی ارجن کو خاص طور سے اس تقریب و مقابلہ کو دیکھنے کا شوق تھا۔

مقررہ دن پر تقریب منعقد ہوئی۔ یہ پانچوں بھائی بھی تماشا دیکھنے گئے۔ راجکماری دروپدی پھولوں کا ہار لئے آئی۔ امیدوار یکے بعد دیگرے آتے اور کمان اٹھانے کی کوشش کرتے مگر ناکام ہوکر شرمندہ لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ تاآنکہ سارے امیدوار اور طلبگار یا تو ختم ہو گئے یا بہتوں نے اس ذلت سے بچنے کے لئے، اس کا حوصلہ اور خیال ہی ترک کر دیا اور خاموش تماشائی بن گئے۔ جب امیدواروں کی آمد و شرکت کا سلسلہ بند ہو گیا تو اعلان عام ہوا کہ حاضرین اور تماشائیوں میں سے بھی جو چاہے اس تقریب میں حصہ لے سکتا ہے۔

اس اعلان کے ہوتے ہی تماشائیں ارجن کے خون میں حرارت آگئی اور وہ جوش میں، تماشائیوں کے مجمع سے نکل کے صفیں چیرتا ہوا موقعۂ امتحان پر پہنچ گیا۔ کچھ لوگوں نے اس کمسن چھوکرے کو اور اس کی جرأت و ہمت کو حیرت کی نظر سے دیکھا اور مسکرائے۔ ارجن نے کسی کی بھی کوئی پرواہ نہ کی۔ خدا کا نام لے کر کمان کو ہاتھ لگایا اور پہلے ہی زور میں کمر تک اور دوسرے زور میں سینہ تک لاکے زِہ کیا۔ یہ حیرت ناک منظر دیکھ کر شاباشی کا عظیم شور بلند ہوا، یہاں تک کہ جوش و حیرت میں راجہ اور راجکماری کھڑے ہو ہو گئے۔ پانچویں تیر میں ارجن نے مچھلی کو چھید کر رکھ دیا۔ پورے مجمع سے صدائے تحسین اور شورِ آفریں بلند ہوا۔ راجکماری نے دفورِ جوش میں دوڑ کر وہ ہار ارجن کے گلے میں ڈال دیا۔ کسی بھی مقابلے میں اگر عورت کی طرف سے پیش کی ہوئی شرط کا پورا کرنے والا کوئی نہیں ملتا، تو وہ اپنی سخت توہین اور ذلت سمجھی ہے جو اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ لہذا یہ ممکن بھی نہ تھا کہ دروپدی، فاتح و کامیاب ارجن کی ظاہراً مفلوک الحالی اور اس کے نامعلوم حسب و

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نسب کی پرواہ کرتی۔ چنانچہ جب درو پدی نے ارجن کو ہار پہنا دیا اور اپنے انتخاب کا یوں اعلان کر دیا، تو سارے مجمع سے مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ راجہ متوجہ کو بھی ارجن کے حیرتناک کارنامہ کی مسرت تو ضرور ہی ہوئی کیونکہ خوبصورت ارجن نے غیر معمولی بہادری و مہارت کا ثبوت دیا تھا مگر اُس کی ذات سے ناواقفیت اور اُس کی ظاہری مفلوک الحالی سے وہ کچھ متامل تھے۔ تاہم بیٹی کے انتخاب و فیصلہ اور عوام کی محبت و پسندیدگی کی وجہ سے انھوں نے بھی ارجن کو پاس بُلا کے شاباشی اور مبارکباد دی۔ اور جب پانڈوں اُن کے شاہی مہمان بنے اور راجہ درو پد کو سب حقیقت معلوم ہوئی تو انہیں بڑی مسرت ہوئی کہ ارجن راجکمار ہے۔ راجکماری درو پدی باپ سے رخصت ہو کر ارجن کے مستقر پر آگئی اور ماں کے ایک قول کی بنا پر وہ پانڈوں کی مشترک بیوی بنی۔ کئی برس کی طویل مدت گزار کے پانڈوں نے گھر لوٹنے کا فیصلہ کیا اور وہ ہستنا پور کے لئے روانہ ہو گئے۔

یہاں پہنچنے پر انہیں راجہ دھرت راشٹر نے خوش آمدید کہا کیونکہ وہ دریودھن کی سازش سے بے خبر تھے اور سمجھتے تھے کہ اس اتفاقی آگ میں وہ لوگ واقعی جل مرے۔ دریودھن بھی اب تک یہی سمجھتے رہے تھے اور خوش تھے کہ پانڈوں جل مر چکے ہیں۔ مگر اب جو سب تمام صورتیں سامنے آگئیں تو نہایت متوحش اور سراسیمہ ہوئے۔ دھرت راشٹر نے اس آزمائش کے لئے کہ آیا انہیں حکمرانی کا سلیقہ حاصل ہے یا نہیں، انہیں نصف سلطنت کا مختار کُل بنا دیا۔ پانڈوں نے خون خرابہ کر کے پوری حکومت حاصل کرنے سے، بلا تردد، نصف حکومت مل جانے کو غنیمت تصوّر کیا اور ہستنا پور سے ۷۵ میل جنوب مشرق میں، ایک نیا شہر "اندر پرستھ" کے نام سے آباد کر کے اپنی الگ حکومت قائم کی۔ یہی نیا شہر "اندر پرستھ" اب "دلّی" کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔

سنہ ۱۸۴۶ء میں سر سید نے "آثار الصنادید" کے نام سے ایک نہایت گرانقدر کتاب لکھی تھی جس میں انھوں نے دلّی اور اُس کی تمام عمارتوں کا تاریخی حال لکھا تھا اور سب کی تصویریں دی تھیں اور تمام کتبے نقل کئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے سنہ ۱۸۵۲ء میں ایک رسالہ "سلسلۃ الملوک" کے نام سے لکھا تھا جس میں دلّی کے سارے حکمرانوں کا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ بعد میں اس رسالہ کو "آثار الصنادید" کی دوسری ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۵۴ء میں بطور باب اوّل کے شامل کر دیا گیا تھا۔ اس میں بادشاہوں کی مکمل فہرست ہے جس کی ابتدا راجہ یدھشٹر (۱۴۷۵ قبل مسیح) سے ہوئی ہے اور انتہا ملکۂ وکٹوریہ (۱۸۳۷ء) پر ہوئی ہے۔ یہ دو سو دو راجوں اور بادشاہوں کا مسلسل و مکمل نقشہ اور تین ہزار دو سو نوّے برسوں کا چارٹ ہے۔ سر سیّد کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی تھی اور انگریزی و فرانسیسی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا تھا۔ اسی کتاب پر ازراہِ قدردانی ملکۂ وکٹوریہ نے سر سیّد کو، لندن کی سب سے بڑی علمی انجمن "GREAT BRITAIN AND IRELAND'S ROYAL ASIATIC SOCIETY" کا "آنریری فیلو" مقرر کیا تھا۔ یہ وہ اعزاز تھا جو اس سے پہلے کسی ہندوستانی کو نہ عطا ہوا تھا۔ دلّی کے سلسلہ میں سر سیّد کی یہ کتاب سند (AUTHORITY) سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب میں سر سیّد نے شہر "اندرپرستھ" کے "دلّی" ہو جانے کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔

"اس بات میں بڑا اختلاف ہے کہ اندرپت کا نام دلّی کیسے ہو گیا؟ یہ بات بہت مشہور ہے کہ راجہ دلیپ نے جو چندر بنسیوں میں کا ایک راجہ ہے، اپنے نام پر دلّی آباد کیا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، اس واسطے کہ ہندوؤں کی اگلی پوتھیوں میں باوجودیکہ راجہ دلیپ کا ذکر موجود ہے، مگر کہیں بھی "دلّی" کا نام نہیں۔ بلکہ جہاں لکھا ہے اندرپت ہی کر کے لکھا ہے اور بعضے تاریخوں میں لکھا ہے کہ ۳۰۷ھ (۹۱۹ء) کے تنوروں کے خاندان میں سے ایک راجہ نے شہر اندرپت کے برابر "دہلی" شہر بسایا۔ چونکہ وہاں کی زمین نرم تھی اور ہندی میں نرم زمین کو جس میں میخ نہ تھم سکے، "دہلی" کہتے ہیں اس وجہ سے وہ بستی "دہلی" کر کے مشہور ہو گئی۔ مگر اس سنہ میں نہ تنوروں کے خاندان میں حکومت تھی اور نہ اس سبب سے دلّی نام پڑ جانا قرینِ قیاس ہے۔ اس واسطے یہ بات بھی قابلِ اعتماد کے نہیں۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مشہور بات، جو صحیح بھی معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ راجہ "دہلو" قنوج کے راجہ مرآت آفتاب نمائے ۔ اس سبب سے کہ دلی کے راجہ، اکثر قنوج کے تابع رہے ہیں، اندر پت میں اپنے نام پر شہر بسایا، جب سے اس شہر کا نام دہلی مشہور ہوا۔ بلکہ اصلی نام "دہلی" کا "دہلو" ہے۔ چنانچہ امیر خسرو نے، جلال الدین فیروز شاہ کو خطاب کر کے "دہلو" کا لفظ ایک شعر میں باندھا ہے: ؎

یا نک آسیم بخش یا نا خور بفرما بار گیر
یا بفرماں دہ کہ گردوں شینم و "دہلو" روم

راجہ دہلو، راجہ پورس یعنی فور، راجہ کمایوں کے ہمعصر تھا! ورانہی کی لڑائی میں مارا گیا اور قنوج تک راجہ فور کا عمل ہو گیا۔ اس کے بعد اسکندر کبیر شاہ ماسیدن یعنی مقدونیہ نے راجہ فور پر ستلج کے کنارے فتح پائی اور گنگا کے کنارے تک یعنی قنوج تک عمل دخل کر لیا۔ یہ واقعہ تین سو اٹھائیس قبل حضرت مسیحؑ ہوا کہ تخمیناً یہی زمانہ دہلی شہر بسنے کا خیال ہو سکتا ہے۔"

غالباً سنہ متعین کرنے میں سر سید نے غلطی کی ہے کیونکہ سکندر اعظم کا انتقال ۳۲۳ قبل مسیح میں ہو گیا تھا اور اس کی جو کچھ فتوحات تھیں اس کی زندگی میں ہوئیں۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے امرا، سپہ سالاروں اور دوستوں نے فتح شدہ علاقہ کو صرف قابو میں رکھا۔ بہر حال! اس تحقیق سے ثابت ہو جاتا ہے کہ دہلی کی تاریخ کیا ہے؟

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جنگ مہابھارت اور کتاب

ہستناپور کی حکومت دریودھن کے ہاتھ میں تھی اور اندر پرستھ کا نظم و نسق یدھشٹر کے تعلق تھا۔ مگر دونوں کی حالت مختلف و متضاد تھی۔ یدھشٹر مطمئن تھے کہ امتحان کے بعد بقیہ نصف ملک بھی ان کے قبضہ میں آجائے گا۔ اور دریودھن مضطرب تھے کہ اس نصف کو دوبارہ کس طرح حاصل کیا جائے؟ چنانچہ انھوں نے یدھشٹر سے دوستی گانٹھی اور ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست بن گئے اور جب مراسم پکّے ہو گئے تو انھوں نے یدھشٹر کو جوا کھیلنے کا شوق دلایا۔ اور اس جوئے میں دریودھن نے کچھ ایسی حکمت چھپا رکھی تھی کہ ہمیشہ پانسہ دریودھن ہی کے حق میں پڑتا تھا۔ اس جوئے میں یدھشٹر نے ساری دولت ہار دی۔ اس کے بعد جوش میں آکر ایک داؤں میں اپنی حکومت بھی ہار دی۔ اس جوئے بازی کی خبر جب دھرت راشٹر کو ہوئی تو انہیں بڑا غصہ آیا اور انھوں نے جوا کھیلنے اور سلطنت نہ سنبھال سکنے کی سزا میں، چودہ سال کے لئے پانڈوں کو جلا وطن کر دیا۔ اب پھر دریودھن، پوری مملکت کے مختارِ کل ہو گئے۔

پانڈوں نے جوں توں کر کے یہ چودہ سال بِتائے اور پھر واپس ہستناپور پہنچے۔ شرط پوری ہو چکی تھی اس لئے دھرت راشٹر نے ایفاء عہد کرنا چاہا مگر اب وہ کبیر سنی کی آخری منزل میں تھے اور عملاً کاروبارِ حکومت سے دست کش اور گوشہ نشین ہو چکے تھے، اس لئے دریودھن، پانڈوں کو کُل کیا، نصف ملک کی حکومت بھی دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب کے پانڈوں نے بھی دبنا پسند اور منظور نہ کیا۔ اور اپنا حق حاصل کرنے پر اڑ گئے۔ نتیجتاً مقابلہ کی ٹھہر گئی۔ اس جنگ میں ہندوستان کے تمام راجے دریودھن کی طرف تھے اور کرشن جی پانڈوں کے ساتھ تھے۔ یہ لڑائی کروکشیتر کے میدان میں اٹھارہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دنوں تک لڑی گئی جس کے نتیجے میں کہا جاتا ہے کہ بیالیس لاکھ سرسٹھ ہزار ننانوے آدمی مارے گئے۔ اور اصل فوق میں سے صرف تین فرد "کوروں" میں کے اور سات افراد "پانڈوں" میں کے زندہ بچے۔ اس جنگ کے بعد راجہ دھرت راشٹر نے پوری حکومت "پانڈوں" کے حوالہ کردی۔ اور خود اپنی بیوی سمیت جنگل میں چلے گئے۔ اور جب یہ دونوں میاں بیوی روانہ ہونے لگے تو پانڈوں کی ماں، بھی ترک دنیا کا فیصلہ کرکے اُن کے ساتھ ہو گئیں اور آخراً یہ لوگ جنگل میں آگ کے حادثہ کا شکار ہو کر مر گئے۔ اس جنگ کے چھتیس[۲۶] سال بعد یدھشٹر نے ارجن کے پوتے "پریکھت"، کو، جو راجہ بہمن کے بیٹے تھے، تخت نشین کرکے اپنی بیوی دروپدی اور اپنے کتے کو لے کر ہمالیہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اُن کے ساتھ اور بھی خاندان کے کچھ افراد تھے جو ہمالیہ تک پہنچتے پہنچتے سب کے سب مر گئے۔ صرف یدھشٹر اور اُن کا کتا بچے۔

اسی جنگ عظیم کو "مہابھارت"، کہا جاتا ہے اور اس کو "بیاس جی" نے اپنی نادر اور شہرہ آفاق رزمیہ مثنوی میں نظم کیا ہے۔ "مہابھارت" کی جنگ کو عام طور سے ایک تاریخی واقعہ سمجھا جاتا ہے مگر جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، بہت سے لوگ اس کے واقعی تاریخی واقعہ ہونے کے منکر ہیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے اپنے اخبار "ہریجن" مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۴۶ء میں فرمایا کہ:۔

"میرے خیال میں مہابھارت ایک تمثیل ہے، تاریخ نہیں ہے۔ دروپدی کے پانچ خاوندوں سے مراد روح کا حواس خمسہ کے ساتھ تمسک ہے"۔

اس امر میں بھی اہل علموں اور محققوں کے درمیان سخت اختلاف ہے کہ یہ جنگ کب لڑی گئی؟ اور پھر اسے کتابی صورت میں کب قلمبند کیا گیا؟ روڈس لکھتا ہے:۔

"مہابھارت"، میں جس جنگ کا ذکر کیا گیا ہے، اُس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ تیرہویں یا چودھویں صدی قبل مسیح میں ہوئی تھی اور اُس کی روایات زبانی چلتی رہیں یہاں تک کہ صدیاں گذر گئیں۔ بعد میں یہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مختلف روایات، ایک شیرازہ سے منسلک کر کے رزمیہ شاعری کی صورت سے نظم کی گئیں "

پروفیسر میکڈانلڈ کا خیال ہے کہ :-

"مہابھارت مسیح سے پانچ سو سال قبل کے قریب تصنیف ہوئی ہے"

اجمل خاں نے گیتا کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ :-

"اس میں تو ذرا بھی شبہ نہیں کہ مہابھارت کی جنگ ہوئی اور اس میں آریہ قوم ہی کے دو گروہ ایک دوسرے سے لڑے، مگر تاریخ تصنیف کے متعلق یقینی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ ...... حضرت مسیح سے ایک ہزار سال قبل لکھی گئی ہے"

مسٹر گوونداس نے اپنی کتاب "ہندوازم" میں فرمایا ہے کہ :-

"ان میں بیشمار اختلافات ہیں۔ تین مختلف مرتب شدہ کتابوں کا ذکر تو خود مہابھارت کے اندر موجود ہے"

مہابھارت کے جو مختلف نسخے اس وقت موجود ہیں، خود اُن میں بھی سخت اختلافات ہیں، یہانتک کہ اشعار کی تعداد میں بھی بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر لیبان نے مہابھارت کے اشعار کی تعداد دو لاکھ پندرہ ہزار بتائی ہے۔ مگر بعض نسخوں میں صرف پچانوے ۹۵۰۰۰ ہزار اشعار ملتے ہیں، بعض میں پینسٹھ ہزار، بعض میں پینتیس ۳۵۰۰۰ ہزار یہاں تک کہ بعض نسخوں میں کُل پندرہ ۱۵۰۰۰ ہزار اشعار ملتے ہیں۔ ایک مورخ لکھتا ہے :-

"مہابھارت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ واقعات بڑھائے جاتے رہے۔ مختلف عہد کے شعرا نے اپنی اپنی رنگین بیانیوں سے اس کو ضخیم بنا دیا۔ ہر جدید مصلح نے اپنے خیال و اعتقاد اور ہر راوی نے اپنی ذاتی رائیں شامل کر کے مہابھارت کو اس قدر حشو و زوائد سے بھر دیا کہ اس وقت اُس کے اشعار کی تعداد نوے ۹۰۰۰۰ ہزار تک پہنچ گئی ہے"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اجمل خاں نے لکھا ہے:۔

"مہابھارت میں پہلی یا دوسری صدی قبل مسیح تک اضافوں کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے متعلق یہ امر خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اشوک کے جانشین کمزور تھے اور ۱۸۴ قبل مسیح میں سنگوں نے تخت سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بھی ہندو تھے۔ اہلِ تحقیق کا خیال ہے کہ ہندو ادبیات کو سنگوں کی حکومت نے بہت مدد دی اور اسی دور میں مہابھارت میں کافی اضافے کئے گئے اور آٹھ ہزار آٹھ سو ۸۸۰۰ اشعار مہابھارت کے ترقی کرتے کرتے بیس ۲۰۰۰۰ ہزار ہو گئے۔"

ان ہی اضافوں میں دیگر اجزا اور حصص کے ساتھ "گیتا" والا حصہ بھی اضافہ ہوا ہے، جس کا حقیقتاً مہابھارت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ کرشن جی کا زمانہ، مہابھارت کی جنگ سے ہزاروں برس بعد کا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے:۔

"رامائن اور مہابھارت کا زمانۂ تصنیف، متعیّن کرنا بہت مشکل ہے ...... اتنا ضرور ظاہر ہے کہ انہیں، بہت سے مصنّفین نے لکھا اور بعد میں بہت سے زمانوں میں اضافے ہوتے رہے۔"

غرض جس طرح مہابھارت کی جنگ کا مسئلہ متنازع ہے کہ واقعی ایسی کوئی جنگ ہوئی بھی یا نہیں؟ یا اس کا زمانۂ وقوع متنازعہ ہے کہ اگر یہ جنگ ہوئی تو کب ہوئی؟ اسی طرح مہابھارت کتاب کی تصنیف کا مسئلہ بھی متنازع ہے کہ وہ کب لکھی گئی ہے؟ اور اصل کتاب پہلے پہل کتنے اشعار کی حامل تھی؟ اور بعد میں کب کب؟ اور کتنے کتنے اضافے ہوئے؟ تاہم اتنا سب کو اعتراف ہے کہ یہ رزمیہ شاعری کا نہایت عمدہ مرقّع ہے اور جس قوّت و جوش سے واقعہ بیان ہوا ہے وہ یقیناً قدیم ہندوستان کی تاریخِ ادب کا ایسا ترکہ ہے جو تمام آریہ ورت کے باشندوں کے لئے وجہِ ناز ہے اور اس میں جو درس و اسباق ہیں وہ قابلِ قدر ہیں۔ چنانچہ رام چندر دہلوی نے لکھا ہے کہ:۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"مہابھارت میں اخلاق و مروت، شجاعت و سخاوت کے ساتھ ساتھ زمانہ کے نشیب و فراز، دشمنوں کے فریب و دغا، اخفائے راز اور آدابِ جنگ، یہانتک کہ سب آشرموں کے دھرم کرم، غرض دنیا کی تمام باتوں کا اس میں ذکر ہے۔ بلکہ میں پوچھتا ہوں کہ اس میں نہیں کیا ہے؟"

مہابھارت کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس کو تاریخی کتاب یا مذہبی صحیفہ سمجھنا غلط ہے۔ گاندھی جی نے کہا ہے کہ:۔

"اگر ایسی کوئی جنگ واقعی ہوئی بھی تو وہ ایک خاندانی جھگڑا تھا جو تخت و تاج کے حق کے سوال پر، دو شاہی خاندانوں میں برپا ہوا اور اس زمانہ کے آئینِ جنگ و جدل کے مطابق لڑا گیا..... اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ جو بھی لڑائی اس وقت کے آئینِ جنگ کے مطابق لڑی جائے، اسے حق و صداقت کی جنگ اور مذہبی رنگ کی چیز قرار دی جائے۔"

اسی طرح لسانی حیثیت سے مہابھارت کی قدردانی تو صحیح ہے مگر یہ کہہ کے مہابھارت کو مقدس گردانا کہ سنسکرت زبان قدیمی اور ازلی ہے، درست نہیں۔ مسٹر گووند داس نے لکھا ہے:۔

"یہ مقدس تعلیم کہ سنسکرت زبان، دیو بھاشا ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ قدیم زبان ہے، جھٹکے سے مسترد کر دینی چاہئے کیونکہ تاریخ، اس دعوے کا، کافی ابطال کر چکی ہے۔"

میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ سنسکرت زبان کی رزمیہ شاعری کی کتاب "مہابھارت" ہو یا فارسی زبان کی رزمیہ شاعری کی کتاب "شاہنامہ" یونانی زبان کی رزمیہ شاعری کی کتاب "الیڈ" ہو یا اردو زبان کی رزمیہ شاعری کی کتاب "مرثیۂ انیس" یہ سب نہ تو محض بے بنیاد اور صرف تخیلی چیزیں ہیں اور نہ وہ تمام و کمال صحیح

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

واقعات کی حامل اور سچے حالات کی ضامن مستند تاریخ ہیں۔ بلکہ ان سب کتابوں کی بنیاد البتہ صداقت و تاریخی واقعات پر رکھی گئی ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ شاعروں کے ساحرانہ اعجازِ کمال کا نمونہ ہے۔ اور انہیں اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ میرا یہ بھی نظریہ ہے کہ یہ سب کتابیں اپنے اپنے وقت میں ایک خاص مقصد سے تصنیف ہوئی ہیں۔

"جنگ"، عملی دنیا میں ادائے فرض اور عملی جدوجہد کا سب سے بڑا ذریعہ اور ثبوت ہے کیونکہ جنگ میں جان اور مال کی، جو دنیا کے ہر انسان کی عزیز ترین متاع ہیں، قربانی دینی پڑتی ہے۔ کسی قوم وملک کو عمل کے میدان میں اتارنا ہو تو اُس کو ابھارنے اُکسانے اور غیرت و اشتعال دلانے کا بجز اس کے کوئی دوسرا عمدہ، پُرتاثر اور باشوکت طریقہ نہیں کہ اُسے حقیقی یا تخیلی میدانِ جنگ اور عرصۂ وغا میں اتارا جائے۔ کارزارِ حیات میں جہد و عمل، بقائے حیات کے لئے لازمی اور لابدی چیز ہے۔

ہومر نے "الیڈ" اُس وقت لکھی تھی جب کہ اسپارٹا والے اس قدر بے حس اور بے غیرت ہو گئے تھے اور جنگ کی دہشت سے وہ اتنے مرعوب تھے کہ ہیلن کے اغوا کے بعد اُن کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ ٹرائے پر حملہ کریں اور اپنی قومی بے عزتی کا مداوا کریں۔ ہومر نے اِلیڈ لکھ کر جب اُن کو جوش دلایا تو وہ ہوش میں آئے اور جانفروشی کا جذبہ اُن میں پیدا ہوا۔

فردوسی نے "شاہنامہ" بھی اسی غرض سے لکھا تھا۔ ایران جب کیانی سلطنت کھو کر عربوں کے ہاتھوں مفتوح ہوا تو اہلِ ایران کا خون اتنا سرد ہو گیا کہ وہ غلامی پر قانع ہو گئے۔ حالانکہ یہ ایرانی وہی تھے جو اُس دور کی سب سے بڑی طاقت روما سے ٹکرایا کرتے تھے۔ تیسری صدی کے آخر میں جب فردوسی پیدا ہوا اور اُس نے عربوں کو بدستور ایران پر مسلّط پایا تو اُس نے اپنی قوم کے خون میں حرارت اور جوش پیدا کرنے کے لئے ایران کی ایک منظوم پُرشکوہ تاریخ "شاہنامہ" کی شکل میں لکھ ڈالی جس کا مقصد تاریخی حیثیت سے وقائع نگاری نہیں بلکہ شعر کے جادو سے دلوں کو مسخر کرکے، اپنی قوم کے سرد خون میں جوش پیدا کرنا تھا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میر انیس نے بھی ولولہ انگیز مرثیے اُس وقت لکھے تھے جب مسلمان، انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھا کھا کے مردہ ہو چکے تھے، دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کی حکومتیں کھو چکے تھے اور انگریزوں کے خلاف کچھ کرنے کی اُن کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ سر جھکا جھکا کے اپنی گردنیں کٹوا لیتے اور پُرامن طور پر توپوں کے دہانوں سے بندھ بندھ کر جانیں گنوا دیتے تھے۔ میر انیس نے چاہا کہ مسلمان، انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کریں اور اُن میں جوش و خروش پیدا ہو اس لئے اُنھوں نے پُرزور مرثیے لکھ ڈالے۔

تصنیف "مہابھارت" سے پہلے یا بعد کا کوئی مستند تاریخی سرمایہ ہمارے لئے موجود نہیں جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ اُس وقت اہلِ ہند علمی دنیا میں کس درجے پر تھے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ جس وقت مہابھارت تصنیف ہوئی ہے، یقیناً اُس وقت اُن کا ولولۂ جہد و عمل سرد ہو چکا تھا۔ حوصلۂ سعی و کاوش وہ کھو چکے تھے اور اُن کا خون ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ "مہابھارت" کے دیدہ ور مصنّف نے اِس انحطاط و پستی کا قرار واقعی اندازہ کیا اور اس کی سخت ضرورت سمجھی کہ اُن کے خون کو گرمایا جائے، اُنھیں جہد و عمل کا حوصلہ دلایا جائے اور اُن کو سعی و کاوش کے میدان میں اُتارا جائے،

لہٰذا اُس نے کاغذی میدان میں ایک ایسی جنگ برپا کی جس میں ہندوستان کے سارے لوگ شریک ہوں۔ اور اُس کی بنیاد کے لئے ضروری تھا کہ کسی نہ کسی تاریخ اور حقیقی تحریک کو لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ اس لحاظ سے "مہابھارت" نہ صرف رزمیہ اور سنسکرت ادب کا بے نظیر مرقع ہے، بلکہ ہندوستانی قوم کو باحوصلہ و باعمل بنانے اور کارزارِ حیات میں مردانہ وار حصہ لینے کا شوق دلانے والا شاہکار بھی ہے۔

چونکہ "مہابھارت" اور "شاہنامہ" کا ذکر نکل آیا ہے اور ایرانیوں کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات ہمیشہ رہے، اس لئے غالباً بے موقع نہ ہوگا کہ ان دونوں کی یکسانیت و مماثلت کے بارے میں اہلِ تحقیق کے جدید نظریے کا یہاں پر ذکر کر دیا جائے۔ یہ موضوع دلچسپ بھی ہے اور جہد آفریں بھی۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

فی زمانہ بہت سے محققین اس امر پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے "آرین" اور باشندے کے "ایرانی" اصلاً ایک ہی قوم ہیں۔ اُن کی تحقیق کے مطابق ہندوستان کے آریوں میں عقائد و زبان دونوں کے اعتبار سے زبردست اشتراک پایا جاتا ہے۔ اُن کی تلاش و تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ویدک گیت کا تقریباً ہر ایک مصرع اَوِستا کی زبان میں اور اَوِستا کا ہر ایک جملہ ویدک زبان میں ذرا سی تبدیلی سے منتقل ہو سکتا ہے۔ اُدھر ایران میں غیر معروف قدیمی مخروطی حروف میں لکھے ہوئے ایسے کتبے ملے ہیں جن کی زبان سنسکرت سے مشابہ اور ژند و اَوِستا کی زبان ہے۔ اِدھر ہندوستان میں ایسے قدیمی سکّے دستیاب ہوتے ہیں جن پر قدیمی پہلوی حروف سے ملتے جلتے حروف پائے جاتے ہیں جو دائیں طرف سے بائیں جانب کو لکھے ہوئے ہیں۔ موجودہ فارسی اور سنسکرت زبان کے سینکڑوں الفاظ ایسے تلاش کئے گئے ہیں جو آپس میں پوری پوری طرح مشابہت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان بنیادوں پر محقّقین نے دعویٰ کیا ہے کہ سنسکرت زبان اور قدیم ایرانی زبان یعنی پارسی یا پہلوی زبان کا ماخذ ایک ہے۔

ایرانیوں اور ہندوستانیوں میں عقاید کا بھی غیر معمولی اشتراک پایا جاتا ہے۔ ایرانیوں کے یہاں تعمیر و تربیت کا ذمہ دار "یزدان" تھا۔ ہندوؤں کے یہاں یہی پوزیشن وشنو بھگوان یا اندرجی کی ہے۔ اور جس طرح ہندوؤں کے یہاں دیوجی، تخریب و تباہی کے دیوتا ہیں، ویسی ہی پوزیشن ایرانیوں کے یہاں اہرمن کی ہے۔ ایران کے زرتشتی مذہب میں آگ کی پرستش ہوتی ہے ہندوستان میں بھی اگنی کو قابلِ پرستش یا لائقِ احترام سمجھا جاتا ہے۔ ویدَ میں جو مفہوم "منترِ" کا ہے وہی اوستا میں "منتھر" کا ہے۔ اوستا میں جس چیز کو "ہوما" کہا گیا ہے اسی کو ویدَ میں "سوما" کہا گیا ہے۔ ایران کی ژند اوستا میں جس فرشتے کو "اریمن" کہا گیا ہے اُسے رگ وید منڈل ۱ سوکت ۱۳۶ میں "اریمن دیوتا" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ژند اوستا میں "سورج" کو پُر عظمت ظاہر کیا گیا ہے، رگ وید میں "سورج" کو دیوتا قرار دیا گیا ہے۔ ایک دیوتا "دایو" ہیں جن کا ذکر ژند اوستا اور رگ وید دونوں میں ہے۔ ژند اوستا میں "متھری تاسب" کو حکیم بیان

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کیا گیا ہے، رگ وید اور اتھر وید دونوں میں " تر تیا " کو بیماریوں سے شفا دینے والا دیوتا بتایا گیا ہے۔ قربانی پڑھانے والوں کو ژند اوستا میں " اتھروا " اور ویدوں میں " اتھروَن " کہا گیا ہے۔ پارسی آگ میں ڈالنے والی چیز کو " ہوم " کہتے ہیں، ہندوؤں کے یہاں اسی کو " ہون " کہا جاتا ہے۔ زرتشتی صبح شام کو گائے جانے والے منتروں کو " گاتھا " کہتے ہیں، ہندو اس کو " گائتری " کہتے ہیں۔ آتش پرست جس کو " زنار " کہتے ہیں، اسی کو ہندو " جنیؤ " کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جس طرح پارسی " چراغاں " کا تیوہار مناتے ہیں، اسی طرح ہندو " دیوالی " مناتے ہیں۔ جس طرح ہندوؤں کے یہاں " ہولی " ہے اسی طرح کا پارسیوں کا ایک تیوہار ہے جس کو وہ " کوسہ برنشین " کہتے ہیں۔ زرتشتیوں کے یہاں علماء اور مشائخ کو " برمان " کہا جاتا ہے، ہندو انہیں " برہمن " کہتے ہیں۔ غرض زرتشتی مذہب اور ہندو مذہب کی غیر معمولی یگانگت و مماثلت نیز اور بھی دوسری شہادتوں کی بنا پر محققین نے کہا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی قوم کے دو ٹکڑے اور ایک ہی مذہب کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ " سیامک " ایرانیوں کے یہاں پیغمبر مانے جاتے ہیں جن کا دوسرا نام " پارسا " تھا۔ ان ہی کے نام پر موجودہ " ایران " کا نام " پارس " پڑا۔ سیامک کے بعد ہوشنگ پیغمبر ہوئے جن کا دوسرا نام " ایران شاہ " تھا لہٰذا قدیم " پارس " کا نام اب " ایران " رکھا گیا اور اس ملک کے رہنے والے " ایرین " یا " ایرانی " یا " اریا " کے نام سے موسوم ہوئے۔ چنانچہ ایران میں قدیم عہد کے بعض ایسے کتبے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں ایرانی بادشاہوں کے ساتھ " آریا " کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ جیسے شاہ گشتاسپ کے نام کے ساتھ قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس (HERODOTUS) نے ایران کے اور بھی کئی بادشاہوں کے نام کے ساتھ " آریا " کا لفظ لکھا ہے۔ ہندوستان کے باہر سے آنے والے ہندو بھی اپنے کو " آریا " ہی کہتے ہیں اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ فی الحقیقت ایرانی اور ہندوستانی دونوں اصلاً ایک ہی قوم ہیں۔

اِن محققین کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس گاؤں میں رہتے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تھے تورۃ میں اُس کا نام "اُر" آیا ہے۔ اُن کے خاندان میں جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے وزیراعظم بنے تو انھوں نے بنی اسرائیل کو فلسطین کے علاقہ سے لاکر مصر میں آباد کر دیا۔ ان کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں قبطیوں نے بنی اسرائیل کا مصر میں رہنا مشکل کر دیا تو وہ اُنہیں وادیٔ سینا میں لے گئے۔ جب طالوت نے فلسطین پر قبضہ کیا تو اُس وقت وادیٔ سینا کی آباد قوم بنی اسرائیل کے صرف دو قبیلوں نے اُن کا ساتھ دیا۔ باقی دس قبیلے وادیٔ سینا ہی میں رہے۔ اس کے بعد تاریخ میں وادیٔ سینا میں رہ جانے والے اِن دسوں قبیلوں کا پتہ نہیں ملتا کہ وہ کیا ہوئے؟ قرینہ غالب یہ ہے کہ یہی دسوں قبیلے مشرق کی جانب بڑھے اور کچھ قبیلے سرزمین ایران میں آباد ہو گئے جو "ایرانی" کہلاتے ہیں اور بعض قبیلے کوہ ہندوکش کو پار کر کے ہندوستان میں داخل ہوئے جو اپنے کو "آریا" کہتے ہیں۔ انھوں نے قدیم ہند کے ڈریوڈ باشندوں کو مفتوح و مغلوب کر کے جنوبی ہند کی طرف دھکیل دیا اور خود گنگا و جمنا کی وادیوں میں آباد اور سکونت پذیر ہو گئے۔ یوں "ایرانی اور آرین" دونوں قوم بنی اسرائیل کے ہم جد قبائل ہیں۔

ان قبائل میں ابتدا سے اچھے تعلقات قائم رہے۔ چنانچہ جب ایران میں زرتشت کا ظہور ہوا تو وہاں کی قدیم آبادی کے آبائی مذہب میں بھی تبدیلی ہوئی۔ اور جب ہندوستان کے آریوں نے اس تبدیلی کو بدعت قرار دیا تو ایران کے شاہ گشتاسپ نے ہندوستان کے سب سے بڑے عالم سنگراچہ کو لکھا کہ تم خود آکر زرتشت سے ملو۔ سنگراچہ ایران گئے۔ زرتشت سے ملے اور ژند اوستا کا ایک نسخہ بھی اپنے ساتھ یہاں لائے اور اُس کی بعض تعلیمات بتدریج یہاں کے رسوم و عقائد میں بجنسہٖ یا بادنیٰ تغیر داخل ہوئیں۔

بہرکیف! مجھے اس بیان سے کہنا یہ مقصود ہے کہ اگرچہ ایرانی شاعر فردوسی کے شاہنامہ کے مواد کو مسٹر لیگی (LEAGY) اور مسٹر میکنزی (MACKENZIE) نے "چینی شاہنامہ" سے ماخوذ و مستفاد ظاہر کیا ہے،

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مگر میرا خیال ہے کہ جب ایرانی اور ہندوستانی ایک ہی قوم تھے اور اُن کے باہم ہر طرح کے تعلقات ہمیشہ قائم رہے تو یہ نہ کیوں سمجھا جائے کہ فردوسی نے ایرانی شاہنامہ کا مواد ہندوستانی شاہنامہ مہابھارت سے لیا؟ اب یہ دوسری بات ہے کہ مواد میں چین اور دوسرے ملک کی ادبیات سے بھی فردوسی نے استفادہ کیا ہو۔ مگر شاہنامہ دراصل مہابھارت کے جواب میں لکھا گیا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مہابھارت

کتاب "مہابھارت" کو میں "اردو کا شاہنامہ" تصوّر کرتا ہوں سار دو زبان میں حفیظ جالندھری نے ایک "شاہنامہ" تصنیف کیا ہے مگر بقول اُن کے وہ "شاہنامۂ اسلام" ہے۔ اور "شاہنامۂ اسلام" لکھنے کا شوق کرنا ایک ایسا بھولا پن ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ "شاہنامہ" ایک ایسی کتاب کا نام ہے جس میں "مبالغہ" کا پچھتر فیصدی حصہ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے کوئی بھی "شاہنامہ" کوئی زمزمہ و طنطنہ رکھ ہی نہیں سکتا۔ اس میں کوئی لطف و مزہ پیدا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسلام کا شاہنامہ حقائق سے ذرا بھی تجاوز کرے تو وہ گستاخی و بے ادبی پر محمول کیا جائے گا۔ اُس میں تجاوز کی رتی برابر بھی گنجائش نہیں۔ چنانچہ "شاہنامۂ اسلام" کا حال یہ ہے کہ وہ ایک عمدہ نظم تو ہے، حفیظ کی قدرتِ شاعری کا نمونہ تو ہے، اسلام کے بانی اور اوّلین اہل کاروں کی منظوم سوانح عمری تو ہے مگر "شاہنامہ" نہیں ہے۔

اردو زبان کا شاہنامہ "مہابھارت" ہے۔ یہ رزمیہ شاعری اور کلاسکی ادب کے لحاظ سے یورپ اور ایشیا ہر جگہ متعارف و مقبول ہے۔ تقریباً ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ خود ہندوستان میں نیفی (۱۵۴۷ء - ۱۵۹۵ء / ۹۵۵ھ - ۱۰۰۴ھ) نے اس کا ترجمہ فارسی نثر میں کیا تھا۔ بنگالی زبان میں کیشورام متا نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اڑیسہ کی اوڈیا زبان میں سرنو داس نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اردو نظم میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا تھا مگر جب ہوا تو خوب ہی ہوا۔ منظوم کتاب کا ترجمہ منظوم کتاب کی شکل میں ہوا۔ مثنوی کا ترجمہ مثنوی کی صورت میں ہوا۔ سنسکرت زبان میں اگر یہ کتاب "A CAPITAL PERFORMANCE" یعنی "انتہائی شاہکار

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کام"، ہے تو اردو زبان میں بھی یہ کتاب "MASTERPIECE" یعنی "شاہکار" ہے ۔ اور اس یا ایسے ترجمہ کا فخر منشی طوطا رام شایاں لکھنوی کو حاصل ہے۔

شایاں کی مثنوی "مہابھارت"، یا "شاہنامۂ اردو" ادبی حیثیت سے اردو زبان کا ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔ اس میں شاعرانہ جوش و خروش اور ناظمانہ طنطنہ و زمزمہ، اپنے پورے جاہ و جمال کے ساتھ کارفرما ہے۔ اس میں اُبلتی ہوئی جوانی، رسمساتی ہوئی شوخی اور گنگناتی ہوئی رنگینی اپنی دلپذیر اداؤں کے ساتھ جلوہ فرما ہے:۔

زبانِ قلم گُل فشانی پہ ہے ؞ بہارِ مضامیں جوانی پہ ہے
دکھائے ورقِ تختۂ گُل کا رنگ ؞ صریرِ قلم، بانگِ بلبل کا رنگ
مہک اٹھے نافہ کی صورت دوات ؞ نہ ہو جس سے سرسبز غنچہ کی بات

حقیقت یہ ہے کہ پوری مثنوی گُل و گلزار ہے۔ اور اگر شایاں اسے مہابھارت کا ترجمہ نہ کہتے تو یہ طبع زاد (ORIGINAL) چیز تھی یا ہوتی کیونکہ:۔

فنِ شاعری میں سرافراز ہوں ؞ تخلص سے شایاں کے ممتاز ہوں
خدا نے کیا علم سے بہرہ ور ؞ بنا فیض سے اس کے، صاحب ہنر
پسندِ زباندراں ہے، اپنی زباں ؞ سند جانتے ہیں، اُسے نکتہ داں
نجوم اور علموں سے ہوں باخبر ؞ نہ کیوں نظم پر ہوں تصدّق گُہر
کیے ہیں نئے، طبع موزوں نے، کام ؞ کہ دلچسپ و شیریں ہے اپنا کلام

شایاں نے سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں کے باکمالوں پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے:۔

کیا ترجمہ خوب فیضی نے صاف ؞ کوئی حال لکھا نہیں برخلاف
جو پوتھی میں تھا، ہے رقم حرف حرف ؞ یہاں مختصر ہے وہ حالِ شگرف
وہ پُشتارہ، دفتر ہے، انبار ہے ؞ مہینوں ہیں سیر اس کی، دشوار ہے
ہزاروں میں ہوگا کوئی نیک نام ؞ پڑھا ہوگا جس نے وہ قصہ تمام
فقط جانتے دل میں ہیں وہ غریب ؞ "مہابھارت" اک ہے کتابِ عجیب

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اِس میں کیا شک ہے کہ ہزار میں بھی شاید ایک شخص نکلے جس نے سنسکرت یا فارسی میں "مہابھارت" کو کاملاً پڑھا ہوگا، حالانکہ ہر شخص کو اس کتاب کی عظمت و اہمیت کا اقبال و اعتراف ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کتاب کو بہت پہلے اردو کا جامۂ زرنگار پہنایا جاتا، تاکہ عوام اس سے فیضیاب ہو سکتے، مگر بقول شایاں:۔

ہزاروں ہوئے ناظمِ باہنر ∴ رہا یوں ہی ناسُفتہ، پر، یہ گہر

لہٰذا:۔

مرے قُلزمِ دل میں اُٹھی ترنگ ∴ کہ ہو اب صف آرائی نظمِ جنگ
یہ قصّہ جو ہے نثر، منظوم ہو ∴ کہ زورِ طبیعت بھی معلوم ہو
قلم بھی دکھلائے، نئے تاب و پیچ ∴ کہ نظروں میں ہو زال و سہراب ہیچ
کرے کام نیزے کا نوکِ قلم ∴ دمِ تیغ و خنجر بھرے دمبدم
فضائے قلم رشکِ میدانِ جنگ ∴ وہ وسعت، تصوّر کا عرصہ ہو تنگ
صف آرائی لفظ ہو آشکار ∴ ہر اک شعر ہو تیغ ساں آبدار
دکھائے وہ شفّاف جوہر، زباں ∴ چمک برقِ شمشیر کی ہو عیاں
ہُمائے سخن کے کُھلیں بال و پر ∴ لکھوں وصف فرماندۂ بحر و بر

کیسا زور، کیسی برجستگی، کتنی روانی اور کس قدر ترنّم کارفرما ہے؟ اب "فرماندۂ بحر و بر" کی حمد کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے:۔

نگارندۂ نقشِ لوح و قلم ∴ خداوندِ ملکِ حدوث و قدم
علیم و خبیر و سمیع و بصیر ∴ کریم و رحیم و غفور و قدیر
وہ رتبہ دیا قطرۂ آب کو ∴ خجالت سے ہے داغ مہتاب کو
دکھائی خدا نے وہ قدرت کی شاں ∴ کہ مٹی کے پُتلے کو بخشی ہے جاں

ایک بے پناہ سیلِ رواں ہے جو بہا چلا جاتا ہے، تا آنکہ شایاں اُس پر یوں بند باندھتے ہیں:۔

بیاں سے ہے عاجز، زبانِ قلم ∴ بس اب ہو چکا امتحانِ قلم

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انصاف یہ ہے کہ شانتایاں کی یہ مثنوی زبان و بیان، جوش و خروش اور شوکت و شکوہ کے اعتبار سے، ایک عجیب و دلپذیر اور جاں نواز و بے نظیر فن پارہ ہے۔ بھیم ماں کے حکم سے ایک دیو سے لڑنے جاتے ہیں : ؎

رہا منتظر، جب گئی نصف شب ⁂ تو وہ دیو آیا بہ شکلِ غضب
ہوا خشمگیں دیکھ تازہ یہ حال ⁂ رخِ زرد، آتش کے مانند لال
بدن بھی ہوا جل کے خاکِ سیاہ ⁂ بھری غصہ و قہر سے تھی نگاہ
جو کھینچا وہیں نعرۂ ہولناک ⁂ زمیں کا ہوا سینہ دہشت سے چاک
جو بیٹھا تھا وہ بھیم زیرِ شجر ⁂ ہوا وہ لعیں مُشت زن پُشت پر
نہ اس سے ہوا بھیم، اصلا خبر ⁂ بنی تھی مگر دیو کی جان پر
کہا دل میں، کیسا یہ انسان ہے ⁂ بڑی سخت اس شخص کی جان ہے
یہ کوہِ گراں کو بھی قدرت نہ تھی ⁂ جو آتی اسے تاب اس ضرب کی
مگر سر میں تھا زور کا جو غرور ⁂ بلا کی طرح آیا اس کے حضور
بہم پھر وہ دست و گریباں ہوئے ⁂ لڑے اس قدر، دل پریشاں ہوئے

یہاں تک کہ : ؎

اُڑا دیو کے جسم سے مرغِ جاں ⁂ بدن رہ گیا کیسۂ استخواں
درِ شہر پہ لا کے پھینکی وہ لاش ⁂ ہر اک عضو زخموں سے تھا پاش پاش

دروپدی کے سویمبر کے موقع پر جب محفل جم جاتی ہے - امیدواروں اور تماشائیوں کا ہجوم ہوتا ہے - مہاراج اور راجکماری کے آنے پر اعلان ہوتا ہے: ؎

کہ جو شخص ان میں سے ہو نامدار ⁂ اُٹھائے خدنگ و کماں ایک بار
طرف دیگ پر جوش کے دیکھ کر ⁂ اڑا دے نشانے سے مچھلی کا سر
کسی سے نہ ہر گز ہلی وہ کماں ⁂ ہنر سب طرح کے ہوئے رائیگاں
کہ ناگاہ گوشے سے مانندِ تیر ⁂ نمایاں ہوئے ارجنِ بے نظیر
ہنسے دیکھ کر دل میں پیر و جواں ⁂ کہ لڑکا اٹھائے گا تیر و کماں ؟

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پر ارجن کا چمکا ہوا تھا نصیب ۞ گیا مثلِ ناوک، کماں کے قریب
زباں سے لیا پہلے نامِ خدا ۞ تصوّر کیا دل میں استاد کا
اٹھا کر کماں کو کیا اس نے زہ ۞ ہوا ایک بیک شورِ تحسین و بِہہ

شایاںؔ کے اس مصرع کو پڑھ کر فردوسی کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے: ع

فلک گفت احسن، مَلَک گفت بِہہ

آگے ارجن کے بارے میں ہے:ـ

وہ تیرِ انگنی میں جو تھا بے نظیر ۞ روانہ کیے پے بہ پے پانچ تیر
قضارا جو مچھلی نشانہ ہوئی ۞ تو بحرِ فنا کو روانہ ہوئی
ہَوا ہو گئے ہوش ہر جنگ جو ۞ ملی خاک میں بزم کی آبرو
جو پہنا دیا اُس گل نے ارجن کو ہار ۞ چبھا دل میں ہر سروِ قامت کے خار

سمجھ میں نہیں آتا کہ ارجن کے زورِ بازو کی داد دی جائے یا شایاںؔ کے زورِ انگشت کی ۔ یہ بھی غور فرمایئے کہ شایاںؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ ارجن کی کامیابی کو محض اُس کے زورِ بازو کا نتیجہ اور کمالِ فن کا حاصل نہیں قرار دیتے ۔ بلکہ اس سے پہلے، قدرت کی امداد اور خدا کی عنایت کا بھی ذکر، کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اُس کا نصیب چمکا ہوا تھا اس لئے جب اُس نے خدا کا نام لے کر اُس گرانبار کمان کو ہاتھ لگایا تو اُسے اٹھا لیا پھر اس نازک حالت میں مچھلی کے نشانہ بن جانے کو بھی صرف ارجن کی اپنی مہارتِ ہدف اور اعلیٰ درجہ کی نشانہ بازی پر محمول نہیں کرتے بلکہ "قضارا" کہہ کے اُسے اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد اور استاد کی تعلیم کا حاصل قرار دیتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے نازک مواقع پر انسان کی کامیابی، بغیر فضلِ خداوندی اور مشیّتِ رَبّانی کے ممکن ہی نہیں ۔ سعدی نے صحیح کہا ہے کہ:ـ

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

"مہابھارت"، شروع ہونے والی ہے ۔ ارجن بھی لیس ہو رہے ہیں:ـ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جو ارجن ہوا مستعد جنگ پر :: لیے خنجر و تیغ و تیر و تبر
سپر، خود، ترکش، کمان، گرز و تیر :: کمند اور جوشن، ہر اک بے نظیر
چھری برق دم، دشنۂ آبدار :: وہ برچھا کہ تیر فلک شرمسار
زرہ بکتر و خود، چار آئینہ :: جو پہنا، فلک بن گیا آئینہ
سراپا تھا دریائے آہن میں غرق :: ہلالی چمکتی تھی مانند برق

شاداں نے ہر ہر اسلحہ کی الگ الگ تعریف و تفصیل بھی پیش کی ہے اور وہی انداز اختیار کیا ہے جو میر انیس کا ہے:

زبانِ قلم پر ہے تیروں کا حال :: دمِ رزم سنیے یہ اُن کا کمال
کماں پر کوئی تیر رکھا اگر :: جو کھینچا تو سب کو دکھلائی آئے نظر
ہوا جس گھڑی وہ کماں سے جدا :: نظر آئے نو تیر بس برملا
گیا فوجِ دشمن پہ جب برق وار :: جراحت رسیدہ ہوئے اک ہزار

بھیم، پانڈوں کا پہلوان، ہندوستان کا رستمِ دوراں ہے۔ اس کی معرکہ آرائی کا ایک سین (SCENE) دیکھیے:

شجاعت کی دریائے دل میں ترنگ :: بلا تشنہ خونخوار تھا وہ نہنگ
ہوئے قلزمِ فوج میں غوطہ زن :: گرائے زمیں پر بہت سے پلٹن
جو اٹھا، زمیں پر بٹھایا اُسے :: بڑھے آگے، پیچھے ہٹایا اُسے
گری برق ساں جس پہ شمشیر تیز :: گئی اُس کے سر پر گزرِ رستخیز
اجل کی طرح جس پہ نیزا گرا :: یہ جانو کہ دنیا میں پیدا نہ تھا
ملے خاک میں نوجواں صد ہزار :: دھواں ہو گیا چہرۂ کارزار

تھا آنکھ چوتھی صبح نمودار ہوئی:

اٹھایا جو خورشید نے اپنا سر :: ہوا چرخِ چارم پہ وہ جلوہ گر
سیاہی شبِ تار کی ہٹ گئی :: ستاروں کی وہ فوج سب کٹ گئی

میں اس زر نگار ہار کو توڑ توڑ کر کتنے موتی بکھیرتا رہوں گا؟ اور آپ کہاں تک

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پھنستے رہیں گے ؟ ایسا کیوں نہ کیجئے کہ مسلّم ہار ہی کو اپنے گلے کی زینت بنائیے
خود اِس "شاہنامہ" کو پڑھ لیجئے ؟ مگر یہ کبھی بات ہے کہ آپ اسے پائیں گے
کہاں ؟ ایسی شاندار کتاب مگر اس کو دوبارہ چھپنا نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ وہ اردو
میں ہے اور اردو وہ زبان ہے جو مقہور و مغضوب ہے۔ کاش ہماری حکومت ہی
ان کتابوں کی اشاعت کو ضروری خیال کرتی ۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھاگوت گیتا

" بھاگوت گیتا" بذاتہ کوئی خاص، علیحدہ لکھی ہوئی کتاب نہیں بلکہ دراصل مشہور رزمیہ مثنوی " مہابھارت" کے چھٹے باب کا ایک اضافی جزو ہے۔ یہ چیز " مہابھارت" میں کب داخل ہوئی؟ اور اسے کس نے داخل کیا؟ یہ اب تک تحقیق نہ ہو سکا ہے۔ البتہ اس حصہ کی افادیت کے پیشِ نظر لوگوں نے اس حصہ کو " مہابھارت" سے جدا کر کے ایک مستقل کتاب کی حیثیت دے دی ہے اور اس کا نام " بھاگوت گیتا" رکھ دیا ہے۔ یہ اُسی طرح ہوا ہے جس طرح " ابنِ خلدون" کی تاریخ سے اُس کے " مقدمہ" کو اور " مسدّس حالی" سے اُس کے " مقدمہ" کو الگ کر کے لوگوں نے ایک مستقل کتاب کا درجہ دے دیا ہے۔

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ " بھاگوت" کا لفظ " بھاگوان" کی دوسری شکل ہے جو " بھاگیہ" سے بنا ہے، جس کے معنی " قسمت" کے ہیں۔ لہذا " بھاگوان" جو کثرتِ استعمال سے " بھگوان" ہو گیا ہے، کے معنی ہیں، وہ جس کے ہاتھ میں قسمت بدلنا ہو۔ یعنی خدا۔ مگر یہ مفہوم صحیح نہیں ہے۔ " بھگوان" کا مادّہ ہے " بھج[1]" جس کے معنی " شوکت و اقبال" کے ہیں۔ یہ صفت کمال کی صورت میں تو خدا کی ذات میں ہے، مگر جن بندوں میں غیر معمولی طور سے یہ صفت زیادہ نمایاں ہوتی ہے، ہندوستان میں اُن کو " بھگوان" کہا جاتا ہے۔

" گیتا" کا مطلب ہے " گیت" اور ہندو، شری کرشن جی کو " خدا کا اوتار" تصور

---

[1] " بھج" اور " بھگ" دونوں ایک ہی ہے اور " گ" کو " ج" یا " ج" کو " گ" بولنا اور لکھنا عام ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کرتے ہیں۔ اور اس کا مفہوم یہ متعین کیا جاتا ہے کہ خدا نے انسانی پیکر اختیار کیا تھا اور کرشن جی کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ اس لئے "بھاگوت گیتا" کے معنی قرار پاتے ہیں "وہ گیت جو خدا کی زبان سے ادا ہوا"۔ مگر یہ مفہوم یوں غلط ہو جاتا ہے کہ گیتا کی ساری تعلیمات خود کرشن جی کی زبان سے ادا نہیں ہوئی ہیں، بلکہ دوسرا شخص یعنی سنجے کہتا ہے کہ کرشن جی نے یوں فرمایا۔ برخلاف اس کے اگر "اوتار" کے معنی "اُتارا ہوا" لیا جائے تو اس کا عربی ترجمہ "مرسل" ہو جائے گا، یعنی "خدا کا بھیجا ہوا"۔ چنانچہ مسلمان، شری کرشن جی کو عظیم ہندوستان کا برگزیدہ "پیغمبر" ہی تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی منتخب کیا ہوا اور سب میں سے چنا ہوا، وہ برگزیدہ انسان، جو اللہ تعالےٰ کے پیغامات کو بذریعہ وحی حاصل کر کے اللہ کے بندوں تک پہنچانے کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے مبعوث اور منتخب کیا گیا ہو۔ اس طور پر "بھاگوت گیتا" کے معنی ہوں گے "نغمہ خداوندی"۔ چنانچہ اجمل خاں نے "بھاگوت گیتا" کا جو اردو میں ترجمہ کیا ہے، اس کا نام "نغمہ خداوندی" ہی رکھا ہے۔ پیغمبروں میں ایسے پیغمبر اور بھی ہوئے ہیں، جو اللہ تعالےٰ کی عبادت نغمہ و سرود کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں بھی قرآن حکیم میں آیا ہے کہ وہ جس وقت کلام الٰہی کی تلاوت فرمانے لگتے تھے، تو انسان کیا، پہاڑ و پرند بھی اُن کے نغمہ و لے کی ساحرانہ آواز پر اُن کے گرد اکٹھا ہو جاتے تھے (۳۸-۱۷) اور "توریٰہ" میں حضرت داؤد کی جو کتاب "زبور" کے نام سے موجود ہے وہ سراسر منظوم ہے جسے لوگ "داؤد کے گیت" کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مہابھارت کی جنگ میں آریہ ورت کے تمام راجے شریک ہوئے تھے، جن میں متھرا کے راجہ شری کرشن جی بھی تھے، وہ پانڈوں کے ساتھ تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میدانِ جنگ میں پہنچنے کے بعد ارجن نے میدانِ جنگ پر نظر ڈالی اور فریق مخالف سے نظریں چار ہوئیں تو انہیں بڑا دھکا لگا اور سوچنے لگے کہ چند روزہ زندگی اور دنیاوی حکومت کے لئے، اپنے عزیزوں اور رشتہ مندوں کے خون سے ہاتھ رنگنا سوائے حماقت کے اور کیا ہے؟ بقول اجمل خاں:۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

" ارجن پر وہی تذبذب دارتعاش طاری ہو گیا جو اکثر متلاطم جذبات اور متضاد فرائض کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے کہ عملی زندگی میں قدم رکھا جائے اور اپنے عزائم و ارادوں پر استقلال سے قائم رہ کر، جادۂ مستقیم سے قدم نہ ڈگے۔ کمزوروں کا ذکر نہیں، مضبوط تلب اور استوار ارادہ رکھنے والے کتنے انسان ہیں جو فرض کا صحیح احساس کر کے راہِ راست پر چل سکیں اور انہیں لغزش نہ ہو؟
جب دو نصب العین، دو مطمحِ نظر اور دو راستے سامنے ہوں اور بظاہر دونوں منزلِ مقصود تک لے جانے والے ہوں، تو یقیناً ایک عالمِ اضطراب طاری ہو جاتا ہے اور بسا اوقات، نیک نیتی ہی سے سہی، مگر وہ رستہ اختیار کر لیا جاتا ہے، جو غلط بھی ہوتا ہے اور پُر خطر بھی۔ یہ عقل و جذبات کا تصادم، یہ ارادے اور احساس کی آویزش، کبھی کبھی غلط راستے پر بھی ڈال دیتی ہے اور ایسی ہی غلطی کو اجتہادی غلطی کہتے ہیں جو اکثروں سے ظہور میں آتی ہے۔"

چنانچہ یہی غلطی ارجن سے بھی ہوئی۔ انھوں نے حق اور فرض کو نظر انداز کر کے، محض رشتہ مندوں پر ترس کھا کے جنگ کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ میں حصولِ سلطنت کے لئے، صرف دنیاوی جاہ و منصب کے لئے اور چند روزہ عیش و عشرت کے لئے، اپنے اتنے آدمیوں کا خون بہانا انسانیت کے خلاف اور گناہ سمجھتا ہوں۔ وہ اس حد تک آمادہ ہو گئے کہ:۔

" دھرت راشٹر کے بیٹے اگر مسلح ہو کر مجھے اس طرح قتل کر دیں کہ میں نہتا اور غیر متشدد ہوں، تو میرے لئے یہ زیادہ اچھا ہو۔"

ارجن ہی کی رتھ پر شری کرشن جی بھی سوار تھے۔ انھوں نے ارجن کا یہ رنگ دیکھا تو سمجھ گئے کہ عزتِ نفس کے فرض پر، جذبۂ محبت غالب آرہا ہے، صداقت پر کذب کی فتح ہونے والی ہے اور فرمانِ الٰہی پر شیطانی وسوسہ حاوی ہو جانے والا ہے، تو انھوں نے ارجن کو اپنی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

طرف مخاطب کیا اور عاقلانہ مشوروں کے ساتھ ساتھ عالمانہ پیغامات دیئے اور اس سلسلہ میں ارجن نے جن جن مسئلوں کی وضاحت چاہی، وہ بھی صاف کر کے بتلائے۔

کہا جاتا ہے کہ جس وقت کوروں اور پانڈوں، میدان جنگ میں صف آرا ہو گئے تو راجہ دھرت راشٹر نے خود بھی میدانِ وغا میں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ نابینا تھے اس لئے اُن کو روکا گیا کہ آپ وہاں جا کر کیا کریں گے؟ انھوں نے کہا کہ اگر میں آنکھ سے حالات کو دیکھ نہیں سکتا تو کان سے سُن تو سکتا ہوں۔ بیاس جی نے کہا کہ اگر وہاں جا کر صرف حالات سُننے ہیں تو میں سنجے کے سامنے سے حجابات اٹھا دیتا ہوں، اُن کو میدانِ جنگ کی ساری تفصیلات یہیں سے نظر آئیں گی اور وہ آپ کو میدانِ جنگ کے افعال واقوال کی ساری تفصیلات سنائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سنجے ہر اک شخص کی بات اور ہر فرد کا، کارنامہ بہ تفصیل اُن کو سناتے اور بتلاتے رہے۔ منجملہ اُن کے شری کرشن جی کے سارے پیغامات، ارجن کے سوالات اور پھر شری کرشن جی کے جوابات کو بھی بہ وضاحت سناتے اور سمجھاتے رہے۔ تا آنکہ جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

"گیتا" میں شری کرشن جی کی ان ہی فلسفیانہ گفتگو اور ملہمانہ تعلیمات کو، جو اِس موقع پر انھوں نے ارجن کو دی تھیں، اور جنہیں سنجے نے سُن سُن کر راجہ دھرت راشٹر کو بتایا تھا اور جو مکالمہ کی صورت میں ہے، بیاس جی نے منظوم کر دیا ہے۔

"گیتا" میں ایک نہیں، لاتعداد موقعوں اور مقامات پر شری کرشن جی نے اِس طرح باتیں کی ہیں اور اُن کی تعلیمات اس طرح ادا ہوئی ہیں گویا خود خدا بول رہا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے "پیغمبر" آدمی ہوتا ہے، صرف برگزیدگی کی بنا پر اُس پر وحی آتی ہے۔ لیکن ہندو عقیدہ میں خود بھگوان، انسانی پیکر کا روپ دھار لیتا ہے، اس لئے لامحالہ الہامی تعلیمات کو اس طرح اُن کی زبان سے ادا کرایا گیا ہے گویا وہ خود خدا ہیں۔

"مذہب" کی بنیاد خدا کے صحیح تصور اور اُس کی توحید پر ہے۔ لیکن جو "مذہب" زمانہ یا انسان کے دست بُرد سے محفوظ نہ رہا ہو، اُس میں خدا کا تصوّر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے اور چونکہ ذہن انسانی محسوسات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا اس لئے اُس کا تخلیق کردہ خدا بھی اُسی قالب میں ڈھلا ہوتا ہے۔ یہی حال یہاں ہے۔ خدا جب کوئی پیکر اور وہ بھی فانی انسان کا اختیار کرے تو وہ خدا رہا ہی کہاں ؟

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

شری کرشن جی

کہا جاتا ہے کہ کوشل کے راجہ بسودیو جی کی شادی، برج کے راجہ اگرسین کی لڑکی دیوکی جی سے ہوئی تھی - برج راج کا دارالسلطنت متھرا تھا - راجہ اگرسین کا لڑکا راجہ کنس ایک نہایت جابر و ظالم اور خونخوار و سفاک فرمانروا ہوا، جس نے اپنے باپ راجہ اگرسین کو قید کر کے گدی پر قبضہ کیا تھا - اس کے بعد اس نے قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے کمزور راجاؤں کو زیر کر کے انہیں اپنا غلام بنا لیا تھا -

راجہ کنس سے نجومیوں نے کہہ دیا تھا کہ اُن کی حکومت کا زوال، خود اُن کے بھانجے کے ہاتھوں ہوگا - اُن کی بہن دیوکی کا آٹھواں بچہ راجہ کا قاتل ہوگا - لہٰذا اُس نے کوشل راج پر بھی بزور قبضہ کر لیا - اور اپنی بہن دیوکی جی اور بہنوئی بسودیو جی کو متھرا لے آیا اور یہ انتظام کر دیا کہ اگر دیوکی جی کو کوئی لڑکا پیدا ہو تو اُس کو فوراً خبر دی جائے - اتفاق کی بات ہے کہ متھرا آنے کے بعد دیوکی جی کو، مسلسل سات بیٹے پیدا ہوئے اور وہ سب کے سب راجہ کنس کے حکم سے قتل کر دیئے گئے - دنیاوی حکومت اور چند روزہ حاکمانہ اقتدار کے لالچ میں کتنے بدبختوں نے اپنے باپوں، بھائیوں اور بیٹیوں تک کو قتل کرا دیا ہے، یہ تو خیر بھانجوں کا قتل تھا - اور وہ بھی مجبور بہن اور محبوس بہنوئی کے بچّے تھے -

قہرمانی دربار کے وزرا، علماء اور نجومی بھی بڑے ہی جابر و سنگدل بن جاتے ہیں - ایک دن نجومیوں نے راجہ کنس کو خبر دی کہ اِن دنوں دیوکی جی حاملہ ہیں اور اُن کے حمل میں جو بچّہ ہے، وہی آپ کا قاتل ہوگا - راجہ کنس نے یہ وحشت ناک اطلاع پاکر دیوکی جی کو جیل میں مقیّد کر دیا تاکہ ولادت کے بعد وہ بچّہ بہ آسانی قتل کر دیا جاسکے -

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

باہر سخت پہرہ لگا دیا گیا کہ کوئی شخص اندر نہ جا سکے۔ چونکہ اس پیشنگوئی کی خبر پوری مملکت میں پھیل گئی تھی اور رعایا راجہ کنس کے ظلموں سے تنگ آ چکی تھی، لہذا اس نامولود نجات دہندہ بچے کی پیدائش و سلامتی کے لئے ہر گھر میں خوفی اور دعا گوئی ہونے لگی۔

بسودیوجی کو بچے کی سخت فکر تھی۔ چونکہ اکثر اہل کارانِ سلطنت بھی اندر اندر راجہ کنس کے خیر خواہ نہ تھے اس لئے پہرہ داروں میں سے کچھ کو بسودیوجی نے ملا رکھا تھا۔ انھوں نے دیوکی جی کو اس پر راضی کر لینا چاہا کہ ولادت کے بعد اگر لڑکا پیدا ہو تو اس بچہ کو باہر لے جا کے کسی بچی سے بدل لیا جائے تاکہ دونوں بچے محفوظ ہو جائیں۔ حالات کی نزاکت کو دیکھ کر وہ رضامند ہو گئی تھیں۔

مشیتِ خداوندی جب کسی امر کو منظور کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ ویسے اسباب و حالات پیدا کر دیتا ہے کہ وہ کام ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ اسے اتفاق قرار دیتے ہیں۔ مگر وہ اتفاقات نہیں ہوتے بلکہ مشیتِ خداوندی ہوتی ہے۔

شری کرشن جی کی ولادت آٹھ بھادوں کی رات کو ہوئی۔ اس رات مشیتِ الٰہی سے، پہلا اتفاق یہ ہوا کہ سخت اندھیاری ہو گئی اور موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ نہایت سخت و تیز ہوا نے سارے لوگوں کو پریشان کر دیا۔ ابر و باد کی سختی کے سبب سے کچھ پہرہ دار تو غافل و بے پروا ہو گئے اور جو بچے وہ سازش میں شریک تھے۔ لہذا کرشن جی کے پیدا ہونے پر بسودیوجی بچہ کو ایک ڈلیا میں چھپا کے، جیل کی حدود سے باہر نکلے اور متھرا سے گوکل کی طرف چل پڑے۔ بارش و ہوا کی وجہ سے سارے لوگ گھروں کے اندر پوشیدہ اور پناہ گزیں تھے۔ اس لئے کوئی متنفس راستہ میں نہ ملا۔ دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ جمنا میں طغیانی آ گئی اور پانی بہت بڑھ گیا۔ اسی وجہ سے اگرچہ بسودیوجی دریا پار کرتے ہوئے، ڈوبنے سے بمشکل بچے، مگر اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سارے ملاح گوشہ نشین ہو چکے تھے، آبی کاروبار بند ہو چکا تھا اور دریا کے دونوں کناروں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی ملاح کو خبر نہ ہوئی۔ گوکل پہنچ کے بسودیوجی نے تلاش شروع کی کہ کوئی نوزائیدہ بچی کسی گھر میں ملے۔ چنانچہ اتفاق یہ ہوا کہ دریافت سے معلوم ہوا کہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ابھی چند گھنٹے ہوئے ہیں کہ نند جی نام کے ایک اہیر کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی ہے۔ بسو دیو جی، بچی کی ماں جسودا کے پاس پہنچے۔ اُس کو پوری صورت حال بتائی۔ اُس کی بچی کی سلامتی کا ذمّہ لیا۔ اور اطمینان دلایا کہ وہ لڑکی ہونے کے سبب سے، محفوظ رہے گی۔ اللہ کو یہی منظور تھا اس لئے جسودا راضی ہوگئی۔ اُس نے بسو دیو جی سے لڑکے کو لے کر اپنی لڑکی اُن کے حوالہ کر دی۔ انھوں نے اُسے لاکر دیوکی جی کی گود میں دے دیا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ ابر و باد ختم ہوگیا۔ اہلِ کارانِ جیل نے راجہ کنس کو ولادت کی خبر دی اور بتایا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ راجہ کو اطمینان نہ ہوا اور بہ نفسِ نفیس اُس نے جیل میں آکر نو مولود کو دیکھا، تو "بیٹی" پایا۔ چونکہ راجہ کے لئے دیوکی جی کے آٹھویں بچے کو مہلک بتایا گیا تھا، اس لئے راجہ کنس کو اُس بچی سے بھی خطرہ محسوس ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ کنس نے اُس بچی کو بھی اٹھا کے زمین پر پٹخ دیا مگر بچی زمین پر گرنے کی بجائے فضا میں غائب ہوگئی۔ اس طور سے دونوں بچے زندہ رہ گئے۔ ہر سال بھادوں ۸ تاریخ کو "جنم اسٹمی" کی تقریب اسی واقعہ کی یاد ہے۔ "جنم" کے معنی "پیدائش" کے اور "اسٹمی" کے معنی "آٹھویں تاریخ" کے ہیں۔

شری کرشن جی کی پیدائش کے حالات بہت کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات سے ملتے جلتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام علاقہ شام (SYRIA) کے ایک گاؤں "اُور" میں رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰق بھی وہیں رہے۔ اُن کے لڑکے حضرت یعقوب جن کا نام "اسرائیل" بھی تھا، وہیں رہے۔ مگر اُن کے لڑکے حضرت یوسف جب مصر میں وزیر اعظم ہوگئے تو انھوں نے اپنے باپ حضرت یعقوب اور تمام "آلِ یعقوب" یعنی "بنی اسرائیل" کو بلا کے مصر میں بسا دیا۔ یہ حضرت مسیح سے دو ہزار برس پہلے کی بات ہے۔ حضرت یوسف کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مصریوں نے بنی اسرائیل سے سیادت چھین لی اور اس قوم پر زوال آگیا۔ تا آنکہ چار سو برس گذرتے گذرتے، بنی اسرائیل کی پستی و پس ماندگی انتہا کو پہنچ گئی۔ اور بنی اسرائیل پر فراعینِ مصر کے ظلم و تشدد کی حد ہوگئی۔ ان ہی دنوں، اُس عہد کے فرعون مصر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ریمیسس دوم (RAMESES SECOND) کے درباری نجومیوں نے فرعون کو اطلاع دی کہ بنی اسرائیل میں ایک بچّہ پیدا ہوگا جو زوالِ فرعون کا باعث ہوگا۔ یہ سُن کر فرعون نے حکم دے دیا اور پہرہ بٹھا دیا کہ بنی اسرائیل کے جس گھر میں کوئی "لڑکا" پیدا ہو وہ فوراً قتل کر دیا جائے۔ اور ایسا ہی ہونے لگا جس وجہ سے بنی اسرائیل کی زندگی تلخ ہو کر رہ گئی۔ فرعون کے درباریوں میں صرف ایک ہی یہودی تھا جو اعلیٰ عہدہ دار تھا اور قلعہ کے اندر ہی رہتا تھا۔ اُس پر بھی پابندی عائد تھی کہ وہ قلعہ سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ جب اُس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا (جو موسیٰ کے نام سے مشہور ہوا) تو غریب باپ خوفزدہ ہوا کہ فرعون کو خبر ہو جائے گی تو وہ اسے بھی قتل کرا دے گا، اور ماں بھی مضطرب اور پریشان ہوئی۔ یہاں تک اللہ تعالےٰ نے بچّے کی ماں کو وحی کیا کہ بچّے کو دریا میں ڈال دو، وہ ڈوبے گا نہیں، سلامت رہے گا۔ چنانچہ اُس نے اس بچّے کو ایک ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دیا تاکہ مصر سے کہیں دُور بچّہ پلا جائے اور زندہ رہے۔ مشیّتِ خداوندی یا اتفاق سے ہوا نے اُس ٹوکری کو قلعہ کے اندر ہی اُس گھاٹ پر پہنچا دیا جہاں قلعہ کی ملکہ اور بیگمات غسل کیا کرتی تھیں۔ فرعون کی بیوی اُس وقت نہا رہی تھی اور وہ لاولد تھی اس لئے وہ اس بچّے کو پاکر بہت خوش ہوئی اور اُس نے اس بچّے کو اپنا بیٹا بنا لیا اور فرعون کو سمجھایا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ یہ بچّہ بنی اسرائیل میں کا ہو؟ کسی قبطی اور مصری عورت کا بھی ناجائز بچّہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے محض اندیشہ میں اس کو قتل نہ کیا جائے۔ چونکہ مشیّتِ الٰہی کارفرما تھی، لہٰذا فرعون نے بیوی کی بات مان لی۔ اور اس طرح فرعون کی گود میں حضرت موسیٰؑ نے پرورش پایا اور پھر اُن کے ہی ہاتھوں وہ تباہ و برباد ہوا۔

شری کرشن جی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی کی یکسانیت بھی محققین کی اِس رائے کو تقویت پہنچاتی ہے کہ اسرائیل کے وہ دسوں قبائل، جو وادیٔ سینا سے طالوت کے ساتھ فلسطین جاکر جالوت سے جنگ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تھے اور بدستور وادیٔ سینا میں رہ گئے تھے اور جن کو تاریخ "گمشدہ قبائل" قرار دیتی رہی ہے، وہی، اِدھر آئے اور کچھ ایران کی سرزمین پر آباد ہوئے جو "ایرانی" کہلاتے ہیں اور کچھ ہندوستان آئے جن کو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"آریا" کہا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ دراصل "اُدر" کے رہنے والے تھے۔ توریۃ کی "کتاب پیدائش"، کے باب ۱۱ آیت ۳۱ میں ہے کہ:۔

"اور تارح اپنے بیٹے ابرام کو اور اپنے پوتے لوط کو جو حاران کا بیٹا تھا
اور اپنی بہو ساری کو جو اس کے بیٹے ابرام کی بیوی تھی، ساتھ لیا اور
سب کسدیوں کے گاؤں "اُور" سے روانہ ہوئے"

یہی "ابرام" ہیں جن کو قرآن مجید میں "ابراہیم" کہا گیا ہے اور جو بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ بہرکیف! میرا موضوع یہاں کسی بھی قوم کی تاریخ و تحقیق نہیں، البتہ چونکہ شری کرشن جی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصوں میں بڑی زبردست یکسانیت پائی جاتی ہے، اس لئے یہاں اس نئی تحقیق کے رُخ یا مورخین کے رُجحان کا بھی ذکر، مناسب معلوم ہوا۔ ورنہ میرا موضوع تو یہاں شری کرشن جی کے حالاتِ زندگی بیان کرنا ہے۔

شری کرشن جی، نند جی کے گھر میں پرورش پاتے رہے، جب سیانے ہوئے تو نند جی کے لڑکے بلدیو جی کے ساتھ، جو اُن سے عمر میں بڑے تھے، نند جی کی گائیں لے کر "بندرابن" میں چرانے لگے، جہاں دوسرے چرواہے لڑکے اور لڑکیاں بھی موجود ہوتے تھے۔ منجملہ اُن کے ایک لڑکی "رادھا" (جس کو "رادھیکا" بھی کہا جاتا ہے) زیادہ مشہور ہے۔

شری کرشن جی کا گیارہ سال تک محبوب مشغلہ گائیں چرانا اور بانسری بجانا تھا۔ اللہ تعالےٰ کا یہ نظم رہا ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندے کو برگزیدگی عطا کرکے، اُس کے ہاتھ میں اپنے بندوں کی چوپانی و نگہبانی دینے کو ہوتا تھا تو اُسے بچپن میں جانوروں کی چوپانی و نگہبانی کا فرض سپرد کرتا تھا۔ تاکہ اِس طور پر گلہ بانی کی ٹریننگ اور تربیت ہو جائے۔ انسان بھی تو آخر "حیوان ناطق" ہے اس لئے پہلے "حیوان مطلق" کی شبانی اُس کو دی جاتی تھی۔ اُس کے بعد "حیوان ناطق" کی چوپانی۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت محمد علیہم السلام نے پہلے جانوروں کی ہی چرواہی کی تھی، اس کے بعد انسانوں کی چرواہی اُن کے سپرد ہوئی تھی۔

شری کرشن جی کی بانسری سے دلچسپی بھی اِس مشیّتِ الٰہی کے سبب سے تھی کہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اُن کی آواز اور اُن کے منہ سے نکلے ہوئے بول، لوگوں کو اپنی طرف متوجہ اور مائل کر سکیں اور وہ اپنی تعلیمات لوگوں کے کانوں تک بہ آسانی پہنچا سکیں۔ یہی معجزہ حضرت داؤد علیہ السلام کا بھی تھا کہ اُن کے نغمہ پر، انسان تو انسان، جبال وطیور بھی اُن کے ساتھ نغمہ خواں ہو جاتے تھے۔

شری کرشن جی کے بارے میں ایک روایت یہ زبان زد خاص و عام ہے کہ وہ کنواری اور شادی شدہ حسین و نوجوان عورتوں میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے اور اُن کے درمیان گھرے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایسا بھی انھوں نے کیا کہ جب گوپیاں، تنہائی سمجھ کے اپنے سارے کپڑے اُتار کے، پانی میں ننگے نہا رہی تھیں تو شری کرشن جی، چپکے سے وہاں پہنچ کر، اُن کے کپڑے اٹھا کے، کدم کے گاچھ پر چڑھ گئے تھے۔ اور جب تک گوپیوں نے مجبوراً پانی سے نکل نکل کے ننگے اُن کے سامنے آ آ کر، کپڑے دینے کی استدعا نہ کی تھی اور انھوں نے سب کو قدِ آدم عُریاں حالت میں دیکھ نہ لیا تھا، اُن کے کپڑے اُن کے حوالہ نہ کئے تھے۔ چنانچہ اس منظر (SCENE) کی رنگین تصاویر بھی عام طور سے چھپی ہوئی بازاروں میں بکتی اور خرید خرید کر گھروں کے اندر آویزاں کی جاتی ہیں۔

میں اِس روایت کے آخری حصہ کو سراسر غلط، بہتان اور بے بنیاد جھوٹ سمجھتا ہوں۔ شری کرشن جی، ہندوستان کے "پیغمبر" تھے۔ اور یہ اندازِ حیات پیغمبروں کا کبھی بھی نہ رہا تھا اور نہ کبھی ہو سکتا تھا۔ نیز میں اِس حصۂ روایت کو عقیدہ و عقل ہی کے خلاف نہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی سراسر لغو اور تمام تر باطل تصوّر کرتا ہوں۔

اردو ڈائجسٹ "شبستان" (نئی دہلی) کے "سالنامہ" (جنوری ۱۹۷۷ء) میں ایک مضمون نگار ابوالمنصور سرمدی نے (صفحہ ۲۲۷ سے ۲۳۶ تک) "اللہ والے" کے عنوان سے بریلی کے ایک مشہور بزرگ رازِ احمد عرف شاہ نیاز احمد اور اُن کے بزرگوں کے ذکر پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں کرشن جی کا بھی ذکر آ گیا ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے اس سے کرشن جی کی شخصیت پر بڑی روشنی پڑتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق وہ ننگی گوپیوں سے دلچسپی لینے والے رنگین مزاج راجہ نہیں، بلکہ کچھ اور تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:-

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"بریلی میں چودھری بسنت رائے نامی ایک صاحب رہتے تھے ..... ایک دفعہ چودھری بسنت رائے کی بیوی، بچے سب بیمار ہو گئے۔ شاہ نیاز احمد کو زحمت دی گئی۔ جب شاہ نیاز وہاں گئے تو اُن کی نظر ایک دیوار پر پڑی جس میں ایک طاق تھا۔ طاق پر زری کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ شاہ نیاز نے چودھری بسنت سے دریافت کیا :-

"پردے کے پیچھے کیا ہے ؟"

چودھری نے ادب سے جواب دیا :-

"کرشن جی کی تصویر ہے۔ بچوں کی وجہ سے بے احتیاطی اور بے ادبی ہوتی ہے، اس لیے اُسے ڈھانپ دیا ہے۔ درشن کرنا ہوتا ہے تو پردہ اٹھا کے کر لیتے ہیں۔"

شاہ نیاز نے حکم دیا کہ پردہ اٹھا دو۔ پردہ اٹھا دیا گیا۔ شاہ نیاز تصویر کی طرف متوجہ ہو کے بولے :-

"کرشن جی! جس گھر میں آپ ہوں وہاں کا یہ حال؟"

یہ کہہ کے شاہ نیاز خانقاہ واپس آ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چودھری بسنت رائے کے گھر سے بیماری رخصت ہو گئی۔ کسی نے شاہ نیاز سے اس واقعہ کے متعلق استفسار کیا کہ یہ کیا بات تھی؟ شاہ نیاز نے جواب دیا :-

"میری کرشن جی سے بہت ملاقات ہے۔
کرشن جی تو بڑے کامل موحّد تھے۔"

(صفحہ ۲۳۴ و ۲۳۵)

شاہ نیاز، عرف عام میں "نیاز بے نیاز" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ مشہور بزرگ شاہ رحمت اللہ اور مشہور بزرگ بی بی غریب نواز کے بیٹے ہیں جن کا مزار دلی میں ہے۔ بریلی کے مشہور بزرگ سید عبداللہ بغدادی کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی اور وہ بریلی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں بس گئے۔ یہیں انھوں نے ۹۵ برس کی عمر میں انتقال کیا اور بریلی میں شاہ نیاز کا مزار آج بھی خواص و عوام کا مرجع ہے۔

ہم مسلمانوں کے یہاں ہندوستان کی سب سے زیادہ برگزیدہ اور مقدّس و محترم قدیم ہستیاں دو ہی سمجھی جاتی ہیں۔ ایک شری رام چندر جی والئی اودھ کی ذات اور دوسری شری کرشن جی والئی دوارکا کی شخصیت۔ اور ان دونوں ہستیوں کی زندگی کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت دو قسم کی زندگیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ شری رام چندر جی کی زندگی آرام و آسائش اور عیش و آرائش کی زندگی ہے۔ اور شری کرشن جی کی حیات یکسر کلفت و مصیبت اور تمام تر حزن و ملال کی آئینہ دار ہے۔ لہٰذا اس طرح کی دادِ عیش دینے کا موقع اگر مل سکتا تھا تو شری رام چندر جی کو مل سکتا تھا کیونکہ رام چندر جی کی زندگی سے جلا وطنی والے سالوں کو نکال دیجئے تو ان کی ساری زندگی عیش و آرام کی زندگی تھی۔ جلا وطنی کے زمانہ میں بھی غربتِ وطن اور مسافرت کی تکلیف کے سوا کوئی خاص تکلیف انھوں نے نہیں اٹھائی۔ مگر تعجب ہے کہ رام چندر جی کی عیش و آرام کی زندگی میں دادِ عیش والی اس طرح کی کوئی روایت موجود نہیں۔ برخلاف ان کے بچارے شری کرشن جی "راجکمار" اور "راجہ" ہوتے ہوئے بھی پیدائش سے موت تک بس دکھ اور مصیبتیں ہی جھیلتے رہے۔ پھر اُن کو کب؟ کس طرح؟ اور کہاں؟ ایسا موقع ملا کہ وہ اس طرح، چھوکریوں میں گھرے رہ کر، دادِ عیش دیتے؟ انہیں کہاں؟ کیسے؟ اور کب؟ یہ فراغت نصیب ہوئی کہ وہ گوپیوں سے لطف اٹھائیں؟

افسوس ہے کہ شاعرِ انقلاب پدم بھوشن حضرت جوش ملیح آبادی نے بھی شری کرشن جی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس میں بھی اِس کا اشارہ موجود ہے:۔

"کرشن جی کا نام ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ شیریں ہے۔ میں نے جب کبھی یہ عشق و محبت سے لبریز نام سنا، ہمیشہ میرے کام و دہن نے، قند و شہد کی سی شیرینی محسوس کی۔ میرا شامّہ بھیگی ہوئی رات کو چٹکنے والی کلیوں کی دوشیزہ شمیم سے مست ہوگیا۔ اور

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میرے کانوں میں ایک ایسی وجد آفریں ملائم صدا آنے لگی گویا کسی
نامعلوم دور کے جزیرے سے بانسری کی آواز آرہی ہے - اس نام میں
میں ایک روحانی کیفیت ہے، کانوں میں پڑتے ہی، دیوکی کے پاک
آغوش کی عطر بیزیاں، طوفانی رات کی کڑک چمک، جمنا کی تیز و تند
موجیں، جسودا کے آنگن کی روشنی، گوکل بن کی مست فضائیں، گوپیوں
کی چاند سی پیشانیوں کی بندیاں، مرلی کی آوازیں، کنس کی اٹھتی ہوئی
تلوار کی جھنکار، بدکاری و سفاکی، کی شکست اور حق و صداقت کی
فتح، یکایک دماغ پر بے نقاب ہو جاتی ہے۔"

اس حسین و رنگین اور مختصر ترین عبارت میں شری کرشن جی کی جو تصویر ہے وہ ایک
خوش باش راجکمار اور رنگین مزاج نوجوان کی ہے۔ حالانکہ واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے۔
لوگ بچے کی آرزو رکھتے ہیں اور اولاد کے لئے دعائیں کیا کرتے ہیں۔ مگر شری کرشن جی
اس وقت دنیا میں آتے ہیں جب ان کے والدین کی بہترین تمنا اور دلی دعا یہ تھی کہ انہیں
کوئی بیٹا نہ ہو، تاکہ اس ننھی سی جان کا قتل اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ راجکمار تھے مگر
پیدائش ہوئی تو راج محل کی بجائے جیل کی کوٹھری میں اور ایسی گمنامی و کس مپرسی کی
حالت میں کہ بھادوں کی بھری برسات، سردی و بارش اور ظلمت و تاریکی کے سبب ہاتھ
کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ پاس میں نہ کوئی یار و مددگار تھا نہ غمخوار و پرسان حال، چہل
پہل کی بجائے ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر پریشانی اور خوف سے سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ پیدائش
سے والدین کو خوشی کیا ہوتی کہ عذاب جان ہو گیا کہ کیسے اس بچے کی جان بچائی جائے؟
بجائے اس کے کہ بچہ نرم و نازک غالیچہ پر نہلا دھلا کے ڈالا جاتا اور وہ ماں کی گود کو
آباد کرتا، باپ نے ویسے ہی گندی حالت میں اس کو ٹوکریا میں ڈالا اور سینے سے لگائے رکھنے
کی بجائے، ہمیشہ کے لئے اس کو جدا کر دینے کو روانہ ہو گئے۔ بچہ کو گھر ملا تو ایک گوالے کا
جہاں گندگی کے سوا کچھ نہ ہو۔ گوکل اور بندرابن میں بھی جو عمر انہوں نے گزاری وہ قابل
رشک نہیں بلکہ دکھوں اور مصیبتوں سے بھری تھی۔ کس نے انہیں دق نہیں کیا؟ کون سی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

آفت و مصیبت ہے جو اُن پر نہ آئی؟ جسو دا نے اُن کا ہاتھ رسّی سے باندھ کر اُنہیں سزا دی۔ جو ہاتھ سونے کے کڑے پہننے کو تھے وہ رسّیوں کی بندش کے مرہون منّت بنے۔ پوتنا نے زہر ڈال کے دودھ پلایا اور اُن کی زندگی ہی ختم کر دینا چاہا۔ بکا سُر نے بگلے کی صورت میں، کیشی نے گھوڑے کا روپ اختیار کر کے، بتا سُر نے بچھیرا بن کے، کاگا سُر نے کوا بن کے، برشبھ سہا سُر نے بیل بن کے، اُن کو مار ڈالنے کی کوشش کی۔ سیکڑوں راکشش قدم قدم پر اُن کی جان کے خواہاں ہوئے۔ خیر یہ تو راکشش ہی تھے جنہیں آنندہ برگزیدہ بننے والے انسان سے نفرت و عداوت ہوتی ہی ہے، خود برہما اور برہمن تک کا سلوک اُن کے ساتھ کون اور کب اچھا رہا ہے؟ - سری دھر برہمن ان کو مٹا دینے کو آئے۔ اندر جی مہاراج، طوفان برپا کر کے نہ صرف اُن کو بلکہ پورے گوکل والوں ہی کو تباہ و برباد کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔ انتہا یہ ہے کہ برہما نے بھی اُن کو دق کرنے کے لیے، اُن کی رکھوالی کے اندر والے جانوروں کو پہاڑ کی گھاٹی میں چھپا دیا۔ کس نے کیا نہیں کیا؟ کس نے اُن کے ساتھ مہربانی کی؟ یہ گیارہ برس جو اُن کے کھیلنے کودنے کے دن تھے، صرف مصیبت و پریشانی کے نذر ہوئے۔ جانوروں کی ہمرہی، جنگل کی رہائش، بے سر و سامانی کی زندگی اور اُس پر یہ ارضی و سماوی آفات۔ سوچئے اور بتلائیے تو اور کسی کا بچپنا اتنا بے کیف و بے مزہ کبھی گزرا ہے؟ بانسری اور نغمہ کے سوا، تیسرا کبھی کوئی غمخوار و مددگار اُن کا تھا؟ جسم و دماغ کی ساری تکالیف و مصائب کو وہ روزانہ یوں بھلا دیتے تھے کہ بانسری پر کچھ دیر گاکے روح اور وجدان کو سرور بخش دیتے تھے۔

بارہویں برس گوکل سے نکلے اور متھرا پہنچے تو وہاں بھی اُنہیں کبھی جسمانی و دماغی سکون نصیب نہ ہوا۔ دیکھتے ہیں کہ ظالم ماموں، والدین کو جیل میں سڑا رہا ہے۔ اللہ کے بندوں پر آفت آئی ہوئی ہے۔ رعایا کراہ رہی ہے۔ ملازمین نالاں ہیں اور اہل کار نجات کے خواہاں اور اُمیدوار ہیں۔ آخر وہ سب کی مدد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور پھر دکھوں، مصیبتوں، پریشانیوں اور صعوبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ آج جب کوئی فرد، حکومت سے ٹکر لیتا ہے تو اُس کا کیا کیا نہ حشر ہوتا ہے۔ گاندھی جی اُس کا تازہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نمونہ ہیں۔ اور کرشن جی تو قہرمانی استبدادیت، فرعونیت و ہامانیت اور کنسیت درادنیت کے خلاف صف آرا ہوتے تھے۔ اُن کو ایک جابر و ظالم مطلق العنان عظیم فرمانروا سے نپٹنا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں انہیں کیا کچھ نہ صدمے برداشت کرنے پڑے ہوں گے۔ مگر کامیابی تو ہمیشہ انہیں کو نصیب ہوا کرتی ہے جو حق پر ہوں اور جو ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ صداقت پر ڈٹے ہوئے رہیں۔ چنانچہ بالآخر شری کرشن جی کو اللہ تعالےٰ نے کامیابی عطا کی۔ انھوں راجہ کنس کو قتل کیا والدین کو قید سے آزادی دلائی۔ اور عوام کو ظالم حکومت کے چنگل سے نجات دلایا پھر ان سب کارناموں کے بعد بھی یہ نہ ہوا کہ وہ خود تخت نشین ہو کر دادِ عیش دیتے اور پہلی مصیبتوں کا مداوا کرنے لگے ہوں بلکہ انھوں نے اپنے نانا راجہ اگرسین کو، جنہیں اُن کے بیٹے کنس نے قید کر کے گدی حاصل کی تھی، جیل سے نکلوا کے تخت نشین کیا اور اکرور جی کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سونپا۔

جہاں تک میرا علم ہے، شری کرشن جی کی زندگی کا کوئی دن اور کوئی لمحہ چین اور اطمینان سے کبھی اور کہیں بسر نہیں ہوا۔ وہ چین سے کھاتے اور آرام سے سوتے تک نہ تھے، پھر گوپیوں کے ساتھ دادِ عیش کیا دے سکتے تھے؟

یہ صحیح ہے کہ جب راجہ اگرسین کا انتقال ہو گیا تو انہیں راج گدی پر بٹھایا گیا۔ مگر شری کرشن جی برگزیدگی کے مرتبہ پر فائز تھے۔ وہ عہدۂ حکومت کو خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، عیش پرستی کا وسیلہ نہیں، اس لئے خادمِ قوم و ملک کی حیثیت میں وہ فکر و غور میں مستغرق اور رعایا کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف و منہمک رہا کئے۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ اس دور میں بھی وہ پریشاں خاطر ہی رہے رعایا میں سے ایک نے اُن پر اس کا ہیرا چھین یا چرا لینے کا الزام لگا دیا۔ سوچئے کہ اس بہتانِ عظیم سے اُن کو کیسی ذہنی و دماغی الجھن ہوئی ہوگی؟ ذلّت و رسوائی کا کتنا بڑا بوجھ اُن کے قلب و ضمیر پر پڑا ہوگا؟ اس الزام سے بری ہوئے تو جراسندھ والی مگدھ نے جنگ کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ اس نے پے در پے اکیس ۲۱ حملے کئے اور ناک میں دم کر دیا۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک جنگ تو سارے ملک و قوم کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے اور اکیس ۲۱ جنگ کے انتظام د

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انصرام میں اُن کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی!

پیغمبرِ اسلام محمد رسول اللہ کی زندگی بھی ایسی ہی کرب و اذیت میں گزری۔ شروع سے آخر تک فقر و فاقہ، تکلیف و مصیبت اور پریشانیاں اُٹھائیں۔ جسمانی سہولت، چین و آرام اور اطمینان کا سونا ان کو کبھی نصیب نہ ہوا۔ جب معترضوں نے آپ پر یہ الزام دھرا کہ انھوں نے نو بیویاں جنسی مزے داریوں کے لیے کی تھیں تو ڈاکٹر [illegible] نے کیا خوب جواب دیا تھا کہ:

"کیا ان احمقوں کو یہ معلوم نہیں کہ محمد نے پچیس برس کی عمر میں تو چالیس برس کی بیوہ سے شادی کی تھی اور پچاس برس تک صرف ایک ہی بیوی پر کفایت کی تھی؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ بقیہ آٹھ بوڑھی اور جوان بیویاں، انھوں نے اُس وقت کی تھیں جب اُن کی عمر کا آخری باون سال تھا؟ اور کیا یہ عقلمند اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جس شخص نے تیرہ برس کی مختصر مدت میں بہتر جنگوں کا سامنا اور انتظام کیا اور دشمنوں سے نبرد آزما رہا ہو، کیا اُس کے بارے میں یہ کبھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اُس کو اس عرصہ میں ایک رات بھی ایسی پُرسکون میسر آسکی ہوگی کہ وہ کسی بیوی سے ملے؟"

پھر کیا شری کرشن جی کی اُن اُلجھنوں، دقتوں اور پریشانیوں کا صحیح اندازہ ممکن ہے جو اُنھیں یہ اکیس جنگیں لڑنے کے سلسلے میں، برداشت کرنی پڑی ہوں گی؟ شری کرشن جی اِس مسلسل جنگ بازی اور لامتناہی زور آزمائی سے اس قدر پریشان ہوگئے تھے کہ بالآخر متھرا سے دوارکا ہجرت کر گئے تھے۔ راجہ ششپال اور دوسرے حکمرانوں نے جتنا کچھ اُن کو دق اور پریشان کیا وہ الگ ہے۔ آخر زمانہ میں اُن کی اولاد اور قوم بھی اُن کے سامنے کٹ مری۔ حد تو یہ ہے کہ وہ آرام سے بستر پر جان بھی نہ دے سکے بلکہ ایک شکاری کے زہریلے تیر سے گھائل ہو کر وفات کر گئے۔

اس نقشہ سے ظاہر ہے کہ کرشن جی کی زندگی، مسلسل آفات و مصائب، پیہم

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دکھ اور صدمہ، متواتر جنگ و پیکار اور لگاتار حادثات و غزوات میں گذری۔ انہیں زندگی بھر کبھی چین اور سکھ نہیں ملا۔ اور رنگ رلیاں مطمئن زندگی میں منائی جاتی ہیں۔ لہذا گوپیوں کے ساتھ اُن کے رنگ رلیاں منانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کرشن جی پیغمبروں میں سے ایک تھے، پیغمبر نہ تو عیش پرست اور جنسیت کا شکار ہوا کرتا ہے، اور نہ وہ غم غلط کرنے کو عورتوں کو باریاب کرتا ہے۔ پیغمبروں کی ذات انقلاب آفریں ہوتی ہے۔ ہر انقلاب کا ایک پروگرام ہوتا ہے اور پیغمبروں کے اپنے اپنے طریق کار ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ پیغمبروں کی مدد اللہ کرتا ہے، مگر اس دار الاسباب میں ہر پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے کچھ انسانوں کی بھی مدد ضروری ہوتی ہے۔ اور اولوالعزم پیغمبران اپنی تعلیمات اور انقلاب کے پھیلانے کے لئے "مردوں" کا انتخاب کرتے تھے۔ مگر جن طاغوتی طاقتوں سے کرشن جی کا مقابلہ تھا، اُن میں "مرد" اُن کے مددگار و معاون نہیں بن سکتے تھے کیونکہ کرشن جی نے یہ دیکھ اور سمجھ لیا تھا کہ سارے "مرد" طاغوتی جادو سے مسحور اور شیطانی زنجیروں میں مسلول تھے، نیز مذہب کے معاملے میں عورتیں جلد متاثر ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ عورتیں جو کام کر گزرتی ہیں وہ مرد نہیں کر پاتے۔ دنیا کے عظیم انقلابات میں عورتوں کا عظیم حصہ آج بھی مسلّم ہے۔ لہذا کرشن جی نے اپنے انقلابی پروگرام میں نوجوان عورتوں کو حصہ دار بنا کر اُن سے کام لیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اپنے مشن کی کامیابی کے سلسلے میں اُن کا اُن نوجوان عورتوں سے ملتے جلتے رہنا، اُن کی کارکردگی کی رپورٹ لیتے رہنا، اور پھر اُن کو مزید ہدایتیں دیتے رہنا ضروری تھا، لہذا وہ گوپیوں سے، جو اُن کی انقلابی تحریک میں معاون و مددگار تھیں، ملتے رہتے تھے۔ یہ ہے گوپیوں کے ساتھ کرشن جی کے تعلّقات کی حقیقت، مگر افسوس ہے کہ کرشن جی کی اس منفرد سبق آموز عظیم خصوصیت سے، کہ انقلابی تحریکوں میں عورتوں کو شریک کر کے ان سے کام لینا چاہئے، سبق لینے کے بجائے، لوگوں نے ان کی ذات گرامی کو جنسیت کی شراب میں غرق کر دیا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"گیتا" کے متعلق لوگوں کی رائے

"گیتا" جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، دراصل "مہابھارت" کتاب کا ایک جزو ہے جس کو اُس سے الگ کر کے علیحدہ کتابی شکل دی گئی ہے۔ اس میں شری کرشن جی کی وہ تعلیمیں مندرج بتائی جاتی ہیں جو اُنھوں نے میدانِ کارزار میں ارجن کو دی تھیں۔ اس کے بارے میں اب تک تحقیق نہ ہو سکا ہے کہ یہ واقعی کس کی تصنیف ہے؟ ڈاکٹر داس گپتا نے اپنی کتاب "تاریخ فلسفۂ ہند" کی جلد دوم صفحہ ۵۴۸ میں لکھا ہے کہ:۔

"گیتا کے متعلق یہ طے نہیں ہو سکا ہے کہ یہ کس عہد کی تصنیف ہے۔ گیتا میں "برہم سوتر" کا حوالہ موجود ہے جس وجہ سے گیتا دوسری صدی قبل مسیح کے بھی بعد کی چیز قرار پاتی ہے۔"

مسٹر داس گپتا نے جلد اول صفحہ ۴۲۱ و ۴۲۲ میں لکھا ہے کہ:۔

"میری تحقیق کے مطابق یہ کتاب، جو بعد میں مہابھارت میں شامل کی گئی "THE EKANTI VAIS NARAS" کی تصنیف ہے۔

پنڈت گنگا پرشاد اوپدھیائے نے اخبار "تیج" کے "کرشن نمبر" میں کہا ہے کہ:۔

"شری کرشن جی نے ویدک دھرم یا ویدک تہذیب کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کے لیے جو جدوجہد کی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ شری کرشن جی کو دھرم کو محفوظ رکھنے میں وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو ان کی کوشش سے مطابقت رکھ سکے۔ جو گراوٹ شری کرشن جی کی زندگی سے پہلے شروع ہوئی تھی وہ اب تک جاری ہے۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ :۔

"مجھے یہ بات بہت دلچسپ معلوم ہوئی کہ کرشن جی کی زندگی کے حالات عیسیٰ مسیح کے حالات کی صدائے بازگشت ہیں اور گیتا کی تعلیمات عیسائی مذہب کے اصول کا ایک عکس ہیں۔"

گویا شری کرشن جی نے بھی حضرت مسیح کی طرح گیتا میں یہی سبق دیا ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر ایک طمانچہ مارے تو تم اپنا بایاں گال بھی اُس کے سامنے پیش کر دو۔ حالانکہ گیتا کی تعلیمات بالکل عیسائی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو:۔

"اہنسا ہندو مذہب کا جزو نہیں ہے۔ کیونکہ گیتا اہنسا کے خلاف ہے۔"

اجمل خاں نے "گیتا" کے نثری ترجمہ "نغمہ خداوندی" کے مقدمہ میں لکھا ہے :۔

"بعضوں کا خیال ہے کہ گیتا میں جو کوروں اور پانڈوں کی جنگ دکھائی گئی ہے، وہ محض تمثیلی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ حقیقت میں انسان کے اندرونی جذبات کی کشمکش کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تاریخی ارجن اور تاریخی کرشن تھے ضرور، مگر گیتا میں جس کرشن کا ذکر ہے، وہ تاریخی کرشن نہیں ہیں، بلکہ اُن کے پردے میں مکمل کرشن کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یعنی گیتا جنگ کی تعلیم نہیں دیتی۔ چنانچہ محمد عزیز اللہ حسینی نے ۱۹۰۸ء کے "دکن ریویو" میں یہی لکھا ہے کہ اس سے پہلے ہٹھ یوگ کے مذاق پر ایک شرح لکھی جا چکی ہے جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ کوروں اور پانڈوں میں جو لڑائی ہوئی تھی، اُس میں کوروں کا بادشاہ اندھا تھا اور اپنے رتھبان سے اس قصے کو سنتا تھا۔ یہاں "بادشاہ" سے مراد "دل" ہے جو حقیقت میں اندھا ہے۔ اور "رتھبان" دراصل "حواس" ہے، جس کے بغیر دل کچھ نہیں کر سکتا۔ غرض کہ اسی قسم کے مفروضات سے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ انسان کے نیک و بد جذبات کی جنگ کے علاوہ اور کسی جنگ کا تذکرہ گیتا میں نہ سمجھنا چاہیے اور اس اندرونی جنگ میں ہر انسان کو ارجن کی طرح، بُرے جذبات کو قتل کر دینا چاہیے تاکہ کامل سکون اور وصالِ الٰہی ہو۔ لیکن میری ناچیز رائے میں گیتا سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے "

پھر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :-

" درحقیقت گیتا میں اندرونی جذبات کی کشمکش نہیں، بلکہ معمولی جسمانی جنگ دکھائی گئی ہے اور یہ کتاب تمثیل نہیں ہے، بلکہ " مہابھارت" کو نمونہ کے طور پر پیش کرتی ہے اور ہر شخص کو ایسی حق کی لڑائی کے لئے دعوت دیتی ہے۔

مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ گیتا میں شروع سے آخر تک ارجن کو یہ بتایا گیا ہے کہ جنگ کرو اس لئے کہ یہ تمہارا فرض ہے۔ اگر ایسا نہ کروگے تو دنیا بھر میں رسوا اور ذلیل ہو جاؤ گے۔ ارجن کہتے ہیں کہ بھائی بندوں کو قتل کر کے جو سلطنت حاصل ہو گی، اس سے تو بھیک مانگنا بہتر ہے۔ شری کرشن جی فرماتے ہیں کہ نہ کوئی مارنے والا ہے۔ نہ مرنے والا ہے جو کچھ کارکنانِ قضا و قدر نے طے کر دیا ہے وہی ہو گا اور انسان مجبور محض ہے، جو کچھ خدا کراتا ہے وہی وہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ تو خود اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہی کرے گا جو ہونے والا ہے، آتما نہ مرتی ہے نہ مارتی ہے۔ اس لئے کھڑا ہو اور جنگ کر"

پھر بہت کچھ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :-

" اتنی زبردست اخلاقی تعلیم، اتنے بلند اور رفیع فلسفہ کو اگر محض یہ خیال کر کے ترک کر دیا جائے کہ قتال یا جنگ سے ایذا رسانی ہوتی ہے اس لئے یہ قابل قبول نہیں ہے، یا اس کی تاویل اس طرح کی جائے کہ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

گیتا میں صرف اندرونی جذبات کی کشمکش، سری کرشن اور ارجن کے مکالمہ کے پیرایہ میں دکھائی گئی ہے، تو میری ناچیز رائے میں، یہ نتیجہ سراسر عقل اور تاریخ دونوں کے خلاف ہوگا۔"

جس طرح مسٹر آرنلڈ (ARNOLD) نے "قرآن اور بائبل" اور مفتی سید عبدالقیوم جالندھری نے "گیتا اور قرآن" لکھی تھی، اُسی طرح پنڈت سندر لال نے بھی ایک کتاب "گیتا اور قرآن" کے نام سے لکھی ہے، جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اس کتاب میں وہ فرماتے ہیں:-

"مہابھارت کے بھیشم پرو کے پچیسویں[25] ادھیائے سے بیالیسویں[42] ادھیائے تک کا نام "گیتا" ہے۔ ان اٹھارہ[18] ادھیاؤں میں وہ بات چیت لکھی ہے جو "مہابھارت" کی لڑائی کے شروع میں شری کرشن اور ارجن میں ہوئی تھی۔ لڑائی کے دسویں دن، سنجے نے یہ بات چیت دھرت راشٹر کو سنائی تھی۔ سنجے کہتا ہے کہ "میں نے یہ سب بات چیت، ویاس کی کرپا سے خود یوگیشور کرشن کے منہ سے سنی تھی (۱۸-۷۵) بھیشم پرو کے دوسرے ادھیائے میں لکھا ہے کہ بیاس نے سنجے کو وہ دویہ درشٹی (روحانی آنکھ) دے دی تھی جس سے وہ دور بیٹھا ہوا لڑائی کا سب حال دیکھتا اور سنتا رہا۔

بہت سے ٹیکا کرنے والوں (مفسّروں) نے یہ شک ظاہر کیا ہے کہ ٹھیک لڑائی کے درمیان، جب دونوں فوجیں تیّار کھڑی تھیں، اس طرح کے کٹھن معاملوں پر شری کرشن اور ارجن کا اشلوکوں میں، اتنی لمبی بات چیت کرنا اور پھر سنجے کا اُن اشلوکوں کو، کسی کرامات سے دور بیٹھے سن کر جیوں کا تیوں یاد رکھنا، ایک انہونی سی بات ہے، اور ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ بھی ... کہ ... گیتا کے ... اشلوکوں ...

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے ایک ٹیکا کرنے والے نے ستو، دوسرے نے چھتیس[۳۶]، تیسرے نے اٹھائیس[۲۸] اور چوتھے نے سات اشلوک کھوج نکالے۔ اِن ودوانوں کی رائے ہے کہ ان اصلی اشلوکوں میں جو بات کہی گئی ہے وہی وہ اصل بات ہے جو شری کرشن نے ارجن کو سمجھائی تھی اور بعد میں بڑھا کر اور اشلوکوں کی شکل دے کر، بیاس نے سات سَو اشلوکوں کی "گیتا" تیار کر دی۔

اسی مشکل کو حل کرنے کے لئے کئی ودوان، گیتا کے اندر کے لڑائی کے بیان کو صرف ایک النکار (تشبیہ یا ALLEGORY) ملنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب آدمی کے آتما کے اندر ہونے والی نیکی اور بدی کی لڑائی کا ہی بیان ہے۔"

لوک مانیہ بال گنگادھر تلک کی رائے ہے کہ :-

"پرنتو جن کو گرنتھ کا ہی رہسیہ (راز) جاننا ہے، اُن کے لئے اِس بہِرنگ پریکشا (بیرونی امتحان) کے جھگڑے میں پڑنا اناوشیک (غیر ضروری) ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ "مہابھارت" کی لڑائی کبھی واقعی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، اس میں لڑائی سے پہلے شری کرشن جی اور ارجن نے اس طرح کی بات چیت واقعتاً کی ہو یا نہ کی ہو۔ سنجے کو دیدۂ بینا اور گوشِ شنوا، ملا ہو یا نہ ملا ہو؛ یہ ظاہر ہے کہ "گیتا" کے اشلوک نہ شری کرشن یا ارجن کے بنائے ہوئے ہیں، اور نہ سنجے کے۔ یہ اشلوک ویاس کے بنائے ہوئے ہیں۔ گیتا کے تمام اشلوکوں کو، موجودہ شکل میں شری کرشن یا ارجن کے منہ سے بجنسہ نکلا ہوا اشلوک سمجھنا یا گیتا کی بات چیت کو تاریخ اور اتہاس کی کسوٹی پر کسنا "گیتا" کی صحیح قدر دانی نہیں ہے۔ "گیتا" میں جو کچھ بھی ہے اس میں تو شک نہیں ہے کہ وہ تمام اُپنشدوں کا نچوڑ ہے جسے پڑھنے کے بعد کسی دوسرے شاستر کو پڑھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اپنے خاص شاندار انداز اور طریقے سے، اپنے زمانے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی مذہبی حالت کی سچی تصویر اور صاف صاف شکل میں ہر ملک اور ہر زمانہ کی گمراہی
میں پڑی ہوئی روحوں کے لیے ایک اعلیٰ، قیمتی اور زندہ جاوید پیغام ہے۔ گیتا خدائی
پیغام ہو یا انسانی کلام، کرشن جی کی حقیقی تعلیمات پر مشتمل ہو یا صرف ان سے منسوب شدہ،
نہ تو "گیتا" کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس کی تعلیمات کی عظمت و افادی حیثیت
سے۔ اور پچھلے ہزاروں برس میں جتنی تفسیریں گیتا کی لکھی جا چکی ہیں وہ ہندوؤں کی کسی
دوسری مذہبی کتاب کی نہیں لکھی گئیں۔

"گیتا" سے جو لوگ گھبراتے اور اس کی تعلیمات کو تمثیلی قرار دیتے ہیں، اس کی
وجہ یہ ہے کہ "گیتا" میں کرشن جی کی زبان سے ارجن کو جنگ و خونریزی کا اشتعال
دلایا گیا ہے۔ مگر لوگ اس پر مطلق غور نہیں کرتے کہ وہ موقع اور محل کیا تھا؟ یہ حکم اُس
وقت دیا گیا تھا، جب اِس کی سخت ضرورت تھی اور جنگ ناگزیر تھی۔ اور اُس وقت
اُس سے کترانا بزدلی اور کم ظرفی قرار دیا جاتا۔ اور اسی تعلیم کی وجہ سے کسی دیدہ ور نے
اِس تعلیم کو رزمیہ مثنوی یا جنگ نامہ کا جزو بنا دیا۔ ورنہ وہ کسی اور کتاب میں بھی شامل
کی جا سکتی تھی یا مستقل تصنیف کی حیثیت سے علیحدہ بھی لکھی جا سکتی تھی۔ مگر سادہ لوحوں
کا حال یہ ہے کہ چونکہ گیتا، مہابھارت کا جزو ہے، اس لئے "مہابھارت" کی حقیقت سے
بھی انکار کرتے ہیں۔ اور اسے تمثیلی قرار دے کر اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینا چاہتے ہیں۔
جنگ سے کترانے والے، خونریزی کو بُرا کہنے والے اور موت سے بھاگنے والے صرف وہ
لوگ ہیں جو تخیل کی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ حقائق کی دنیا سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔
اور "گیتا" حقائق کی دنیا کی کتاب ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ تعلیم بظاہر بڑی حسین
معلوم ہوتی ہے کہ کوئی تمہارے ایک گال پر ایک طمانچہ مارے تو اُسی کے سامنے اپنا دوسرا
گال بھی پیش کر دو۔ مگر ایک تو اِس تعلیم کی صداقت کا کوئی ثبوت موجود نہیں، دوسرے
اِس تعلیم کو عملاً نہیں صرف قولاً دنیا کے سامنے وہی لوگ پیش کرتے ہیں جو اپنے سوا
سب کو احمق سمجھتے ہیں۔ ورنہ حقیقت کی دنیا سے ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کی جا سکتی
کہ ایک عیسائی نے خود بھی اس تعلیم اور اصول پر کبھی عمل کیا ہو۔ بلکہ ہر عیسائی ایسا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے جس نے ایک گال پر ایک طمانچہ پڑنے پر، اُس نے اپنے فریق کے دونوں گالوں پر دو دو طمانچے مارے ہیں۔ زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ گذشتہ دونوں جنگ عظیم اس کا ناقابلِ انکار ثبوت ہیں جو خود عیسائیوں ہی کے درمیان برپا ہوئی تھیں۔

"گیتا" کا مصنف جو بھی ہو، مگر یقیناً وہ حقیقت کی دنیا کا سب سے بڑا راز دار اور کارگاہِ حیات کا عظیم ترین رمز شناس تھا۔ اور جس نے اس کتاب کو "مہا بھارت" کے اندر اُس کے چھٹے باب کی صورت میں داخل کیا وہ بلاشبہ فطرتِ انسانی اور مشیتِ الٰہی کا واقف کار تھا۔

قرآنِ حکیم میں بھی اگرچہ صبر و تحمل، عفو و درگزر اور بُرائی کا بدلہ نیکی سے دینے کا لاتعداد مقامات پر سبق دیا گیا ہے۔ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اصول حتمی اور ہر جگہ اور ہر محل کے لئے نہیں ہے۔ یہ تعلیم انفرادی اور ذاتی معاملات کے لئے ہے، مُلکی اور قومی معاملات کے لئے نہیں۔ دینی و سیاسی مسائل میں جنگ ناگزیر ہو تو پوری قوت اور قدرت سے جنگ کرو اور اس طرح جم کر جنگ کرو کہ میدانِ وغا میں، تمہاری پیٹھ دشمن کی طرف ہونے نہ پاوے۔ اس بارے میں قرآن عظیم اور گیتا کی تعلیمات بالکل یکساں ہیں اور یہ قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالےٰ خود اپنے بندوں پر سب سے زیادہ مہربان اور اُن کے ناشائستہ حرکات و افعال سے صرفِ نظر اور درگزر کرنے والا ہے۔ مگر جب بندوں کی سرکشی و گستاخی کی انتہا ہو جاتی ہے اور یہ لازمی نظر آتا ہے کہ دنیا کی فلاح و بہبود اور عبرت و بصیرت کے لئے اُن نالائق و ناہنجار افراد و اقوام کو ختم کر دیا جائے، تو وہ بلاتکلف اُنہیں تباہ و برباد اور نیست و نابود کر دیتا ہے۔ انسان اللہ تعالےٰ کی ہی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اس لئے انسان کا بھی اِسی اصول پر عمل کرنا عین مقتضائے فطرت و مشیت ہے۔ اور اس قانون سے زیادہ عمدہ، زیادہ سچّا اور زیادہ منصفانہ کوئی دوسرا قانون نہ تو ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیئے تھا۔

انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی اچھی اچھی باتوں کو پیش کرتا ہے اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کانوں کو شیریں اور دل کو بھلے لگتے ہیں۔ اور اُن کو

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پڑھنے اور سننے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق اور نیکی کے ہیں مگر درحقیقت وہ خیالی اور ہوائی باتیں ہیں، جن پر نہ کبھی کہیں عمل درآمد ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی "اہنسا" کے بڑے رسیا اور عدم تشدد کے عظیم پرچارک معلوم ہوتے تھے، مگر کیا حقیقتاً یہ اُن کے دل کی آواز تھی؟ یا صرف متشدد انگریزوں کو شرم دلانا تھا کہ "انجیل" والوں کا وہ عمل ہے اور "گیتا" والوں کا یہ قول ہے؟ انگریزوں سے مقابلہ، جنگ و اسلحہ جات سے نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا گاندھی جی نے "اہنسا" کا عاقلانہ حربہ استعمال کیا۔ ورنہ وہ اس کے واقعی دل سے قائل نہ تھے۔ ایک مرتبہ ایک حبشی پادری کو کسی انگریز نے کسی بات پر ایک طمانچہ مار دیا تھا۔ ہر چند کہ وہ حبشی اُس انگریز سے زیادہ طاقتور و توانا تھا مگر عیسائی تعلیم زدہ تھا اس لئے الٹا وہی خود انگریز سے معذرت کرنے لگا۔ گاندھی جی نے اس واقعہ کو اپنے اخبار "ہریجن" کی اشاعت مورخہ ۹ راگست ۱۹۴۶ء میں درج کر کے، اُس آدمی کو، جس نے یہ خبر دے کر سوال پوچھا تھا؟ جواب دیا تھا کہ :-

> "یہ 'اہنسا' نہیں ہے۔ یہ مسیح کی تعلیم کی تضحیک ہے۔ جوانمردی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ حبشی پادری، اُس سفید فام انگریز سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیتا۔"

دیکھا؟ "اہنسا" والے گاندھی جی کا صحیح خیال کیا تھا؟ اس واقعہ اور بیان سے پہلے، کسی نے ایک بار اُن سے دریافت کیا کہ کیا انسان کو ہر حال میں تشدد اور ہنسائے پرہیز کرنا چاہیے؟ گاندھی جی نے اِس سوال کو اپنے "ہریجن" کی اشاعت مورخہ ۹ رجون ۱۹۴۶ء میں درج کر کے لکھا تھا کہ :-

> "یہ ناممکن ہے کہ انسان تشدد سے اپنی زندگی میں یکسر مجتنب رہ سکے۔ البتہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ امتیازی نشان کس مقام پر کھینچا جائے؟ کیونکہ ہر خط، ہر شخص کے لئے ایک ہی نہیں ہو سکتا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ گاندھی جی "اہنسا" کو صداقتِ مطلق نہیں سمجھتے اور مانتے تھے اُن کے نزدیک "ہنسا" اور "اہنسا" کا تعلق حالات اور مواقع سے تھا۔ اُن کے نزدیک

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انسان کے سامنے ایسے مواقع بھی آسکتے ہیں جب "اہنسا" پر عمل کرنا عقلمندی اور ثواب نہیں، بلکہ حماقت اور بدترین گناہ ہو جاسکتا ہے۔ گاندھی جی "اہنسا" کے ساتھ ساتھ "جیو ہتیا" کے بھی قائل نہ تھے اور پرندوں اور جانوروں کو مارنے کے سخت خلاف تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے اُن سے پوچھا کہ اگر آپ "جیو ہتیا" کو بُرا جانتے ہیں تو درندوں اور موذی جانوروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے اس سوال کو "ہریجن" مورخہ ۵ مئی ۱۹۴۶ء میں درج کر کے لکھا تھا کہ:-

"جو جانور انسانوں کو چیر پھاڑ ڈالیں یا اُن کو کسی طرح کا نقصان پہنچائیں، اُن کی جان بچانے کے لئے، میں اپنے دل میں کوئی جذبہ نہیں پاتا۔ بلکہ میں اُن کی نسل کی افزائش میں مدد دینے کو بھی غلطی سمجھتا ہوں"

غور فرمائیے۔ اُن کو مارنا تو ایک طرف رہا، گاندھی جی درندوں اور موذی جانوروں کی نسل ہی ختم کر دینے کو کارِ خیر سمجھتے تھے۔ بہر کیف! گیتا کی تعلیماتِ جنگ، قطعاً" قانونِ قدرت اور اصولِ فطرت کے مطابق ہیں۔ اور ان ہی اُصولوں پر دنیا نے ہمیشہ عمل کیا بھی ہے اور عمل کرتی رہے گی۔ جو لوگ گیتا کی تعلیماتِ جنگ کو غلط سمجھتے ہیں وہ لوگ خواب کی بے سروپا دنیا میں رہتے ہیں یا رہنا چاہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ دنیا بھی غلط ہے اور گیتا کی تعلیم بھی۔ اور ایسے لوگوں کا شمار زندوں میں نہیں ہو سکتا یا کیا جاسکتا۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

گیتا کو مہابھارت کا جزو کیوں بنایا گیا؟

"گیتا" کے سلسلہ میں جس قدر کتابیں اور مضامین، میری نظر سے گزرے ہیں، اُن میں سے کسی میں بھی مجھے یہ سوال اور اُس کا جواب نہیں ملا کہ آخر "گیتا" جب ایک علحدہ کتاب کی حیثیت رکھتی ہے تو اُسے الگ رکھنے کی بجائے "مہابھارت" کا ایک جزو کیوں بنایا گیا؟ اجمل خاں نے زیادہ سے زیادہ جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ کہ :-

"گیتا کے قابلِ احترام مؤلف نے مہابھارت کی جنگ کو بطور نصب العین کے اپنے سامنے رکھا ہے۔ اس لڑائی کو جس میں واقعی ایک انسان نے دوسرے انسان کا گلا کاٹا تھا اور جس میں ہزارہا انسانوں کا خون بہہ گیا تھا، ایسی جنگ کو بطور معیارِ حیات اور آئیڈیل (IDEAL) کے پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ ویاس جی اور اُس کے زمانہ کے فلسفی اس قسم کی جنگ کو اچھا ہی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ چاہتے تھے کہ عوام النّاس اس سے سبق حاصل کریں اور اس نمونہ پر عمل کریں۔"

یہ تسلیم کہ گیتا کے مؤلف یا مصنّف نے "مہابھارت" کو بطور نصب العین کے سامنے رکھا اور "گیتا" تصنیف کی، مگر جب اُس کی مستقل ایک حیثیت تھی تو اسے الگ کیوں نہ رکھا اور "مہابھارت" کا جزو لاینفک کیوں بنایا؟ آخر اور بھی تو مذہبی کتابیں موجود تھیں۔ اُن میں کیوں نہ داخل کیا؟

میں "مہابھارت" کے ذکر میں عرض کر چکا ہوں کہ دراصل ویاس جی نے "مہابھارت" لکھ کر اپنی قوم کے خون کو گرمانے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ عملی دنیا میں قدم رکھیں اور چونکہ اُس کی بنیاد کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ کسی نہ کسی تاریخی محارب فریقین کو سامنے لائیں، اس لئے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انھوں نے کوروؤں اور پانڈوؤں کو منتخب کیا۔

ویاس جی نے یہ تو کیا تھا مگر اس کتاب "مہابھارت" میں ایک بھاری کسر رہ گئی تھی۔ وہ یہ کہ جنگ و پیکار اور قتل و خونریزی انسانی اور اخلاقی حیثیت سے ہر موقع اور ہر جگہ پر عام طور سے بُری چیز سمجھی جاتی ہے۔ تباہی و بربادی کا سب سے بڑا ذریعہ لڑائی ہے جس کو بطیب خاطر کوئی قبول و پسند نہیں کرتا۔ اِلّا یہ کہ مذہباً اُس کا جواز نکلے اور خدائی حکم ہو۔ ویاس جی کی "مہابھارت" میں جنگ کی کوئی مذہبی بُنیاد قائم و موجود نہ تھی اور نہ اس کا حکم اور جوش کسی مذہبی پیشوا کی زبان سے دلایا گیا تھا، اس لئے جنگِ مہابھارت ایک ناخوشگوار چیز ہو کر رہ جاتی تھی۔ عام طور سے لوگ اس جنگ کے بارے میں وہی خیال قائم کرتے ہیں جو ارجن جی کا تھا کہ محض چند روزہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے لئے رشتہ مندوں اور عزیزوں کا خون کیوں بہایا جائے؟ یا کیوں بہایا گیا؟

"مہابھارت" کی تصنیف کے بعد کسی دیدہ ور اور فطرت شناس نے دورانِ مطالعہ اس چیز کو محسوس کیا۔ وہ اِس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ دراصل ہندوؤں کے خون کو ویدوں کی سرد و خشک تعلیمات نے ٹھنڈا کر دیا ہے اور وہ عملی سپاہ و جہاد کی زندگی کو خیرباد کہہ چکے ہیں، لہٰذا اُس نے ضروری سمجھا کہ نہ صرف ویدوں کی برہمانی تعلیمات کو لوگوں کے دماغوں سے دُور کر دیا جائے، بلکہ قوم کو میدانِ عمل میں، مذہبی جوش دلا کے اُتارا جائے۔ مگر یہ جبھی ممکن تھا، جب یہ پیغامِ عمل کسی دینی رہنما اور مذہبی پیشوا کی زبان سے دلوایا جائے تاکہ لوگ ویدوں کی تخفیف اور جنگ کی تحریک پر بھڑک نہ اٹھیں۔ بلکہ اُس کو خدائی حکم اور آسمانی پیغام جان اور سمجھ کر اُس پر عمل کریں۔ پیغام و کلام کی اہمیت و عظمت اُس وقت نَو گنا بڑھ جاتی ہے، جب اُس پیغام و کلام کی پُشت پر کسی عظیم شخصیت کا تقدّس مآب اثر ہو۔ ایک عام انسان کی بات وہ وزن نہیں رکھتی اور نہیں رکھ سکتی جو ایک پیر و ولی اور رِشی و مُنی کی بات رکھتی ہے۔ لوگوں کی نظر میں جب تک کسی چیز کا تعلق آسمان سے نہ قائم ہو وہ معتبر نہیں۔

ہندوؤں کی دنیا میں رام چندر جی اور کرشن جی دو ہی عظیم و مقبول شخصیتیں تھیں۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ان میں شری کرشن جی کا مرتبہ فائق تھا، اس لیے گیتا کے مصنف نے کرشن جی کی مقدس ذات کو منتخب کیا اور اُن کی زبان سے، جنگ و پیکار سے مُجتنب اور قتال و خونریزی سے گُریزاں ارجن کو یہ پیغام دلایا کہ ویدوں کی تھوڑاتی سرد تعلیمات نے لوگوں سے جوشِ عمل اور کارزارِ حیات میں حصّہ گیری کا جذبہ چھین لیا ہے، اس لیے تم اس گورکھ دھندے سے نکل کے فرض کو فرض سمجھو اور عملی کوتاہی کو ایک سنگین جرم جانو۔ آپ گیتا کا مطالعہ فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ اُس میں ویدوں کی تعلیمات سے ارجن کو اپنا دماغ خالی کر کے، جنگ میں حصہ لینے کی سخت تاکید و موثر تعلیم دی گئی ہے۔ اور پھر مؤلف نے "گیتا" کو "مہابھارت" کے رزمیہ انداز سے ہم آہنگ کر کے مناسب موقع پر "مہابھارت" میں شامل کر دیا جس وجہ سے خود "مہابھارت" کا مرتبہ ہزار گونہ بلند ہو گیا ہے۔ اب "مہابھارت" کو پڑھنے والا یہ سوال نہیں کر سکتا ہے کہ پانڈوں نے چند روزہ حکومت کے لیے اتنے آدمیوں کا خون کیوں بہایا؟ اب وہ جانے گا کہ بھگوان کا حکم اور اُس کی مرضی کا مذہب یہی ہے کہ جب "فرض" اور "حق" کا مسئلہ سامنے آ جائے تو جنگ پُن ہے، پاپ نہیں۔ سانپ کاٹنے کو ہو تو اُس کو مار ڈالنا ہی پُن ہے، پاپ نہیں۔ قاتل کو قتل کرنے سے ہی بےگناہوں کی جان بچ سکتی ہے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

گیتا کی تعلیمات

"گیتا" میں شری کرشن جی کی مقدس زبان سے ارجن کو جو کچھ پیغام دیا گیا ہے، اس میں بنیادی چیز فلسفۂ حیات و ممات ہے۔ سمجھا گیا ہے کہ یہ خاکی جسم کوئی اہم چیز نہیں۔ اصل چیز "آتما" یعنی "روح" ہے اور "روح" غیر فانی چیز ہے۔ فرض کی ادائیگی ہی اصل "دھرم" ہے اور فرض کی عدم ادائیگی گناہ اور اس کے پاداش میں ذلت و رسوائی کو دعوت دینا ہے۔

"نجات" اور "مکتی" کے مسئلہ پر بھی کافی بحث کی گئی ہے۔ "نجات" سے مراد مسلمانی یقین کے مطابق آخرت میں بخشائش نہیں، بلکہ ہندو عقیدہ کے مطابق بار بار پیدا ہونے اور مرنے کی مصیبت سے چھٹکارا پانا ہے۔ اس تصوّر کی بنیاد ہندو فلسفہ کے دو اصولوں پر ہے۔ "تناسخ" اور "کرم"۔

"تناسخ" یہ ہے کہ ساری روحیں، خدا کی مصفّٰی و مزکّٰی ذات سے بحکم خدا، خارج ہو کر پھیلی ہیں اور اس وقت تک یہ مختلف قالب بدلتی رہتی ہیں جب تک وہ پہلے کی طرح مصفّا و منزّہ ہو کر اس قابل نہ ہو جائیں کہ وہ ذاتِ خداوندی میں ضم ہو جائیں۔ روحوں کی یہ تبدیلیٔ اجسام، گزشتہ زندگی کے اعمال کی جزا و سزا کے طور پر ہے۔ جس طرح ہر عمل صالح، روح کو اس دنیا سے آزادی کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح ہر ایک بدعملی، روح کو اس دنیا سے اور زیادہ وابستہ کرتی ہے۔ لہذا جب تک عمل درست نہ ہو جائیں گے، یہ چکّر قائم رہے گا۔

قرآن مجید اس تصوّر کی تصدیق نہیں کرتا۔ پنڈت سندر لال نے "گیتا اور قرآن" میں "تناسخ" کے تصوّر کو جن آیاتِ قرآنی سے منسلک کر کے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ان سب میں "دوسری پیدائش" کا جو ذکر ہے وہ اس فانی و خاکی دنیا میں نہیں،

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بلکہ قیامت، یعنی ہمارے نظامِ شمسی کی تباہی کے بعد حشر و نشر اور حساب و کتاب کے وقت کی بعثت ہے۔ اس دنیا میں از روئے قرآن حکیم "زندگی" بھی ایک ہی ہے اور "موت" بھی ایک ہی۔

"گیتا" میں "نجات" کے تین طریقے بتلائے گئے ہیں۔ اولؔ تو بذریعہ عمل (کرم) جس سے مراد خیرات و زکوٰۃ، عبادت و ریاضت، فاقہ و شب بیداری، اکلِ حلال و زیارتِ مقاماتِ مقدسہ وغیرہ ہے۔ دومؔ بذریعہ عرفان (گیان) اس سے مراد یہ ہے کہ نفس و حواس کو زیر اور قابو میں کر لیا جائے اور روحانی علم کے ذریعہ معرفتِ خداوندی حاصل کی جائے۔ اتنی ترقی کی جائے کہ نفسِ انسانی (آتما) روحِ اعظم (پرماتما) یا خدا (برہما) کا قرب حاصل کر لے۔ سومؔ بذریعہ عشقِ حقیقی (بھگتی)۔ عشق کی صراحت یہ کی گئی ہے کہ خدا کا خیال ہر وقت دل میں رہے۔ اُس کی پرستش کی جائے۔ اور اظہارِ عبودیت میں انسان اُس کے سامنے ہمہ وقت جھکا رہے۔ کرشن جی فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہر عمل کے لئے جزا ہے، مگر عمل اس طرح کئے جائیں کہ ثمرۂ عمل کی خواہش نہ ہو۔ یعنی بے لوث عمل کیا جائے۔

"گیتا" میں حرکت و عمل کی تعلیم، سعی و جہد کی تدریس اور کوشش و مصروفیت کی تبلیغ، اس شدت سے کار فرما ہے کہ لامحالہ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اُسی حالت میں ہی ہو سکتی ہے جب معلّم یہ دیکھے کہ قوم و ملک جمود و تعطّل کے مرض میں مبتلا ہے۔ ویدانت کا فلسفہ اس میں شک نہیں کہ کسی زمانہ میں قوم کے لئے مفید رہا ہوگا، اسی لئے ویسی تعلیم دی گئی ہوگی، مگر جس عہد میں گیتا کی تعلیمات قوم کو دی جا رہی تھیں، یقیناً وہ فلسفہ مفید ہونے کی بجائے مُضر بن چکا تھا۔ اسی لئے "گیتا" میں فلسفۂ حرکت و عمل پیش کیا گیا اور اِسے اُس کتاب کا ایک جزو بنا دیا گیا جو یکسر تاریخِ حرکت و عمل تھی۔ سوامی دیانند جی نے صحیح فرمایا ہے کہ:

"آریہ جاتی کے اپنے اندرونی نقائص، محض جنگی فتح سے دُور نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے لئے تو ایک معقول مدبّرانہ علاج کی ضرورت تھی۔ اُس وقت ایسا ڈاکٹر آریہ جاتی کو نصیب نہ ہوا۔ کرشن جی نے اس کی ابتدا کی مگر وہ اپنا کام پورا کئے بغیر ہی اِس جہان سے کوچ کر گئے۔"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اس میں شک نہیں کہ "گیتا" کی تعلیمات کا ہندو قوم پر وہ اثر مترتب نہ ہوا جو اس کے مصنف کے سامنے تھا۔ مگر ہم اس کی وجہ یہ نہیں مانتا کہ کرشن جی ان تعلیمات پر عمل کرائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جبیہ تاریخ اس کی تصدیق ہی نہیں کرتی کہ گیتا واقعی کس کی تصنیف ہے؟ یا کرشن جی کا دور واقعی کون تھا؟ تو ایسا کہنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ "گیتا" کو اس عظیم پشتارہ میں داخل کر دیا گیا تھا جس کا تمام تر پڑھنا پڑھانا ہر ایک کا کام نہ تھا۔ بقول منشی طوطا رام شایاں لکھنوی :-

وہ پشتارہ، دفتر ہے، انبار ہے :: مہینوں میں سیر اُس کی دشوار ہے
ہزاروں میں ہوگا کوئی نیک نام :: پڑھا ہوگا جس نے وہ قصہ تمام
فقط جلتے دل میں ہیں وہ غریب :: "مہابھارت" اک ہے کتابِ عجیب

دوسرے یہ کتاب جس زبان میں تھی وہ مردہ ہو چکی تھی اور پنڈتوں نے اس پر اپنی مونوپلی (MONOPOLY) قائم کر لیا تھا۔ جس تصور یا تعلیم یا تحریک کو مقبولِ انام بنانا ہو اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ اسے ہر دور اور ہر حلقہ کی مروجہ و مقامی زندہ زبانوں میں پیش کیا جائے تاکہ اس کی عام تبلیغ ہو سکے۔ ورنہ ہرگز وہ تعلیم و تحریک نہیں پھیل سکتی۔ قرآن حکیم کی مقبولیت و اشاعت کا یہی راز ہے کہ وہ ہر ملک کی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور لوگوں کو پڑھنے کا موقع ملا اور اس کی عظمت و اہمیت سے لوگ واقف ہوئے۔ چنانچہ سندر لال نے اپنی کتاب "گیتا اور قرآن" میں صفحہ ۱۸۱ پر میجر آرتھر (MAJER ARTHUR GLYN LEO-NARD) کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے :-

"آج دنیا میں تیس کروڑ سے زیادہ آدمی قرآن کے مذہب کے ماننے والے ہیں اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کچھ نہ کچھ لوگ اس کتاب سے اپنی زندگی کے لئے سبق اور دھرم کا راستہ نہ سیکھتے ہوں۔ قرآن کے اس اثر اور تیرہ سو برس کے اس کے نتیجوں کو موٹے طور پر بیان کرتے ہوئے ایک یورپین لیکھک لکھتا ہے :-

"اگر کسی کتاب کی قیمت کا اندازہ اس کے نقد نتیجوں سے لگایا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جاسکتا ہے، یعنی اس بات سے کہ آدمی کے سوبھاؤ کے گہرے سے گہرے اور اچھے سے اچھے پہلوؤں پر اس کا کیا اثر پڑا؟ تو ضروری ہے کہ قرآن کو دنیا کی بڑی سے بڑی اور اونچی سے اونچی کتابوں میں گنا جائے۔" (صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶)

کچھ سال ہوئے یورپ کے ایک مشہور ماہواری رسالہ نے یورپی یونیورسٹیوں کے سیکڑوں بڑے بڑے پروفیسروں اور ودوانوں سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اپنی اپنی رائے میں دنیا کی سنو ویڑی سے بڑی کتابوں کی فہرست نمبروار تیار کرکے رسالے کے ایڈیٹر کے پاس بھیج دیں۔

یورپ کے ودوانوں کے جو سیکڑوں جواب آئے، ان کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی کتابوں میں انھوں نے پہلی جگہ حضرت عیسیٰؑ سے ایک ہزار سال پہلے ہومر کی لکھی ہوئی مشہور یونانی کتاب "الیڈ" کو اور دوسری جگہ اس کے ڈیڑھ ہزار سال بعد کی لکھی ہوئی "قرآن مجید" کو دی۔ اور یہ اس صورت میں جبکہ کل رائے دینے والے یورپین عالموں میں سے بہت ہی کم ہوں گے جنھوں نے قرآن کو اصل عربی زبان میں پڑھا ہو۔"

پنڈت جی کی یہ تحریر نہایت اہم ہے اور اس سے ثابت ہے کہ تعلیمات کی تبلیغ کے لئے تراجم نہایت ضروری ہیں۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مقدس گیتا اور قرآن عظیم

"گیتا" قرآن حمید سے کم از کم آٹھ نو سو سال پرانی کتاب ضرور خیال کی جاتی ہے۔ اور اُس کی تعلیمات کا مقصد تربیّتِ نفس اور احساسِ فرض بتایا جاتا ہے۔ پوری کتاب اسی محور پر گھومتی بھی ہے۔ قرآن حکیم مستقل دستور العمل ہے۔ وہ حیات کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر مسئلے میں، اصولی اور کہیں کہیں فروعی، طور پر بھی، رہنمایانہ تعلیم دیتا ہے۔ تاہم "گیتا" کی بہت سی تعلیمات قرآن مجید کی تعلیمات سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ مثلاً گیتا کے دوسرے مکالمے میں قول ۲۹ و نمبر ۳۰ ہے کہ:۔

"کوئی تو روح کو عجیب شے سمجھتا ہے۔ کوئی اسے عجیب چیز کہتا ہے۔ کوئی سنتا ہے کہ یہ عجیب جنس ہے۔ لیکن ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اسے سمجھ سکے۔ اے بھارت! یہ جسم کی رہنے والی چیز ایسی ہے جو ناقابلِ فنا ہے۔"

اور قرآن عظیم کی سترھویں سورہ کی آیت ۸۵ ہے کہ:۔

"اے محمد! لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ روح کیا چیز ہے؟ تم اُن سے کہہ دو کہ "روح" میرے پروردگار کے حکموں میں سے ایک حکم ہے اور اس کا علم تم سبھوں کو بہت تھوڑا دیا گیا ہے۔"

یا مثلاً گیتا کے پانچویں مکالمے میں قول نمبر ۲۰ ہے کہ:۔

"مستحکم اور غیر مذبذب عقل کے ساتھ ذاتِ ابدی کا عارف، اس ذات میں قائم ہو کر ایسا ہو جاتا ہے کہ نہ تو سرور انگیز چیزوں کے حاصل ہونے پہ خوش ہوتا ہے اور نہ غم افزا حادثات سے وہ افسردہ اور غمگین ہوتا ہے۔"

اور قرآن شریف کی سورہ ستاون ۵۷ کی آیت ۲۳ میں ہے کہ:۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"جو چیز تمہارے پاس سے چلی جائے تم اُس پر غم نہ کرو۔ اور جو چیز تم کو حاصل ہو جائے اُس پر بہت خوش مت ہو۔ اللہ کسی اِترانے والے شیخی باز آدمی کو پسند نہیں کرتا۔"

یا مثلاً گیتا کے نویں ۹ مکالمے میں قول ۲۷ ہے کہ:۔

"اے کُنتی کے بیٹے! تیرے اعمال، تیری خوراک، تیری قربانی، تیری داد دہش، تیرا زہد و تقویٰ، سب میری پرستش کے لیے ہونا چاہیے۔"

اور قرآن حکیم کی چھٹیں سورہ کی آیت ۱۶۲ میں ہے کہ:۔

"اے پیغمبر! کہہ دو کہ حقیقتاً میری نماز، میری عبادتیں، میرا مرنا اور میرا جینا خالص اللہ ہی کے لیے ہے جو مالک و مختار ہے سارے جہان کا۔"

یا مثلاً گیتا کے دسویں مکالمے کے قول ۳ و ۸ میں ہے کہ:۔

"اے پرمیشور! ...... میں آپ کے ہمہ گیر جمال کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں ...... مجھے اپنی غیر فانی صورت کی زیارت کرا دیجیے"۔۔۔ "لیکن تو اِن فانی آنکھوں سے مجھے نہیں دیکھ سکتا۔"

اور قرآن حمید کی ساتویں سورہ کی آیت ۱۴۳ میں ہے کہ:۔

"اے پروردگار! مجھے اپنا دیدار کرا دیجیے تاکہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں۔" "ہم نے کہا کہ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گا۔"

یہاں پر ایک شاعر کا ایک شعر بے ساختہ یاد آ گیا ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے بعد بھی کوئی انسان اپنی آنکھوں سے خدا کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس پر شاعر نے کہا ہے کہ:۔

نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوئے
کیا ملا مجھ کو قیامت میں ندامت کے سوا؟

بہر کیف! گیتا کے دسویں مکالمے کے قول ۱۹ میں ہے کہ:۔

"اے ..... برگزیدہ انسان! میری صفات کی کوئی حد نہیں ہے۔"

اور قرآن پاک کی اکتیسویں ۳۱ سورہ کی آیت ۲۷ میں ہے کہ:۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں اور جتنے سمندر ہیں، ان کے علاوہ ویسے سات سمندر اور بھی ہوں اور وہ دوات اور روشنائی بن جائیں تو بھی اللہ کی باتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔"

یا مثلاً گیتا کے دسویں مکالمے کے قول نمبر ۳۳ میں ہے کہ:۔

"میں غیر محدود زمانہ ہوں اور میں ہی ایسا حافظ ہوں جس کا منہ ہر طرف ہے۔"

اور قرآنِ منیر کی دوسری سورہ کی آیت نمبر ۱۱۵ میں ہے کہ:۔

"پورب اور پچھم سب اللہ ہی کا ہے، سو تم لوگ جدھر بھی منہ کرو اللہ کا بھی منہ اُدھر ہی ہے۔"

یا مثلاً گیتا کے پندرہویں مکالمے کے قول نمبر ۱۶ میں ہے کہ:۔

"اس دنیا میں دو قسم کی قوتیں ہیں۔ ایک فانی۔ دوسری غیر فانی۔ سب چیزیں فانی ہیں۔ البتہ ناقابلِ تبدیل ہستی ہی غیر فانی ہے۔"

اور قرآن پاک کی سورۃ نمبر ۵۵ کی آیت نمبر ۲۵ و ۲۶ میں ہے کہ:۔

"جتنے روئے زمین پر موجود ہیں وہ سب کے سب فانی ہیں اور باقی رہ جانے والی ذات صرف تمہارے پروردگار کی ہے۔"

پنڈت سندر لال نے "گیتا اور قرآن" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے، اس کے سرورق (TITLE PAGE) پر حضرت غوث اللہ شاہ قلندر قادری کا یہ قول درج کیا ہے:۔

"حق یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت کی آواز ساری دنیا میں گونج رہی ہے، گیتا، ہندوستان کا قرآن ہے اور قرآن عرب کی گیتا۔"

یہ کتاب تقریباً پونے تین سو صفحات کی حامل ہے جس کے ابتدائی حصہ میں تقریباً سو صفحے تک اس امر کے ثبوت میں، کہ دنیا کے سارے مذاہب اصلاً ایک ہیں، مروجہ مذاہب کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور گیتا کی بہت سی یکساں تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ مگر زیادہ تر صوفیوں، شاعروں اور بزرگوں کے اقوال سے گیتا کی تعلیم مطابقت رکھتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ یہ ویسی ہی ایک کوشش ہے جیسی "گیتا اور قرآن" کی تصنیف سے گیارہ برس پیشتر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اجمل خاں نے "نغمۂ خداوندی" میں کی تھی۔ انہوں نے گیتا کا اردو نثر میں ترجمہ کرتے ہوئے اشلوکوں کے بالمقابل شعرا، اولیا اور صوفیا کے اقوال یا مشہور عربی و فارسی محاورے پیش کیے تھے۔ پنڈت جی نے اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو صفحوں میں صرف گیتا کی تعلیمات پیش کی ہیں۔ اس کے بعد تقریباً اسّی صفحات میں محض قرآنی آیات کے ترجمے دیے ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہندو، قرآن حکیم کی تعلیمات سے اور مسلمان، گیتا کی تعلیمات سے واقف اور بہرہ ور ہو کر ایک دوسرے کے مذہبی افکار و جذبات کا احترام کریں اور ان سے زندگی میں فائدہ اٹھائیں۔ اور ہر فرقہ دوسرے کی کتابوں کو پڑھ کے اور ان کے عقیدہ و مسلک سے باخبر ہو کر ان کے اعلیٰ احکام پر عمل کرنے کا اپنے میں جذبہ اور شوق پیدا کرے اور اس طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہ قومی یکجہتی پیدا ہو جس کی تلاش و طلب ہے۔

جہاں تک کہ پنڈت جی کی اس کوشش کا تعلق ہے کہ وہ قرآن اور گیتا کو ایک ہی ساز سے نکلا ہوا نغمہ بتائیں، نہایت مبارک ہے۔ کیونکہ بلاشبہ ہندوستان میں بھی پیغمبر آئے ہیں اور سارے پیغمبروں کی اصولی اور بنیادی تعلیمات ہمیشہ یکساں اور ہر جگہ ایک ہی رہی ہیں۔ اسی طرح یہ سعی و کاوش بھی لائقِ پذیرائی و ستائش ہے کہ جب ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں بستی ہیں تو انہیں ایک دوسرے کی دینی و مذہبی کتابوں کی تعلیمات سے واقف و باخبر ہو کر ان سے استفادہ کرنا اور ایک دوسرے کے جذبات و تصورات کا احترام کرنا سیکھنا چاہیے۔ مگر جیسا کہ میں اِسی حصۂ کتاب کی ابتدا میں عرض کر چکا ہوں "مذہب" اور "دین" کے فرق کو نظر انداز کر دینا مناسب نہ ہوگا۔ تاہم پنڈت جی نے دو ایسی مماثلت و مشابہت کا ذکر کیا ہے جو نہایت دلچسپ بھی ہے اور ادبی و تاریخی حیثیت سے لائقِ مطالعہ و تحقیق بھی۔ فرمایا ہے:۔

"ہندوستان میں "گیتا" اور عرب میں "قرآن" کی تعلیم، جن حالتوں میں دی گئی وہ ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ ہندوستان میں مہابھارت کی لڑائی کوروں اور پانڈووں کے بیچ ہوئی تھی جو ایک ہی خاندان کے اور ایک ہی دادا کی اولاد تھے۔ اس لڑائی میں دونوں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

طرف کی فوجوں میں ایک دوسرے کے بھائی، ماما، چچا، سالے، بہنوئی، سسر، دادا وغیرہ موجود تھے۔ اسی طرح قرآن میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جس مشہور جنگ بدر کا ذکر آتا ہے وہ عرب کے ایک ہی بڑے اور مشہور قبیلے کے لوگوں میں ہوئی تھی جسے "قریش" کا قبیلہ کہتے تھے۔

"قریش" اور "کرو" ناموں میں صرف لفظی ایک پن نہیں ہے، بلکہ اتہاسی اور تاریخی ایک پن بھی معلوم ہوتا ہے۔ "کورش" اور "کورو" دونوں نام ایرانی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ایران کے ایک بڑے بادشاہ کا نام "کورش" تھا جسے انگریزی میں بگاڑ کر "سائرس" لکھا جاتا ہے۔ ایرانی اپنی کتابوں میں اسے "کوریش" اور "کرو" دونوں طرح سے لکھتے ہیں۔ عبرانی زبان میں اس کا نام "کوریش" لکھا جاتا ہے۔ کوروں اور پانڈوں، دونوں کے ایک پرکھے (مورث) کا نام بھی "کرو" تھا۔ "کورو" لفظ "کرو" ہی سے بنا ہے۔ یہ ایک تاریخی بات ہے کہ بھارت کے "کرو" اور "کورو" ایران کے "کورش" یا "کرو" اور عرب کے "قریش" تینوں ناموں کی جڑ ایک ہی ہے۔"

پنڈت سندر لال، بلا شبہ مجھ سے زیادہ صاحبِ علم اور وسیع النظر ہیں اس لئے میں اُن کی رہنمائی تو کیا کر سکتا ہوں، لیکن بہ سلسلہ بیان یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک "کوروں" اور "کورش" کا تعلق ہے بالکل ممکن ہے کہ دونوں کی اصل ایک ہو اس لئے کہ تحقیق جدید نے جو رُخ اختیار کیا ہے اُس سے پتہ چل رہا ہے کہ بنی اسرائیل کے دس قبیلے جو وادیِ سینا سے "گمشدہ" قرار دیئے جاتے تھے، وہی کچھ ایران اور کچھ ہندوستان آئے اور وہ وہاں "ایرین" اور یہاں "آریہ" کہلائے۔ لیکن جس حد تک کہ "کوروں" یا "کورش" کے "قریش" کہلانے کا تعلق ہے، پنڈت جی کو بھی ضرور ہی معلوم ہوگا کہ یہاں جتنے بھی الفاظ باہر سے کر مُعرّب ہوئے ہیں وہ سب کے سب نزولِ قرآن اور اسلام کی آمد کے بعد ہوئے ہیں، جبکہ فتوحات کے بعد اُن کے تعلقات دوسرے ملکوں سے قائم

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہوتے گئے اور حکومتی اعتبار سے یا علمی حیثیت سے اُن کی ضرورت پڑتی گئی۔ ورنہ زمانۂ جاہلیت میں جبکہ اُن کا علم اور اُن کی ضرورتیں محدود تھیں وہ وحشت و بدویت کے سبب ساری دنیا سے کٹے ہوئے تھے۔ اور ایران سے تو حجاز کا کبھی کوئی تعلق ہی نہیں ہوا چہ جائیکہ مکّہ کا۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ مکّہ والوں نے "قریش" کا لفظ ایران سے لیا ہو؟ اور "قریش"، وہ قبیلہ ہے جو عہد اسمٰعیلؑ سے مکّہ میں اسی نام و لقب سے موجود و معروف تھا۔

جس ایرانی بادشاہ سائرس کا نام پنڈت جی نے لیا ہے اور جس کو "کورش" بتایا ہے وہ پارسیوں کے یہاں "گورو" اور "گورش"، کہا جاتا تھا۔ چنانچہ دارا کے "کتبۂ بے ستون" میں اُس کا یہی نام کندہ ہے۔ "گورو"، اور "کورش"، نہیں۔ اور سائرس دارا کا حقیقی دادا تھا اس لئے اُس کا نوشتہ اور بیان مستند (AUTHORITY) تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہودیوں کے یہاں اسے "خورش" کہتے تھے چنانچہ "توریت" کی کتابوں یسعیاہ، ارمیا اور دانیال میں یہی نام درج چلا آتا ہے۔ پنڈت جی نے فرمایا ہے کہ اِس بادشاہ کے نام کو انگریزی میں بگاڑ کر "سائرس" کر دیا گیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ "سائرس (CYRUS)" اُس بادشاہ کا یونانی نام ہے۔ اہلِ عرب اس بادشاہ کو قبل از اسلام "کے خسرو" کہتے تھے "کورش"، نہیں۔ قرآن مجید نے جب اس کو "ذوالقرنین" کے نام سے یاد کیا تو عربوں کے یہاں اسے "ذوالقرنین" کہا جانے لگا۔ یعنی "دو سینگوں والا"۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ ایران کی حکومت عہد قدیم میں دو حصّوں میڈیا اور پارس میں بٹی ہوئی تھی۔ سائرس نے اِن دونوں مملکتوں کو ایک کر کے ایک عظیم شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور اپنا تاج اس طرح کا بنوایا تھا جس میں دو سینگیں اوپر نکلی ہوئی تھیں۔ اور یہ دونوں مملکتوں کے ایک ہو کر سائرس کے زیرِ اقتدار آجانے کی محسوس مظہر اور اُن کی نمائندگی کرتی تھیں۔ بہر کیف! عربوں میں "سائرس"، کو کبھی "کورش"، کے نام سے موسوم اور یاد نہیں کیا گیا۔ سائرس کا بیٹا کیم بے سیز (CAMBYSES) ہوا۔ یہ بھی یونانی نام ہے۔ پارسیوں کے یہاں یہ "کیموچہ" کہلاتا تھا اور اہلِ عرب اسے "کیقباد" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بعد میں پارسیوں نے بھی اسے اسی نام سے یاد کرنا شروع

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کر دیا چنانچہ فردوسی کے شاہنامہ میں اس کو "کیقباد" ہی کہا گیا ہے۔ "کیقباد" کا بیٹا وہ ہوا جو ہر جگہ "دارا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کا مقابلہ سکندر اعظم سے ہوا تھا۔ بہر کیف! "کورش" سے عربوں کے "قریش" کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

"قریش" کا لقب، عہد قدیم میں عربوں کے بزرگ "فہر" نے اختیار کیا تھا۔ "قریش" عربوں کے یہاں "دھیل مچھلی" کو کہتے ہیں جو عظیم وجسیم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت قوی بلکہ قوی ترین آبی جانور ہے۔ فہر اپنے قبیلہ کی عظمت و قوت، کو دیگر عرب قبائل پر ظاہر کرنا چاہتا تھا، اور عربوں کے یہاں جانوروں کے نام پر یا اُن کی نسبت سے لقب اختیار کرنا بہت عام تھا، لہٰذا اُس کا قبیلہ اسی لقب سے مشہور ہوا۔

پارس یا ایران میں اس بادشاہ کو "کورش" کیوں کہا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حام کا ایک لڑکا "کوش" تھا۔ اس کی اولاد خلیج فارس کے کنارے پر آباد ہوئی تھی لہٰذا اس نے بادنیٰ تغیّر اسی نسبت سے اس لقب کو اختیار کیا تھا۔ "کورش" اور "کوروں" کی بنیاد ایک قرار دینے سے مہابھارت کا عہد چھٹی صدی قبل مسیحؑ ماننا ہوگا، کیونکہ "کورش" یا "سائرس" کا ظہور ۵۵۹ء قبل مسیحؑ میں ہوا تھا اور وہ ۵۲۹ء قبل مسیحؑ میں مر گیا تھا۔ اور اس سے پہلے پارس میں کوئی "کورش" نہیں ہوا۔ مگر ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ مہابھارت کا دور، عہد مسیحؑ سے کئی ہزار برس پہلے کا ہے۔

پنڈت سندر لال نے جو دوسری خوبصورت مماثلت و یکسانیت دکھائی ہے وہ بلاشبہ دلچسپ بھی ہے اور لاکلام بھی۔ انھوں نے لکھا ہے:-

"جس طرح کوروں نے، پانڈوں پر طرح طرح کے ظلم کئے اور انہیں دُکھ پہنچائے اُن کی جائداد چھین لی، انہیں اُن کے گھروں اور ملک سے نکال دیا، اُن کے رہنے کے مکان میں آگ لگا دینے اور انہیں زہر دے دینے تک کی کوششیں کیں۔ اسی طرح مکّہ کے قریش نے قریب قریب یہی سب باتیں محمد صاحبؐ اور اُن کے، اُن رشتہ داروں اور ساتھیوں کے ساتھ کی تھیں، جنہوں نے محمد صاحب کے کہنے پر اپنے پرانے مذہب

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کو چھوڑ کر اسلام دھرم کو اپنا لیا تھا۔ یعنی ایک اللہ کے سوا اور سب دیوی دیوتاؤں یا کعبہ کے پُرانے بتوں کی پوجا بند کر دیا تھا۔ مکہ میں کعبہ ہزاروں برس کا ایک پرانا مندر تھا۔ قریش اُس کے مجاور یا پنڈے تھے۔

تیرہ سال تک مکہ کے قریش نے، محمد صاحب کے رشتہ داروں اور ساتھیوں پر اتنے ظلم کیے کہ اُن کا مکہ میں رہنا دوبھر ہو گیا۔ آخر میں محمد صاحب کو خود بھی مکہ چھوڑ کر مدینہ چلا جانا پڑا۔ جو مسلمان پہلے سے مکہ چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے، وہ سب بھی اب مدینہ میں آ گئے۔ اور مدینہ کے بہت سے لوگوں نے ایک طرف محمد صاحب کے اُن تھوڑے سے ساتھیوں اور پریمیوں کو، جو مکہ میں باقی رہ گئے تھے، اور زیادہ ستانا شروع کیا اور دوسری طرف ایک بہت بڑی فوج لے کر محمد صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو مٹا دینے کے لیے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔

اُس وقت تک اسلام میں دشمن کے خلاف بھی ہتھیار اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ اِن تیرہ برسوں کے اندر جتنی آیتیں قرآن میں اِس بارے میں ہیں، سب میں دوسروں کے ظلموں کو صبر کے ساتھ برداشت کر لینے اور بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دینے ہی کا حکم دیا گیا ہے (حم ۳۴-۳۶ المومنون ۹۶) اب جب قریش کی طرف سے مدینے پر چڑھائی ہوئی تو قرآن میں پہلی بار، ان لفظوں میں مسلمانوں کو تلوار اُٹھانے کی اجازت دی گئی:-

"جن لوگوں پر جنگ کے لیے چڑھائی کی جا رہی ہے، انھیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ اُن پر یہ ظلم ہے۔ اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اللہ اُن کی مدد کے لیے کافی ہے۔ یہ اجازت اُن لوگوں کو ہے جنھیں انصاف کے خلاف، اُن کے گھروں سے نکال دیا گیا ہے، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک اللہ ہی ہمارا رب ہے" (حج ۳۹-۴۰)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کوروں کو گیتا میں دھرم سے گرے ہوئے اور "آتتائی" کہا گیا ہے (۱-۳۶)
منوسمرتی اور دوسری کتابوں میں "آتتائی" ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو آگ لگا دینا،
زہر دے دینا، مار ڈالنا اور لوٹ لینا یا اسی طرح کے اور ظلم دوسروں پر کرتے
ہیں اور ایسے لوگوں کے لئے موت کی سزا بتائی گئی ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات دیکھنے کے قابل ہے، جس وقت مکّہ
کی فوج اور مدینہ کی فوج، دونوں ایک دوسرے کے بھائی، چچا، تایا،
ماما، سسر اور پاس کے اور دور کے رشتے دار ایک دوسرے سے لڑنے
کے لئے تیّار دکھائی دیئے۔

جس طرح گیتا میں ارجن کا دل، اپنے رشتہ داروں کو لڑنے کے
لئے سامنے تیّار کھڑا دیکھ کر کانپنے لگا تھا اور اس نے ایک بار لڑنے سے
انکار کر دیا تھا، اُسی طرح قرآن میں لڑائی کی اجازت آ جانے کے بعد بھی،
بہت سے مسلمان، لڑائی سے بچنا چاہتے تھے۔ جس طرح گیتا میں شری کرشن جی
نے ارجن کو طرح طرح سے سمجھایا کہ "اپنے دل کی اس کمزوری کو چھوڑ کر کھڑا
ہو جا اور یہ کمزوری تجھے شوبھا نہیں دیتی (۲-۳) اُسی طرح قرآن
میں مسلمانوں کی اس کمزوری اور ہچکچاہٹ کو دیکھ کر حکم آیا کہ:۔

"تمہیں جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے اور تمہیں یہ اچھا
نہیں لگتا۔ ممکن ہے جو چیز تمہیں اچھی نہیں لگتی ہے وہ تمہارے
بھلے کی ہو۔ اور جو چیز تمہیں اچھی لگتی ہے وہ تمہارے لئے
بُری ہو" (بقرہ ۲۱۶)

"اور کیا بات ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن کمزور لوگوں، عورتوں
اور بچّوں کی حفاظت کے لئے نہیں لڑتے، جو یہ کہہ رہے ہیں
کہ "اے ہمارے رب! ہمیں اِس شہر سے نکال، جس کے لوگ
ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ ہمیں کوئی بچانے والا اور مدد کرنے والا

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پہنچ گے (نساء ۷۵-۷۶)

جس طرح شری کرشن نے ارجن کو یہ کہہ کر سمجھایا تھا کہ اگر تو لڑائی میں مارا جائے گا تو سورگ (بہشت) میں جائے گا اور اگر جیتے گا تو دھرتی پر راج کرے گا (۲-۳۷) اسی طرح قرآن مجید میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ :-

"جو کوئی اللہ کی راہ میں لڑتا ہے وہ چاہے مارا جائے اور چاہے جیتے اللہ سے اسے بہت بڑا پھل ملے گا۔" (نساء ۷۴)

پنڈت سندر لال جی کی یہ سطریں — ہندوؤں کے لئے انتہائی سبق آموز اور بصیرت افروز ہیں جو قرآن حمید کے لفظ "جہاد" کو غلط معنی پہنا کر اسلام کو "خونریز دین" ظاہر کیا کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے لئے یہ سطریں اس لحاظ سے درسِ عبرت ہیں کہ ایک ہندو، قرآن مجید کی کیسی سچی دانست اور جنچی تلی رائے رکھتا ہے۔

پنڈت سندر لال نے "گیتا" اور ہندوؤں کی دوسری تمام مشہور و مقدس کتابوں یعنی ویدوں اور اپنشدوں وغیرہ کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے "گیتا" کے بارے میں لکھا ہے :-

"گیتا" ماہاتمیہ میں سب اُپنشدوں کو ملا کر اُن کی برابری ایک گائے کے ساتھ کی گئی ہے۔ اور گیتا کو اُسی گائے سے "دُوہا ہوا دودھ" اور "مہا امرت" کہا گیا ہے۔ مثال بہت درجے تک ٹھیک ہے۔ اسی ماہاتمیہ میں لکھا ہے کہ جس آدمی نے گیتا کو اچھی طرح یاد کر لیا اُسے پھر دوسرے شاستروں کے جمع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سچ مچ گیتا اپنے زمانے کے تمام ہندو شاستروں کا نچوڑ ہے سنسکرت کتابوں میں جتنا گیتا کا پرچار ہے اتنا کسی دوسری کتاب کا نہیں ہے۔"

حقیقتاً "گیتا"، ویدوں اور اپنشدوں کا نچوڑ ہو یا نہ ہو مگر چونکہ وہ ایک تو بہ مقابلہ دوسری کتابوں کے مختصر ہے، دوسرے اُس کی زبان آسان کر دی گئی ہے، تیسرے ہر زبان میں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ترجمہ ہو ہو کر اس کی تبلیغ کافی ہوئی ہے، اسلئے وہ عوام کی دسترس کے اندر ہے اور جتنا کچھ اُس میں ہے وہ انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے کافی سے زیادہ ہے، بشرطیکہ اُس کی تعلیمات کو صرف لفظاً پڑھا نہ جائے بلکہ عملاً اُسے حرزِ جان بنایا جائے اور اُن تعلیمات کو عملی زندگی میں داخل کیا جائے۔ چنانچہ خود پنڈت سندر لال نے اسی کتاب میں ایک سوال بھی کیا ہے جو نہایت ضروری ہے۔ اور پھر خود ہی اُس کا جواب بھی دیا ہے جو بیحد اہم ہے۔ وہ قرآن عظیم اور گیتا کا ذکر کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ:-

"ان مذہبی کتابوں میں اسی طرح کی تعلیم بھری پڑی ہے۔ پھر بھی انسانی دنیا اپنی منزل سے ابھی دور دکھائی دیتی ہے؟ اس کا سبب کیا ہے؟

پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ:-

"اس کے دو ہی سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کچھ لوگ اس سچائی کو سمجھ نہیں پاتے یا سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ سمجھتے ہیں وہ اس پر عمل نہیں کرتے یا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ منزل پر پہنچنے میں دیر لگنے کی ذمہ داری پوری کی پوری اُن لوگوں پر ہے جو سمجھتے ہیں اور پھر بھی اُس پر عمل نہیں کرتے۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں انقلاب برپا کرنے والی، دنیا کو بدلنے والی یا اُس کو سدھارنے والی، سب سے بڑی طاقت "عمل" ہے۔ ہماری باتوں ہمارے اُپدیشوں اور ہماری لفظی بحثوں سے، ہمارے کاموں کا دوسروں پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ گیتا اور قرآن اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھنے سے ہماری غرض لوگوں کو صرف ایک طرح کا دماغی بھوجن کرانا نہیں ہے۔

بلکہ

ہماری غرض یہ ہے کہ اس سے ہم میں "عمل" کرنے کی طاقت پیدا ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ دونوں پاک کتابیں عمل کی نگاہ سے پڑھی جائیں۔ ہم جانتے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیں کہ اِن کے پڑھنے سے ایشور اور خدا، ہم میں وہ طاقت پیدا کرے کہ ہم اپنے الگ الگ مذہب، اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے گاؤں اور اپنے خاندان کے اُن الگ الگ اور خود غرض بھرے شکنجوں کو چکنا چور کر دیں، جو ہمیں ایک دوسرے سے توڑ توڑ کر الگ کئے ہوئے ہیں۔ اور ایک کو دوسرے سے لڑاتے ہیں۔ ہمارا صرف اتنا محسوس کر لینا یا سمجھ جانا ہرگز کافی نہیں ہے کہ "ہم سب ایک ہیں" بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی نجی اور سماجی دونوں طرح کی زندگی میں سے وہ سب باتیں مٹا دیں جو ہمیں آدمی آدمی میں فرق کرنے پر مجبور کرتی ہیں، چاہے وہ باتیں ریت رواج کی صورت میں ہوں اور چاہے قانونی و مذہبی پابندیاں اور بندھنوں کی شکل میں ہوں۔

ہم ایشور سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ

گیتا اور قرآن اپنے پڑھنے والوں میں وہ صاف سمجھ، وہ ہمت اور طاقت پیدا کرے جس سے وہ اِن پاک کتابوں کی سچی تعلیمات پر عمل کر سکیں"

پنڈت جی کی اس دعا پر میں بھی "آمین" کہتا ہوں۔

میں ایک مرتبہ آریہ سماجیوں کے ایک جلسہ میں شریک ہوا تھا تو ایک مقرر کا یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا تھا کہ:۔

"نقد" مذہب نہ مسلمانوں کے پاس ہے اور نہ ہندوؤں کے۔ جو کچھ ہے وہ "اُدھار" ہے۔ اُن کا مذہب قرآن اور گیتا میں ہے، اُن کی زندگی اور عمل میں کچھ نہیں ہے"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

گیتا کے منظوم ترجمے

"گیتا" کے اردو زبان میں منظوم ترجمے مختلف اصنافِ سخن میں ہوئے ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے کئے ہیں۔ مگر میری یہ کتاب صرف "مثنوی" اور "ہندو شعرا" کی حد تک محصور ہے، اس لئے میرا بیان "گیتا" کے صرف اُن ہی ترجموں کے ذکر تک محدود ہے، جو ہندوؤں نے "مثنوی" کی شکل میں کئے ہیں۔

۱۲۷۵ھ میں سب سے پہلے منشی جگنناتھ لال خوشتر لکھنوی نے "گیتا" کا ترجمہ "مثنوی" کی صورت میں کیا جس کا مادۂ تاریخ ہے: ع

بنی یہ بھاگوت بے مثل آفاق

یہ مثنوی سلاست و نفاست اور صفائی و شگفتگی کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ ابتدا حمد سے یوں ہوئی ہے: ؎

گل افشاں حمدِ باری میں قلم ہے ؛ بیاضِ نامہ گلزارِ اِرم ہے

بہارِ نامہ شکرِ فیضِ حق ہے ؛ برنگِ لالہ رنگیں ہر ورق ہے

شاید یہ دونوں شعر خوشتر کو کسی سبب سے بہت پسند یا اُن کے خیال میں نہایت مبارک تھے، کیونکہ "رامائن" کی ابتدا بھی انھوں نے انہیں دونوں شعروں سے کی ہے۔ اِن دونوں شعروں کے بعد پھر جو حمد کے اشعار ہیں وہ دونوں جگہ مختلف ہیں۔ یہاں فرمایا گیا ہے: ؎

بیانِ شکر میں تر ہے نئے خشک ؛ سوادِ صفحہ میں ہے نکہتِ مشک

شکر کا، شکرِ یزداں میں، اثر ہے ؛ "نے" خامہ برلئے "نیشکر" ہے

یہی بہتر ہے اب خوشتر کہ دن رات ؛ پڑھوں بہرِ شفاعت اب مناجات

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"خداوندا تو ہی ہے بندہ پرور ؛ تو ہی ہے بیکسوں پر سایہ گستر"

"تو ہی ہے چارہ پرداز غریباں ؛ تو ہی ہے کارسازِ بے نصیباں"

جس دور میں گیتا کا یہ ترجمہ لکھا گیا تھا، وہ بہادر شاہ کا نہیں، بلکہ ملکہ وکٹوریہ کا عہد تھا مسلمانوں کا نہیں انگریزوں کا زمانہ تھا۔ بلکہ ایسا نازک دور تھا جو اکبر الہ آبادی کے اِس شعر کے مصداق تھا :-

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ ہندو نام لیتا ہے خدا کا، اِس زمانے میں

مگر اس کے باوجود گیتا "اردو" میں منتقل کی جا رہی تھی اور اُس کی ابتدا "خدا" کے نام سے کی جا رہی تھی۔ آج "اردو" مسلمانوں کی زبان بتائی جاتی ہے حالانکہ اسے ہندوؤں نے اپنے خون سے سینچ سینچ کر پروان چڑھایا تھا۔ خوشتر ہندو تھے ۱۸۵۷ء کا زخم انگریزوں کے جسم پر مندمل نہیں ہوا تھا۔ مسلمان اور اُن کی ہر چیز انگریزوں کو اپنی دشمن نظر آتی تھی۔ بہادر شاہ قید ہو کر رنگون بھیجے جا چکے مگر ایک ہندو حسین اردو میں نفاست سے خدا کو یاد کر رہا تھا۔ بہر کیف! گلزارِ جناں کا نقشہ ملاحظہ ہو :-

معطر پیرہن پہنے تھا ہر گل ؛ کہ جس کی بُو سے سودائی تھی بلبل
ہجومِ قطرۂ شبنم گلوں پہ ؛ مرصع جیسے دُر سے ساغرِ زر

جوشؔ ملیح آبادی کا یہ شعر نہایت پسندیدہ اور مشہور ہے :-

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے، کوئی پری مسکرا رہی ہے

مگر محاکاتی اعتبار سے خوشتر کے اِس شعر کو نہیں پہنچتا۔ گلزارِ جناں کی تصویر کے دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں :-

گلِ صد برگ پر خنداں چمن تھا ؛ کہے تو زعفرانی پیرہن تھا
گلوں پر یوں جھکی تھی شاخِ سنبل ؛ رُخِ محبوب پر جس طرح کاکُل
شقائق تھا گلِ سوسن سے باہم ؛ چمن تھا تختۂ یاقوت و نیلم

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

گُل شبّو کی بُو چاروں طرف تھی ÷ بھپکے تُو عطر پاشی صف بصف تھی
سرودِ عندلیب و رقصِ طاؤس ÷ طبیعت کو ہوا دل خواہ مانوس
میانِ سبزہ کیمکِ کہساری ÷ خراماں صورتِ ابرِ بہاری

کنبک کی خرامانی کو، ابرِ بہاری کی خرامانی سے تشبیہہ دینا اختراعِ فائقہ ہے۔ اس شری گھنشیام، محبوبِ دو عالم ÷ بہ رسنِ دلفریب و زلفِ پُرخم
نظر آتا تھا یوں با روئے انور ÷ قمر ہو جس طرح ہالے کے اندر
بجاتا تھا عجب انداز سے نے ÷ کہ تھا سرود چمن پر عالم مے

محض دو لفظ "عالم مے" کہہ کے ایک طویل مفہوم کو، کہ بانسری کی آواز سے درخت اور پودے اس طرح جھوم رہے تھے گویا شراب پی کر ڈگمگ رہے ہیں، ادا کرنا قابلِ داد ہے۔ اس سلسلہ کا یہ شعر بھی بہت خوب ہے :ـ

کھڑے تھے نخل، محوِ نغمۂ بیہوشی ÷ ہر اک برگِ شجر تھا صورتِ گوش

آگے ہے کہ :ـ

سماں تھا بانسری کا یہ وہاں پر ÷ کہ زہرہ ناچتی تھی آسماں پر
ہر اک گوپی تھی محوِ چشمِ موہن ÷ فدا ہو جس طرح نرگس پہ سوسن
خیالِ خانہ و بے خوفِ شوہر ÷ سراپا غرقِ آب دیدۂ تر

کرشن جی کے جوانی میں گوپیوں کے جھرمٹ میں گھرے رہنے اور بانسری بجا بجا کے کنواری اور شوہردار حسین و نوجوان عورتوں کو لبھائے رکھنے کی داستان کو میں سرتاپا غلط، بہتان اور بدتمیزی سمجھتا ہوں جیسا کہ میں تفصیل سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ہندو اور یہودی عقیدہ میں کسی پیغمبر کا ایسا کردار اُس کی عصمت و عظمت کے خلاف چاہے نہ ہو، مگر از روئے قرآن مجید مسلمانوں کے نزدیک ہر پیغمبر معصوم ہوتا ہے۔ میرا اِس گندی روایت کو غلط قرار دینا بربنائے "عقیدہ" بھی ہے اور بلحاظ "تاریخ" بھی۔

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں گیتا کو اردو میں مثنوی کا جامہ پہنانے والے دوسرے شاعر

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

منشی لچھمن پرشاد صدرؔ لکھنوی ہیں۔ اس مثنوی کا نام "خورشیدِ معرفت" ہے۔ مادہ تاریخ ہے :۔

پَتو خورشید با معرفت شد مضاف

عیاں اِسم و تاریخ شُد صاف صاف

صدرؔ کا ترجمہ رواں اور سلیس ہے :۔

شری کرشن جی پا کے بے دل اُسے ؛ یہ بولے کہ اے یار صادق مرے !

جہاں میں ہے تیری شجاعت عیاں ؛ ترے نام سے کانپتا ہے جہاں

وہ کرتا ہے تُو گفتگو بار بار ؛ نہیں جو سزاوارِ مردانِ کار

یقیں کر کہ جرأت سے جنّت ملے ؛ مگر بُزدلی سے مذلّت ملے

دلیرانہ میداں میں ہو تیز گام ؛ دکھا جوہرِ خنجرِ بے نیام

صدرؔ نے کرشن جی کی اِس تعلیم پر کافی زور دیا ہے کہ ضرورت کے وقت جنگ سے فرار اور لڑائی سے احتراز، احترامِ انسان نہیں بلکہ اظہارِ بُزدلی ہے۔ زندگی نام ہے حرکت و جہد کا۔ اور جو لوگ زندگی کی الجھنوں اور حیات کی ذمہ داریوں سے نپٹنا نہیں چاہتے، وہی احترامِ انسانیت وغیرہ کا عذرِ لنگ (LAME EXCUSE) پیش کیا کرتے ہیں۔ جو موت سے ڈرتے ہیں اور زندہ رہ کر اُس کی ذمے داریوں سے زیادہ سے زیادہ متکیّف ہونا چاہتے ہیں، وہی یہ فلسفہ بگھارا کرتے ہیں کہ کسی حالت میں بھی انسان کا خون بہانا غلط ہے۔ کرشن جی ارجن کو سمجھاتے ہیں :۔

عبث رنج کرتا ہے تُو دمبدم ؛ کہ بے فائدہ ہے یہ سب رنج و غم

کر ایشور کی طاعت کر ایشور کا دھیان ؛ کہ بے اُس کے یابے گی تکلیف، جان

غم اُس کا نہ کر جو نہ دے فائدہ ؛ مری بات کو غور سے سُن ذرا

یہ سامانِ دہر اور مادہ تمہارا ؛ رہیں گے قیامت تلک رونما

میں رہتا ہوں دائم، میانِ جہاں ؛ مگر کرکے تبدیلِ نام و نشاں

بدلتا ہے تن، جاں بدلتی نہیں ؛ خلش تن پہ ہے، جاں پہ چلتی نہیں

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے تکلیفِ عالم بدن پر تمام ÷ نہیں جان کو کچھ اذیت سے کام
سدا وقت پر اپنے آتی ہے موت ÷ کسی کو نہیں چھوڑ جاتی ہے موت

درسِ عمل یوں دیتے ہیں: ؎

عمل سے ہوا آشکارا جہاں ÷ عمل سے ہے دوزخ، عمل سے جناں

سر اقبال کا مشہور شعر ہے: ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی ÷ یہ بندہ اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

کرشن جی کہتے ہیں: ؎

عمل ہی بناتا ہے اہلِ کمال ÷ عمل ہی مٹاتا ہے سارے وبال
خدا کے لئے ہے جو محوِ عمل ÷ تو قرب اُس کا پاتا ہے وہ بے خلل

۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء میں گیتا کا ترجمہ مثنوی کی شکل میں منشی میوہ لال عاجز عظیم آبادی نے کیا ہے۔ مادّہ تاریخ یہ ہے: ؎

اچھا ہوا ہے بھگوت گیتا کا ترجمہ

لائق ناظم کا انکسار ہے کہ جب میرے صوفی منشی دولت گنج ہزاری لال نے گیتا کا "متصوفانہ ادب" پیش کر کے یہ کہا کہ: ؎

جو ہو نظم یہ نسخۂ لاجواب ÷ زبانِ مروّج میں باآب و تاب
جہاں میں رہے آپ کی یادگار ÷ کہ جب تک ہے یہ گنبدِ زرنگار

تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ: ؎

نہ شاعر ہوں میں اور نہ عالم ہوں میں ÷ نہ کاتب ہوں میں اور نہ ناظم ہوں میں
فنِ شعر گوئی ہے دشوار تر ÷ نہیں مجھ کو اس رمز سے کچھ خبر

مگر مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاضل مترجم نے بڑی قابلیت سے ترجمہ کیا ہے۔ اور چونکہ شاعر کے دماغ میں محض ایک ہی تصوّر اور ایک وجدان میں صرف ایک ہی جوش کارفرما تھا اس لئے گیتا کا صرف وہ حصہ ترجمہ کیا ہے، جس میں کرشن جی نے ارجن کو "عرفانِ الٰہی" کے

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

رموز اور اس سلسلے میں فرمانِ الٰہی کے اسرار منکشف کیے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ گیان دھیان کیا چیز ہے؟ معرفت کسے کہتے ہیں؟ اور جسم و روح کا کیا تعلق ہے؟ مثنوی حمد سے یوں شروع ہوتی ہے:ـــ

سوا تیرے اے ذاتِ برتر صفات ✣ نہیں ہی ہوں کچھ اور نہ ہے کائنات
ازل سے خداوند یکتا ہے تو ✣ دوئی کی نہیں تجھ میں مطلق ہے بو
تری ذات کو آمد و شد نہیں ✣ نہ آتا کہیں ہے، نہ جاتا کہیں
یہ عالم جو ظاہر ہے با آب و تاب ✣ ہے مثلِ سراب اور مانندِ خواب
یہ عاجز کے دل کا ہے وہم و گمان ✣ نظر میں ہے جلوہ گر یہ جہاں

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ عاجز تصوف کے کس اسکول کے متبع تھے۔ کرشن جی بے لوث عمل کا سبق دیتے ہیں۔ اور فلسفۂ موت و حیات سمجھاتے ہیں:ـــ

جو مارے اگر اس میں تم جاؤ گے ✣ تو خلدِ بریں کا مزہ پاؤ گے
ظفر یاب ہوگے اگر جنگ میں ✣ تو ہاتھ آئیں گی ملک کی نعمتیں
اگر یافت و نا یافت، فتح و شکست ✣ خوشی اور غمی اور بالا و پست
مساوی سمجھ کر کے بے اشتباہ ✣ لڑوگے تو ہرگز نہیں ہے گناہ
یہ جسم و حواس اور اُن کے صفات ✣ ہیں فانی مگر روح کو ہے ثبات
یہ اجسام کو ہے بلا شک زوال ✣ مگر روح کو کہتے ہیں لایزال
وہ ہے لا فنا اور فنا سے ہے پاک ✣ نہیں کوئی کر سکتا اُس کو ہلاک
جو فانی ہے اُس کو نہیں ہے بقا ✣ جو باقی ہے اس کو نہیں ہے فنا

عاجز کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا، حالانکہ وہ اردو زبان کے خاصے شاعر تھے۔ اور انھوں نے یہ محنت اس لئے کی تھی کہ بقولِ گنج ہزاری لال، ان کا نام زندہ رہے گا۔ نہ جانے ایسے کتنے باکمال اب تک گمنامی و کس مپرسی میں پڑے ہیں۔

۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء میں گیتا کا ترجمہ بہ صورتِ مثنوی منشی دیوکی نندلال مبتدی عظیم آبادی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نے کیا ہے ۔ اس ترجمہ کا مرتبہ کیا ہے، اس کے بارے میں خود شاعر کا کہنا ہے کہ :ـ

ہو عبارت عام فہم و لفظ بھی ہوں سلیس :: فیض پاویں اس سے کیا ہندو بی خبیث و از تمیس
مگر مثنوی جاندار نہیں ہے ۔ بحر بھی نغمہ ریز نہیں اختیار کی گئی ۔ مصنف کو اس کا اعتراف و علم
ہے کہ :ـ

ترجمے بھی لاتعد کیسے گئے ہیں کہہ وہ

لیکن اس کے باوجود، انھوں نے یہ خدمت اس لئے انجام دی کہ :ـ

ایک پنتھ دو کاج ہوگا جب تلک ہوگا ختم
گر ہوا انجام، پائے گا وہ درجہ محتشم
غور سے دیکھا تو بے شغلی سے اچھا شغل ہے
کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہنا بس مناسب عقل ہے

ظاہر ہے کہ جب یہ مثنوی دلی جوش اور شاعرانہ ذوق کی بنا پر نہیں لکھی گئی، نہ ثواب و خدمتِ زبان و ادب کے لئے، بلکہ صرف بیکاری اور محض بے شغلی دور کرنے کے لئے لکھی گئی تو اس میں ولولہ و حسن کہاں سے پیدا ہو سکتا تھا ۔ نمونہ یہ ہے :ـ

واہ ری قدرت تری، ہر خوشہ خرمن ز خلق
ہے سبق دیتا یہ نافہمی مجھے دیتی ہے قلق
ایک سے اکیس، پھر اکیس سے ہوتا ہے ایک
تخم لاثانی سے وہ بھی ایک ہوتا ہے دیک
وحدہٗ لاشریک، جس کی شان میں الفاظ ہیں
جانتے ہیں وید و عارف اور جو مرتاض ہیں

۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۵ء میں منشی پربھودیال مصر عاشق میرٹھی نے گیتا کو اردو مثنوی کا جامہ پہنایا ۔ اس مثنوی کا تاریخی نام "غذائے روح" ہے ۔ کہیں کہیں قطعے بھی ہوگئے ہیں ۔ یہ مثنوی شائع ہوگئی ہے ۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے نمونے کے صرف یہ دو شعر ملے ہیں :ـ

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

"کرم" کو اچھا بتلاتے ہو، کبھی "سنیاس" کو

کون ان دونوں میں افضل ہے، مفصّل یہ کہو؟

راستے دونوں ہیں بہتر، موکش پا جاتے ہیں لوگ

لیکن افضل وہ ہیں "سنیاس" سے ہے "کرم یوگ"

۱۳۴۶ھ/۱۹۲۶ء میں منشی بجرنگ سہائے صنوبر عظیم آبادی نے گیتا کو اردو مثنوی کا خوبصورت ہار پہنایا۔ یہ مثنوی بیجا نہیں ہے۔ اس میں سلاست بھی ہے اور روانی بھی۔ لسانی محاسن بھی ہیں اور تاریخی رعایتیں بھی۔ اعتقادی جوش بھی ہے اور وجدانی شوق بھی۔ تمہید میں فرمایا ہے: ؎

میں تنہا ایک دن بیٹھا ہوا تھا ؛ شری گیتا کی پوتھی پڑھ رہا تھا

اسی حالت میں دل نے کی ہدایت ؛ کہ کر منظوم گیتا کی روایت

کیا ہے ترجمہ لوگوں نے صد ہا ؛ مگر منظوم اردو میں نہ دیکھا

یہ حصہ ہے ترا کر اس کو منظوم ؛ کہ تاریکی ترے دل کی ہو معدوم

صنوبر کو معلوم نہ تھا کہ ان سے پہلے اور مقامات کو تو چھوڑیے، خود ان کے دو ہم وطن عاجز عظیم آبادی اور مبتدی عظیم آبادی گیتا کو اردو نظم کا جامہ پہنا چکے تھے۔ لہذا یہ ان کا حصہ نہ ہو سکا۔ بہر کیف! ارجن کے محسوسات ملاحظہ ہوں! ؎

جد و مرشد، چچا، ماموں، برادر ؛ کھڑے ہیں دونوں فوجوں میں برابر

نواسے اور بیٹے بھی کھڑے ہیں ؛ عزیز و اقربا چھوٹے بڑے ہیں

یہ سب ہیں میرے اپنے اور بھائی ؛ میں کر سکتا نہیں ان سے لڑائی

عزیز و اقربا جو جو ہیں موجود ؛ یہ سب ہو جائیں گے لڑ لڑ کے نابود

نہیں ہوں سلطنت کا میں طلبگار ؛ نہیں فتح و ظفر سے کچھ سروکار

یہ کیا نعمت ہے تاج و تختِ شاہی ؛ ہے ہر اسبابِ دنیا کو تباہی

نہیں پرمارتھ میں جائز ہے زنہار ؛ کسی کا قتل کرنا، اے نکوکار!

"پرمارتھ" سے مراد "دینی شریعت" ہے۔ یہ عجیب بدنصیبی ہے کہ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ مذہب

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں کسی کا قتل جائز نہیں۔ مگر وہ دوسرے مذہب والے کو قتل کرنا عین مذہب اور ثواب کا کام بھی سمجھتا ہے اور کرتا ہے۔ کرشن جی نے ارجن کو سمجھایا کہ : ؎

سمجھ تو اس کو خوب اچھی طرح سے :: کہ ہم سب لوگ کیا پہلے نہیں تھے؟
ہوئے پیدا خدا کے جتنے بندے :: اسی صورت سے پھر بھی کیا نہ ہوں گے؟
مقیّد ہوگا جو قالب کے اندر :: رہائی پائے گا اک دن مقرّر
فنا ہو جائے گی دنیا کی ہر شے :: مگر قائم ہمیشہ روح ہی ہے
حسوں سے ہو غرض محسوس جو شے :: کسی صورت بقا اُس کو نہیں ہے
بدلتی ہے ہمیشہ حالتِ جسم :: نہیں رہتی ہے یکساں صورتِ جسم
بدن ملتا ہے جو دنیا میں اس کو :: نتیجہ فعل کا اس کے، سمجھ لو
کہ جیسے جامۂ کہنہ کو انساں :: بدل دیتا ہے ہو کر دل سے شاداں
اسی صورت سے جیو آتما بھی :: بدلتا ہے لباسِ جسمِ خاکی

صاف ستھری مثنوی ہے۔ مگر "شعر" کچھ اور بھی چاہتا ہے جو یہاں نہیں ہے۔

۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء میں منشی رام سہائے تمنا لکھنوی نے گیتا کو مثنوی کی شکل میں اردو کا لباس پہنایا۔ میں نے منور لکھنوی مرحوم سے اس مثنوی کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اُن کی علالتِ مسلسل اور وفات کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر گیان چند سے صرف یہ شعر بطور نمونہ مل سکا : ؎

ستی جی نے یہ شیو جی سے کہی بات :: ہے یکتائے زمانہ کیوں آپ کی ذات؟

مگر یہ شعر مثنوی کا نہیں معلوم ہوتا۔

۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء میں منشی راج کشور اختر جائسی نے گیتا کو اردو مثنوی کی شکل دی۔ اس مثنوی کا صرف ایک شعر ڈاکٹر گیان چند سے مل سکا، حالانکہ بقول اُن کے یہ مثنوی ۱۴۴ صفحات پر چھپی ہوئی موجود ہے :- ؎

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

زیبائشِ نامہ جمدِ باری :: دریائے کرم ہے جس کا جاری

۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں یوگی راج نظر سوہانی نے گیتا کو بصورت مثنوی منظوم کیا۔ یہ مثنوی بھی بقول مسٹر جوہر مطبوعہ ہے مگر نمونہ کے لئے صرف یہی اک شعر ملا: ؎

کور دیدہ کو ردِ عالی گہر :: سنجے سے بولا کہ اے نیکو سیر!

۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے گیتا کو اردو مثنوی کا مرصع جوڑا "نسیم عرفاں" کے نام سے پہنایا۔ مادۂ تاریخ ان کے چچا منشی ماتا پرشاد نیساں لکھنوی نے پیش کیا ہے: ؎

ترجمہ یہ نظم گیتا کا ہے مقبول دلپسند

اس کتاب میں، علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے ارشادات، سر تیج بہادر سپرو کے خیالات، مسٹر آصف علی۔ بار۔ ایٹ لا کے تاثرات، ڈاکٹر بھگوان داس کے محسوسات اور ڈاکٹر سچدانند سنہا کے جذبات، تحریری طور پر شامل ہیں۔

گیتا کے اب تک جتنے منظوم ترجمے ہوئے تھے وہ آزاد ترجمے تھے یعنی کوئی خاص پابندی گوارا نہیں کی گئی تھی۔ مگر منور لکھنوی نے ہر اشلوک کا مفہوم صرف چار شعروں میں ادا کرنے کی پابندی کی ہے۔ نیز بحر چھوٹی منتخب کی ہے جو عام طور سے مثنوی کے لئے رائج نہیں۔ کسی دوسری زبان کے علمی، فنی اور مذہبی شاہکار کو اردو نظم کی چھوٹی بحر میں اور وہ بھی چار شعروں کی حد اور شرط کے ساتھ منتقل کرنے کا حوصلہ کرنا بڑا صبر آزما تھا۔ مگر منور نے کامیابی حاصل کی ہے۔ ترجمہ سلیس اور رواں بھی ہے۔ "مشعلِ عرفاں" (سانکھیہ یوگ): ؎

تھا میں نہ کبھی جہاں میں نابود :: ہر وقت تھا ہر زماں میں موجود

تم بھی نہ کبھی یہاں تھے معدوم :: پنہاں نہ تھے مثل سرِّ مکتوم

انسان ہیں یہ بادشاہ جتنے :: بیکر نہ کبھی تھے ہستی کے

میں ہوں، تم ہو کہ اور کوئی :: فطرت نہیں، نیست کسی کی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دوسرا اشلوک یوں ہے :-

قالب میں قیام کرنے والا :: اس نقش میں رنگ بھرنے والا
جیسے ہوتا ہے وقتِ تغیر :: کودک سے جواں، جواں سے پیر
بالکل اسی طرح سے بعد ترحیل :: کرتا ہے یہ قالبوں کو تبدیل
ہوتے نہیں لیکن اہلِ عرفاں :: تبدیلیٔ جسم سے پریشاں

"اہمیتِ عمل" (کرم یوگ) :-

تعمیرِ عمل کی ہے بنا علم :: اس کی کرتا ہے ابتدا علم
ہے علم اس آئینہ کا جوہر :: ہوتا جو نہیں کبھی مکدّر
ہے وصف عیاں دوام جس کا :: لافانی ہے قیام جس کا
جس کا جلوہ ہے غیر محدود :: رہتا ہے جو یگیہ میں بھی موجود

یہ ترجمہ ہے گیتا کے اِس اشلوک کا :-

"جان لے کہ عمل برہما سے پیدا ہوتا ہے اور برہما کا وجود لافانی خالق سے ہے ۔ لہٰذا ازلی اور عالمگیر ہستی ہمیشہ قربانی میں موجود ہے"
(ترجمہ اجمل خاں)

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اصل کتاب میں لفظ "برہم" ہے ۔ "برہم" کا اصل مطلب ہے "وہ ذات اقدس جو ہر جگہ موجود ہے" یعنی "قدرت" یا "ذاتِ الٰہی" مگر چونکہ "خدا" خود سامنے آکر کام نہیں کرتا اس لئے اس سے مراد "خدا کی کتاب" لیا جاتا ہے جس کے مطالعہ سے جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے ۔ اور چونکہ ہندوؤں کے یہاں خدا کی کتاب "وید" مانی جاتی ہے اس لئے عام طور سے گیتا کے مترجمین نے یہاں پر لفظ "برہم" کا ترجمہ "وید" کیا ہے ۔ منوّر ایک نہایت وسیع القلب انسان اور حد درجہ غیر متعصب ہندو تھے چنانچہ انھوں نے نہ صرف گیتا بلکہ قرآن مجید، زبور اور انجیل کے بھی کچھ حصّوں کے منظوم ترجمے کئے ہیں ۔ اُن کا تصور یہ تھا کہ دین و مذہب پر کسی ملک، کسی قوم اور کسی شخص

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اور خدائی کتابوں کو چاہیے وہ کسی مذہب کی اور کسی زبان میں ہوں کسی خاص قوم و مذہب والوں کی مخصوص کتاب سمجھنا یا بتانا بالکل غلط ہے ہر آسمانی صحیفہ، اللہ تعالےٰ کی تمام نعمتوں ہوا، پانی، دھوپ اور چاندنی کی طرح سارے بندگانِ خدا کے لیے عام ہے اور ہر انسان کو اس سے فیض و فائدہ حاصل کرنے کا یکساں حق حاصل ہے۔ اس تصور کے مطابق نہ وہ "انجیل" کو صرف عیسائیوں کی کتاب مانتے ہیں نہ "توریت" کو محض یہودیوں کی کتاب۔ "نہ قرآن حکیم" کو وہ صرف مسلمانوں کی کتاب تسلیم کرتے تھے اور نہ "گیتا" کو محض ہندوؤں کی کتاب۔ چنانچہ اسی تصور کی بناپر ان کے ترجمۂ گیتا کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ کسی خاص فرقہ و جماعت سے منسلک اور محدود ہو کر نہ رہے، بلکہ اس کی تعلیمات عام اور سارے بندگانِ خدا کے لیے ہوں۔ "وید" ہندو مذہب کی مخصوص کتاب سمجھی جاتی ہے اور "برہم" ہندو مذہب و عقیدہ کے مطابق "تخلیق کا دیوتا" ہے اور یوں دونوں لفظ ہندو مسلک کے لیے محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا منوّر نے اپنے ترجمہ میں نہ تو اصل لفظ "برہم" لینے دیا اور نہ عام مترجمین کی تقلید میں اس کا ترجمہ "وید" کیا۔ بلکہ "علم" کردیا ہے جو ہر شخص کے لیے ہے اور جو کسی ذات، ملک، فرقہ اور مذہب سے منسلک نہیں۔ ظاہر ہے کہ "علم" ہی "عمل کی بنیاد بنتا ہے اور "وید" کا مقصود بھی علم دینا ہی ہے، اس لیے نہ تو ترجمہ غلط ہوا اور نہ وہ کسی خاص مذہب والے تک محدود ہو سکا بلکہ اس کے مفہوم میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی۔

منوّر کے ترجمہ میں اس طرح کی فراخیٔ دل اور وسعتِ قلب کی مثال بہت سے مقامات پر نظر آتی ہے۔ مثلاً یہی لفظ "برہم" آٹھویں ادھیائے کے سترہویں اشلوک میں بھی موجود ہے۔ وہاں انھوں نے سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کا ترجمہ "ذاتِ مطلق" کیا ہے۔ اسے تخلیق کے کام کے بعد بیکار بیٹھ جانے والا دیوتا نہیں۔ یا مثلاً تیسرے ادھیائے کے آٹھویں اشلوک میں لفظ "شاستر" آیا ہے۔ "شاستر" کے لفظ سے ذہن عام طور سے "منوجی" کی کتاب کی طرف جاتا ہے۔ منوّر نے اس لفظ کا ترجمہ "مقدسات"

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کیا ہے جس کا اطلاق تمام مذاہب کی آئینی، الہامی اور مقدس کتابوں پر ہوتا ہے
اسی طرح اکثر مقامات پر جہاں مترجم نے صحیح اور موزوں لفظ بدلنے کا موقع نہیں
پایا ہے وہاں حاشیہ میں وضاحت کر دی ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اور کوشش کی
ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گیتا کو تمام بنی نوع انسان کے لئے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ
قرار دیا جائے۔ ان کی یہ کوشش صحیح بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ مبارک بھی ہے اور کامیاب
بھی۔ واقعی گیتا کو، اگر وہ آسمانی کتاب ہے، تو ایسی ہی فیض رساں ہونی چاہئے۔ مگر اس
کا کیا جواب کہ لوگ جس طرح قرآن حکیم کو محمدؐ کی کتاب کہتے ہیں، اسی طرح گیتا کو کرشن کی
کتاب مانا جاتا ہے۔ اور جس طرح قرآن کو "مسلمانوں کی مذہبی کتاب" بنا کر رکھ دیا گیا ہے
اور ہندو اس سے فیض حاصل کرتا تو کجا، اس کی تخفیف و تذلیل ہی کو مذہبی کام اور ثواب
کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے نزدیک گیتا، ہندوؤں کی مذہبی کتاب ہے جس کا
مسلمانوں کو پڑھنا تو کجا، چھونا بھی حرام ہے۔ خدا کرے یہ کتاب ہندوؤں اور مسلمانوں کے
موجودہ رجحانات بدلنے کا ذریعہ بنے۔

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اُن مثنویوں کی فہرست، جن کا اس کتاب میں ذکر ہوا ہے

(بلحاظ حروفِ تہجی)

(الف)

آبخورۂ عشق	از	عاجز بدایونی
اسکنڈ بھاگوت	از	ناتواں انبالوی
الشمس	از	آزاد حیدرآبادی
اصولِ دینِ احمد	از	اندرمن مرادآبادی
افسانۂ غم	از	ہرچند میرٹھی
الف لیلہ	از	شایاں لکھنوی
الف لیلہ نو منظوم	از	چمن لکھنوی
امر کہانی	از	بیتاب بریلوی
انجم نامہ	از	بخشی خیرآبادی
انوارِ سہیلی	از	راضی اکبرآبادی
ادبھت رامائن	از	فرحت لکھنوی
آئینۂ وجود	از	شاد حیدرآبادی
آئینۂ وحدت	از	″
ایزدنامہ	از	میکش رائے بریلوی
ایکادشی مہاتم	از	عامل لاہوری

(ب)

بارہ ماسہ	از	طالب سیتاپوری
باغ و بہار	از	رند لکھنوی
بحرِ طلسم	از	عامل لاہوری
بشنو سہسر نام	از	فرحت لکھنوی
بلبل چرتر	از	کرامت بہاری
بندرابن	از	شعلہ حصاروی
بوستانِ اردو	از	نفا لکھنوی
بوستانِ راحت	از	راحت کاکوروی
بہار دانش	از	چھمن لال
بہار دانش	از	خوشگو بنارسی
بہارستانِ راحت	از	راحت کاکوروی
بہارستانِ شادی	از	واقف لکھنوی
بہارِ شفق	از	شفق لکھنوی
بہارستانِ فرحت	از	خرد رامپوری
بہارِ کشمیر	از	شاکر کانپوری
بہارِ کشمیر	از	شیام دہلوی

(پ)

پدم پران	از	فرحت لکھنوی
پدم پوتھی	از	خوشتر لکھنوی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پریم سماج	از	بیدل
پریزاد	از	بیتاب بریلوی
پریم ترنگنی	از	کیفی دہلوی
پریم ساگر	از	فرحت لکھنوی
پندنامہ	از	جنون
پہیلی نامہ	از	بخشی خیرآبادی
پیاری باتیں	از	شاد حیدرآبادی
پیام ساوتری	از	جگر بریلوی
پنج قصہ	از	لئیق کانپوری

(ت)

تحفۂ سرشار	از	سرشار لکھنوی
تحفۂ مشتاق	از	مشتاق
تصویرِ جاناں	از	شفیق اورنگ آبادی
تعلیماتِ کرشن	از	معجز لکھنوی

(ج)

جاہکی بچے	از	فرحت لکھنوی
جگ بیتی	از	کیفی دہلوی
جگ روپ	از	عاجز دکنی
جلوۂ کرشن	از	شاد حیدرآبادی
جوہرِ ادراک	از	جوہر لکھنوی
جوہر افلاک	از	"

(ح)

حسنِ فطرت	از	عبرت گورکھپوری
حیات نامہ	از	بخشی خیرآبادی

(د)

داستانِ راحت (نل دمن)	از	راحت کاکوروی
داستانِ گل سخن	از	راجہ بنارسی
دافع عذاب	از	امیر بریلوی
دلارام راضی (بوستاں)	از	راضی اکبرآبادی
دریائے طلسم	از	عامل لاہوری

(ر)

راجہ رگھوبیر	از	ہردیو میرٹھی
راجہ چتر مکٹ	از	راغب امروہوی
راحت سبھا	از	راحت
رامائن	از	بہار دہلوی
رامائن	از	تمنا لکھنوی
رامائن	از	خوشتر لکھنوی
رامائن	از	فرحت لکھنوی
رامائن	از	میکش لائے بریلوی
رام کتھا	از	ہنر رسولپوری
رام لیلا	از	تمنا لکھنوی
رنگ نامہ	از	محب دریابادی
روضۃ الشہدا	از	میلوا دکنی
رہس پنج ادھیائے	از	تمنا لکھنوی

(ز)

زہرہ و بہرام (بہارستانِ راحت)	از	راحت کاکوروی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

زہرۂ زمین از بہار دہلوی

(س)

ساقی نامہ از سرشار لکھنوی
سام نامہ از منشی دہلوی
ستم نامہ از ہرچند میرٹھی
سداما (سلک گہر) از صدر لکھنوی
سرِّ وجود از شاد حیدرآبادی
سری کرشن از نسیم لکھنوی
سسّی پنّوں از جہانگیر
سسّی پنوں از سالک
سکست چالیسی از فرحت لکھنوی
سلکِ مروارید از برق اسمعیل پوری
سلکِ مروارید از تمنا لکھنوی
سنبلستانِ حیرت از تمنا لکھنوی
سنگھاسن بتیسی از آرام شاہجہانپوری
سنگھاسن بتیسی از حسن دہلوی
سنگھاسن بتیسی از چمن لکھنوی
سنگھاسن بتیسی از رنگین لکھنوی
سنگھاسن بتیسی از ناتوان انبالوی
سنگیت پدماوت از داس
سورج پران از غریب لکھنوی
سوزِ عاشقانہ از راحت کاکوروی
سوہنی مہینوال از ارود رائے

(ش)

شاد نامہ از شاد
شاہنامہ از منشی دہلوی
شعلۂ عشق از مائل بنارسی
شاہ لیئر از برق اسمعیل پوری
شکار نامہ از تمنا لکھنوی
شکار نامہ از جوہر لکھنوی
شیو پران از فرحت لکھنوی
شکنتلا از اشک دہلوی

(ص)

صبحِ وطن از طرار حیدرآبادی

(ط)

طلسمِ شایاں از شایاں لکھنوی
طلسم نامہ از بخشی خیرآبادی
طوطا مینا از انتظار خیرآبادی

(غ)

غازۂ تعشق از عنایت بریلوی
غذائے روح از عاشق دہلوی
غمزۂ دلربا از مدہوش دہلوی

(ف)

فرحت افزا از فرحت لکھنوی
فروغِ طور از فروغ سکندرآبادی
فریادِ قلب از عابد شمس آبادی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

فریب الشاد از غریب لکھنوی

فسانۂ عجائب از داغ

فسانۂ عجائب از نیساں لکھنوی

(ق)

قتلِ سراج از لئیق کانپوری

(ک)

کارزارِ مغربی از داس بٹالوی

کتھا ست نرائن از جگناتھ گیاوی

کرشمۂ عشق از بہوش لکھنوی

کشف الدقائق از ہرچند میرٹھی

کلیلہ دمنہ از بشناس بھوپالی

کمار سنبھو از منور لکھنوی

کھٹمل نامہ از شاداں ٹونکوی

(گ)

گل باصنوبر چہ کرد؟ از عاشق دہلوی

گلدستۂ عشق از تشنی دکنی

گل ریاضِ راجہ از راجہ بنارسی

گلزارِ بہار از ہرچند میرٹھی

گلزارِ چمن از چمن میرٹھی

گلزارِ فرہنگ از تمنا لکھنوی

گلزارِ فضا از فضا لکھنوی

گلزارِ لطیف از داس سہارنپوری

گلزارِ نسیم از نسیم لکھنوی

گلشنِ بہار از دولت سنگھ

گلشنِ ہفت رنگ از آشفتہ دہلوی

گنیش پران از فرحت لکھنوی

گوپی چند از مدہوش دہلوی

گوری منگل از فرحت لکھنوی

گوہرِ شب چراغ از گوہر بدایونی

گیتا مہاتم از تمنا لکھنوی

گیتا از احقر جائسی

گیتا از تمنا لکھنوی

گیتا از خوشتر لکھنوی

گیتا از صدر لکھنوی

گیتا از صنوبر عظیم آبادی

گیتا از عاجز عظیم آبادی

گیتا از عاشق میرٹھی

گیتا از مبتدی عظیم آبادی

گیتا از منور لکھنوی

گیتا از نظر سوہانوی

(ل)

لطیفۂ فرحت از فرحت لکھنوی

لطائفِ روح از مخزوں امرتسری

(م)

مثنوی بابا ہزارا از نیساں لکھنوی

مثنوی بخشی از بخشی نصیرآبادی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(ن)

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نیرنگ سحر از سحر ہنگامی

نیرنگ عشق از ناداں لکھنوی

(ہ)

ہردول نامہ از لوذعی بھسنڈوی

ہنس جواہر از ہمت لکھنوی

ہیر رانجھا از منشی دہلوی

(ی)

یوسف زلیخا از فردوسی دہلوی

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh